پاکستانی اردو ناول کے تناظر میں انسانی استحصال کا تنقیدی مطالعہ

(۲۰۰۰ء تا ۲۰۱۸ء)

مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی (اردو)

مقالہ نگار:

نگہت نورین

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جون، ۲۰۲۳ء

پاکستانی اردو ناول کے تناظر میں انسانی استحصال کا تنقیدی مطالعہ

(۲۰۰۰ء تا ۲۰۱۸ء)

مقالہ نگار:

نگہت نورین

یہ مقالہ

پی۔ایچ۔ڈی (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جون، ۲۰۲۳ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: پاکستانی اردو ناول کے تناظر میں انسانی استحصال کا تنقیدی مطالعہ (۲۰۰۰ء تا ۲۰۱۸ء)

پیش کار: نگہت نورین　　رجسٹریشن نمبر: 690 /P/U/F17

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبۂ اردو زبان و ادب

پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم: _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی: _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

میجر جنرل شاہد محمود کیانی، ہلال امتیاز ملٹری (ر): _____

ریکٹر

تاریخ: _____

اقرارنامہ

میں، نگہت نورین حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے پی۔ ایچ۔ڈی سکالر کی حیثیت سے پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

_____

نگہت نورین

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جون، ۲۰۲۳ء

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرستِ ابواب	v
Abstract	viii
اظہار تشکر	ix
باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث	
الف: تمہید	۱
i. موضوع کا تعارف	۱
ii. بیان مسئلہ	۲
iii. مقاصد تحقیق	۲
iv. تحقیقی سوالات	۲
v. نظری دائرہ کار	۳
vi. تحقیقی طریقہ کار	۴
vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۵
viii. تحدید	۵
ix. پس منظری مطالعہ	۶
x. تحقیق کی اہمیت	۷
ب۔ استحصال اور اردو ناول: بنیادی مباحث	۸

i. ادب اور استحصال ۲۵

ii. استحصال اور دنیائے ادب میں اہم انقلابات کا تذکرہ ۲۷

iii. اردو ناول اور استحصال ۳۴

حوالہ جات ۴۶

باب دوم: پاکستانی اردو ناول میں معاشرتی و سیاسی استحصال کی پیشکش

الف۔ پاکستان کا معاشرتی و سیاسی منظر نامہ ۴۷

ب۔ اردو ناول میں معاشرتی و سیاسی استحصال کی مختلف صورتیں ۵۴

i. ذات پات کا نظام اور انسانی استحصال ۵۷

ii. رشتوں کے حوالے سے انسان کا استحصال ۶۶

iii. نائن الیون اور انسانی استحصال ۹۷

iv. مدارس اور عقائد و نظریات کے تناظر میں انسانی استحصال ۱۰۴

حوالہ جات ۱۲۵

باب سوم: معاشی استحصال کی مختلف صورتیں اور پاکستانی اردو ناول

الف۔ پاکستان کا معاشی منظر نامہ: اجمالی جائزہ ۱۲۹

ب۔ جاگیر داری و سرمایہ داری نظام کے تحت انسانی استحصال کا جائزہ ۱۳۲

ج۔ اکیسویں صدی کے پاکستانی اردو ناول میں معاشی استحصال کی عکاسی (جاگیر داری و سرمایہ داری نظام ۱۴۵

حوالہ جات ۱۷۴

باب چہارم: پاکستانی اردو ناول میں نفسیاتی استحصال کی پیشکش

الف۔۔ نفسیاتی استحصال / نفسیات اور استحصال: ۱۸۲

ب۔ نفسیاتی استحصال اور پاکستانی اردو ناول ۱۸۶

i. ۱۱/۹، تہذیبی تفاوت میں شناخت کا انہدام اور نفسیاتی استحصال ۱۸۹

ii. نفسیاتی عارضے اور انسان کا نفسیاتی استحصال: ۱۹۵

iii. جذبات کے مجروح ہونے کی صورت میں انسان کا نفسیاتی استحصال ۲۰۴

iv. سائنس و ٹیکنالوجی اور انسان کا نفسیاتی استحصال ۲۱۳

حوالہ جات ۲۲۰

باب پنجم: مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات

الف۔ مجموعی جائزہ ۲۲۲

ب۔ نتائج ۲۳۰

ج۔ سفارشات ۲۳۲

کتابیات ۲۳۴

ABSTRACT

"Novel" is a literary genre that mirrors the sensibilities and idiosyncrasies of the times it is written in. This unique form of literature arrived in the Indian Sub- Continent in the nineteenth century when the region was fighting the War of Independence (1857). The Urdu writers adopted this medium to depict the unjust racialism and bigotry of the British rulers and the resultant suffering, both mental and physical, of the people of the Sub- Continent. After the creation of Pakistan, that suffering, unfortunately, could not be addressed properly and it took the form of sycophancy, hypocrisy and self- aggrandizement. Therefore, the old story of the exploitation of man remained the same.

The real task of a writer is to objectively analyze the social truths and to make them palatable to the readers by using his imagination and writing prowess. The true writers have always raised their voice against the conflicts, the turmoil's and the dehumanizing forces prevalent in their respective ages. The violation of human rights and the race to surpass others in wealth and material possessions have culminated in many existential crises making them the apt themes of the novel. A careful inspection reveals that the human exploitation has always sparked the imagination of the Urdu novelists especially the ones who wrote in early twenty- first century i.e. 2000-2018. The research was conducted regarding their individual perspectives on social and financial abuse leading to man's intellectual manipulation. The study was carried out on how the advancement in science and progress caused unfathomable exploitation and misery of man and how his enhanced mental facilities destroyed his emotions. The Pakistani Urdu novel encompasses these themes effectively. Hence, the topic of the study becomes vitally important.

The proposition is basically divided to five chapters for efficient introduction.

(In thesis, repetition of names of novels will be seen at various places to explain three basic forms of exploitation.)

The primary chapter is related to the fundamental concepts and discourses of abuse as well as the depiction of human misuse within the novel. The momentary chapter portrays the social and political misuse. An endeavor has been made to show the mental abuse of man in the setting of the developing issues of cutting-edge times. Whereas fifth chapter comprises of all the evaluations done in previous chapters.

اظہار تشکر

سب سے پہلے تو میں اللہ رب العزت کی شکر گزار ہوں کہ جس نے مجھے نمل جیسی عظیم جامعہ کے خزینہ علمی سے فیضاب ہونے کا نہ صرف موقع دیا بلکہ پی۔ایچ۔ڈی کی سطح پر مقالہ لکھنے کی توفیق بھی عطا فرمائی۔ اس یونیورسٹی کے قابل احترام اساتذہ کرام نہ صرف درس و تدریس میں بے مثال ہیں بلکہ ان کا حسن اخلاق اور طلبہ کے ساتھ مشفقانہ رویہ بھی قابل ستائش ہے۔ نگران مقالہ کی حیثیت سے پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم کی دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے موضوع کے انتخاب سے لے کر تکمیل کے آخری مرحلے تک میری معاونت فرمائی۔ میڈم کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر نعیم مظہر صاحب کی بے حد احسان مند ہوں جنھوں نے اپنی ذاتی کتب بروقت مہیا کر کے تحقیق کے مراحل کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں میرا ساتھ دیا۔ میں اپنے ان محسنوں کی مہربانیوں کو کبھی کسی صورت فراموش نہیں کر سکتی۔

اس میں شک نہیں کہ اساتذہ اور والدین کی عنایتوں کا کوئی مول نہیں ہوتا۔ ماں باپ خدا کی عطا کردہ ایسی نعمت ہوتے ہیں جن کا کوئی نعم البدل نہیں۔ میرے والدین کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ خداوند تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے اور انھیں دین و دنیا کی ہر خوشی عطا کرے۔ تحقیق کے اس کٹھن مرحلے میں اپنے دو بھائیوں کا تذکرہ کرنا نہیں بھول سکتی کہ جن کے ساتھ نے کبھی اکیلے پن کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ہر بار، ہر جگہ جہاں مشکل در پیش آئی ان کی محبت میرا مان بڑھا دیتی ہے۔ خدائے بزرگ و برتر انھیں ہمیشہ اپنے کرم کے سائے میں رکھے (آمین)۔

آخر میں ان تمام دوست احباب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنھوں نے کام کی تکمیل میں کسی بھی صورت میں میرا ساتھ دیا۔

نگہت نورین

اسکالر پی۔ایچ۔ڈی اردو

باب اول

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

i. موضوع کا تعارف:

کہانی نے جب مافوق الفطرت عناصر کے بیان سے باہر قدم نکالا تو اس میں زمینی حقائق سمانے لگے۔ جن کی بدولت قصے کہانیوں نے چوپال سے نکل کر کتاب کی صورت اختیار کر لی۔ تحریروں میں حقائق کا بیان انسان کے لیے وقت کی ضرورت تھا۔ ادب کو انسانی تجربات، احساسات، جذبات اور معاشرتی حالات بیان کرنے کا بہترین ذریعہ تصور کیا جاتا ہے ۔کسی بھی معاشرے کے اتار چڑھاؤ کا عکس اس کے ادب میں بخوبی دیکھا اور دکھایا جاسکتا ہے۔اس لیے جب بھی معاشرتی رویوں کی بات کی جاتی ہے تو رجوع ادب ہی کی جانب کیا جاتا ہے۔ادب میں متعدد اصناف نثر میں سے ناول ایک اہم صنف ہے۔اسی بنا پر جب ہم اردو ناول میں پیش کیے جانے والے موضوعات کی بات کرتے ہیں تو ان ادبی تحریروں کے ساتھ معاشرے کا عمومی اور خصوصی رویہ بھی قابل توجہ ہوتا ہے۔ مختلف حالات میں معاشرے میں ہونے والی سیاسی، معاشی، تہذیبی و ثقافتی تبدیلیوں سے انسانی زندگی پر جو اثرات مرتب ہوتے رہے ہیں ان کی عکاسی اردو ناول میں ہر دور میں کی جاتی رہی ہے۔

استحصال انگریزی زبان کے لفظ exploitation کا مترادف ہے۔ جس کی بدولت ایک طبقہ یا گروہ دوسرے طبقہ یا گروہ کے حقوق پامال کرتے ہوئے ان سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔اردو ناول کی ابتدا انیسویں صدی کے آخر میں ہوئی ابتدا سے آج تک استحصال اردو ناول میں کسی نہ کسی صورت دکھائی دیتا ہے۔ کم و بیش ہر ادیب نے اپنی کہانیوں میں انسانی استحصال کے حوالے سے طبقاتی تفریق اور بنیادی انسانی حقوق کی پامالی جیسے موضوعات کو بیان کیا ہے۔پاکستان میں ابتدا سے اکیسویں صدی تک لکھے جانے والے اردو ناولوں میں استحصال قریباً ہر ناول میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔

اکیسویں صدی کے معاصر ادب میں جہاں معاشرتی و سیاسی اور معاشی استحصال کثرت سے ملتا ہے وہیں نفسیاتی استحصال بھی دکھائی دیتا ہے۔ نفسیاتی استحصال لوگوں کی سوچ، ان کے جذبات و احساسات کے اظہار میں رکاوٹ کا موجب بنتا ہے۔ استحصال کی اصطلاح جدید دور میں کافی وسعت اختیار کر چکی ہے۔ مجوزہ مقالے میں انسان کے معاشرتی و سیاسی، معاشی

اورنفسیاتی حوالے سے ہونے والے استحصال کو مد نظر رکھ کر ۲۰۰۰تا۲۰۱۸ تک کے منتخب پاکستانی ناولوں کے تناظر میں تحقیق کی گئی ہے۔

ii. بیان مسئلہ:

ادب نے روزاول سے ہی انسانی زندگی کو درپیش مسائل کی عکاسی کی ہے۔ پاکستان میں ابتدا سے اکیسویں صدی تک لکھے جانے والے ناولوں میں استحصال قریباًہر ناول میں پیش کیا گیا۔ انیسویں صدی تک کے ناول میں یہ محدود پیمانے پر نظر آتا ہے۔ لیکن دنیا کے ساتھ روابط کا سلسلہ بڑھا۔ توجہاں زندگی کے متعدد شعبوں میں ترقی کے امکانات بڑھے۔ وہیں استحصال کی صورتوں اوراسباب میں بھی اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ اکیسویں صدی کے معاصر ادب میں جہاں معاشرتی و معاشی استحصال کی کثیر تعداد ملتی ہے۔ وہیں نفسیاتی استحصال بھی دکھائی دیتا ہے۔ استحصال کی اصطلاح جدید دور میں کافی وسعت اختیار کر چکی ہے اوراکیسویں صدی کے پاکستانی ناول نگاروں نے اپنی تحریروں میں جگہ دے کر اسے ایک وسیع میدان عطا کیا ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ یہ موضوع ہر دوسرے ناول میں نظر آتا ہے جس بنا پر تحقیق کے لیے یہ ایک اہم موضوع قرار پاتا ہے۔

iii. مقاصد تحقیق:

دوران تحقیق درج ذیل مقاصد مد نظر رہے:۔

ا۔ منتخب پاکستانی اردو ناولوں میں معاشرتی وسیاسی استحصال کی مختلف صورتوں کا جائزہ لینا۔

ب۔ منتخب پاکستانی اردو ناولوں میں پیش کیے جانے والے معاشی استحصال کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرنا۔

ج۔ نفسیاتی استحصال کے تناظر میں تحریر ہونے والے پاکستانی اردو ناول کا تنقیدی مطالعہ کرنا۔

iv. تحقیقی سوالات:

مجوزہ تحقیقی مقالے میں قبل از تحقیق چند سوالات ترتیب دیئے گئے۔ جن کے جوابات تحقیق کی صورت میں تلاش کرنے کی سعئ کی گئی۔

ا۔ منتخب پاکستانی اردو ناول میں معاشرتی استحصال کی مختلف صورتیں کون کون سی ہیں؟

۲۔ منتخب پاکستانی اردو ناول میں معاشی استحصال کے کن پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے؟

۳۔ منتخب پاکستانی اردو ناول میں نفسیاتی استحصال کے کن زاویوں کی عکاسی کی گئی ہے؟

v. نظری دائرہ کار:

انسانی استحصال کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود انسانی زندگی۔ جب انسان نے زرعی معاشرت کی بنیاد رکھی اور معاشرتی ڈھانچے بننے لگے، تو طاقت اور وسائل کی تقسیم میں عدم مساوات پیدا ہونا شروع ہوئی۔ حق ملکیت کے تصور کے ساتھ ہی روئے زمین پر انسانی استحصال ہونا شروع ہوا۔ گویا جب انسان نے فطری جبلتوں کی بجائے نفسانی خواہشات کو مقدم جاننا شروع کیا تو استحصال کی ابتدا ہوئی۔ کارل مارکس نے انیسویں صدی عیسوی میں لفظ استحصال کو 'معاشیات' کی اصطلاح کے طور پر متعارف کرایا۔ کارل مارکس کے مطابق سرمایہ دارانہ نظام کا مکمل ڈھانچہ استحصالی بنیادوں پر استوار ہے۔ کارل مارکس سے قبل اٹھارہویں صدی عیسوی میں روسو کے مطابق نجی ملکیت، انسانی عدم مساوات اور استحصال کی جڑ ہے۔ چودھویں صدی عیسوی میں ابن خلدون نے اپنی کتاب "مقدمہ ابن خلدون" میں انسانی استحصال کا بنیادی محرک ریاست کی اپنے فرائض میں نااہلی کو قرار دیا۔ بیسویں صدی میں پاکستانی مفکر سید علی عباس جلالپوری نے اپنی کتاب "تاریخ کا نیا موڑ" میں استحصال کے حوالے سے چند نکات پیش کیے۔ جن میں استحصال کی تمام انواع کو بیان کیا۔ جنھیں بنیاد بنا کر تحقیق کے تمام مراحل عبور کرنے کی کوشش کی ہے۔

- ابتدائی معاشرتی زندگی میں انسانی بستیوں کو تحفظ کی خاطر ہتھیار مند دستوں کا وجود عمل میں لایا گیا۔ دفاع میں یکسوئی کو برقرار رکھنے کی غرض سے عام کاشتکار اپنی پیداوار میں سے کچھ حصہ ان دلاور افراد کے لیے وقف کر دیتے جو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ مالیہ اور خراج کی صورت اختیار کرتا گیا ۔
- پروہتوں نے دین فروشی کو باقاعدہ کاروبار بنالیا اور دیوتاؤں کے نام پر سادہ دل لوگوں سے نذرانے وصول کرنے لگے۔
- مذہب کی آڑ میں دھرتی دیویوں کے مندروں میں "مقدس "عصمت فروشی کا دھندا رائج کیا گیا۔ کاروباری لوگوں اور بردہ فروشوں نے ان کی دیکھا دیکھی قحبہ خانے کھول کر عورت کو جنس بازاری بنا دیا۔
- شخصی املاک کے تصور سے طبقاتی آویزش نے جنم لیا۔ تو معاشرے میں جبر و استحصال کی روایت کو تقویت ملی۔

- جاگیر داری نظام کے مروجہ اصولوں میں ہاریوں اور مزارعوں کی حالت غلاموں سے بھی بدتر دکھائی دیتی ہے۔ غلاموں کا نان نفقہ آقاؤں کے ذمے ہوتا تھا۔ اس کے برعکس مزارعوں کا گزر بسر قرض لے کر ہوتا۔
- مقتدر طبقہ نے اپنے استبداد اور استحصال کو بحال رکھنے کے لیے ایسے قوانین بنائے جن سے شخصی املاک کا تحفظ مقصود تھا۔
- استحصال کا جدید انداز صنعتی انقلاب تھا۔ اس کے ساتھ ہی طبقاتی آویزش میں مزید شدت آئی۔ سرمایہ دارانہ معاشرے میں انتشار و خلفشار بڑھ گیا۔
- معاشرتی روایات اور مذہبی عقائد فرد کی نفسیات پر بوجھ ڈال کر اسے ذہنی طور پر مفلوج کرتے ہیں۔ جب معاشرتی دباؤ کی بدولت انسان اپنی زندگی کے فیصلے آزادانہ طور پر نہیں کر سکتا، تو وہ نفسیاتی استحصال کا شکار ہو جاتا ہے۔

vi. تحقیقی طریقہ کار:

مجوزہ تحقیقی کام کا تعلق ادبی تحقیق سے ہے جس کے لیے دستاویزی طریق تحقیق اختیار کیا گیا ہے جبکہ تحقیقی مقالے کی نوعیت معیاری تحقیق (Qualitative Nature of Research) ہے، تحقیق کے دوران میں موضوع سے متعلق معلومات، تصورات اور شواہد جمع کر کے ان کی روشنی میں اردو کے منتخب ناولوں کا تجزیہ کیا گیا ہے اور آخر میں نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ مقالے کے موضوع کے تناظر میں سب سے پہلے بنیادی ماخذ تک رسائی کی گئی بعد ازاں مقالے کی تکمیل کے لیے منتخب اردو ناولوں کا نظری دائرہ کار میں اخذ کردہ نکات کی روشنی میں تنقیدی جائزہ لیا گیا۔ اس عمل کو مکمل کرنے کے لیے ثانوی مآخذ سے بھی دوران تحقیق استفادہ کیا گیا۔ ثانوی مآخذ میں اردو تنقیدی کتب اور رسائل و جرائد کے علاوہ لغات، ریسرچ پیپرز اور تحقیقی و تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس سلسلے میں دیگر تحقیقی مقالوں اور مختلف برقی سائٹس کا بھی استعمال کیا گیا۔ نیز ادبی تحقیق کے جملہ اصولوں کے اطلاق کے بعد حاصل شدہ مواد کے اثبات و نفی کے ذیل میں نتائج مرتب کیے گئے ہیں۔

vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:

"پاکستانی اردو ناول کے تناظر میں انسانی استحصال کا تنقیدی مطالعہ (۲۰۰۰ء تا ۲۰۱۸ء)" خاص اس موضوع پر اس سے قبل کسی قسم کا تحقیقی و تنقیدی کام اب تک سامنے نہیں آیا۔

viii. تحدید:

مقالے کو طوالت سے محفوظ رکھنے کے لیے حد بندی کی گئی ہے۔ ناول میں انسانی استحصال کے بیان کی کہانی بہت طویل ہے۔ اس کے باوجود زیر تحقیق مقالے میں انسانی استحصال کی معاشرتی، معاشی اور نفسیاتی صورتوں کے تحت اکیسویں صدی کے ابتدائی دو عشروں میں لکھے جانے والے چند مخصوص پاکستانی اردو ناولوں کو تحقیق کا حصہ بنایا گیا ہے۔ ان میں صفر سے ایک تک (مرزا اطہر بیگ)، سرخ تیل (اعجاز احمد فکرال)، حاصل گھاٹ (بانو قدسیہ)، العاصفہ، دھنی بخش کے بیٹے، انسان اے انسان (حسن منظر)، مٹی آدم کھاتی ہے (محمد حمید شاہد)، بالوں کا گچھا (خالد طور)، کاغذی گھاٹ (خالدہ حسین)، ساسا (محمد شیر از دستی)، بھاگ بھری (صفدر زیدی)، نیلی بار (طاہرہ اقبال)، دائرہ (محمد عاصم بٹ)، گرد باد (محمد عاطف علیم)، نو لکھی کوٹھی (علی اکبر ناطق)، کہر (محمد الیاس)، دیس ہوئے پردیس، قربت مرگ میں محبت، قلعہ جنگی، خس و خاشاک زمانے (مستنصر حسین تارڑ)، طاؤس فقط رنگ (نیلم احمد بشیر)، کنجری کا پل (یونس جاوید) وغیرہ شامل ہیں۔

تحقیق کے لیے منتخب ناولوں کے چناؤ کی وجوہات:

اس دور میں اردو ادب میں نئے رجحانات اور موضوعات سامنے آئے۔ کئی ناول نگاروں نے معاشرتی ناانصافی، غربت، طبقاتی فرق اور عورتوں کے مسائل کو اپنی تحریروں میں جگہ دی۔ یہ دورانیہ معاشرتی، سیاسی، مذہبی، نفسیاتی اور ادبی غرض ہر لحاظ سے کافی اہم رہا، اسی لیے انسانی استحصال کے موضوع پر منتخب اردو ناولوں کے مطالعے کے لیے اس مدت کا انتخاب موزوں اور جامع سمجھا گیا ہے۔

۱۔ ۲۰۰۰ کے بعد پاکستان میں سیاسی اور سماجی سطح پر نمایاں تبدیلیاں دیکھنے میں آتی ہیں، جنھوں نے معاشرے کے ساتھ ساتھ افراد پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ آمریت کے بعد جمہوریت کی بحالی، دہشت گردی، اور معاشی بحران جیسے عوامل نے معاشرتی و سیاسی استحصال کو مزید بڑھا دیا، جس کا عکس منتخب اردو ناولوں میں نظر آتا ہے۔

۲۔ عالمی سطح پر گلوبلائزیشن اور میڈیا کے کردار نے انسان کو درپیش مسائل و مشکلات کے حوالے سے اہم کردار ادا کیا۔ جس سے ناول نگاروں کو نئے معاشرتی، معاشی اور نفسیاتی مسائل اُجاگر کرنے کا موقع ملا۔

۳۔ عالمی تنازعات کا اثر اکیسویں صدی کے ابتدائی دو عشروں میں بہت واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ افغانستان اور مشرق وسطیٰ میں ہونے والے عالمی تنازعات کے اثرات نے پاکستانی معاشرے میں استحصال کو جنم دیا۔ براہ راست مذہب کو بنیاد بنا کر لوگوں کا استحصال کیا گیا جن کا عکس منتخب پاکستانی اردو ناولوں میں ملتا ہے۔

۴۔ نائن الیون کے بعد مذہب کو بنیاد بنا کر بین الاقوامی سطح پر اقلیتوں کا بھرپور استحصال کیا گیا۔ اکیسویں صدی کے پاکستانی ادیبوں نے اس موضوع پر خصوصی توجہ دی۔

ix. پس منظری مطالعہ:

'استحصال' کے لفظ کو باقاعدہ معاشیات کی اصطلاح کے طور پر سب سے پہلے کارل مارکس نے متعارف کروایا۔ جس کے تحت دولت کی غیر مساویانہ تقسیم معاشرے میں طبقات کو جنم دیتی ہے۔ اور طبقات میں پھیلی تفرقہ بازی سے انسانی حقوق پامال ہوتے ہیں۔ انسان کو محنت کے عوض معاوضہ نہیں ملتا۔ غریب کی حالت خط غربت سے بھی نیچے چلی جاتی ہے۔ جبکہ دوسری جانب تجوریاں بھری رہتی ہیں۔ جن کو مزید بھرنے کے لیے انسانی عظمت کے علم کو گرانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی جاتی۔ ہر طبقہ جو زیر دست لایا جاسکے لایا جاتا ہے۔ اب نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشیات کے دائرے سے نکل کر استحصال معاشرتی اور نفسیاتی سطح پر بھی اپنی پہچان کرانے لگتا ہے۔ زیر تحقیق مقالے میں پس منظری مطالعہ کے تحت معاشرتی، معاشی، اور نفسیاتی استحصال سے متعلق تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اگلے قدم میں اردو ناول کی روایت میں استحصال کے بیان کو تینوں حوالوں سے پرکھنے کی سعئ گئی ہے۔ اس دوران وہ تحقیقی مقالے اور مضامین خاص طور پر تحقیق کا حصہ بنے ہیں جو مجوزہ موضوع سے متعلق تھے۔ اگرچہ باقاعدہ ایسا کوئی مقالہ اب تک ضبط تحریر نہیں لایا گیا۔ جس میں اردو ناول کے استحصال کی روایت کو بیان کیا گیا ہو، البتہ چند محققین نے تحقیقات میں معاشرے کے مظلوم طبقہ کو اپنی تحریوں کا حصہ بنایا ہے ان کو دیکھا گیا۔ مگر چونکہ استحصال کو صرف مظلوم اور غربا تک محدود نہیں کیا جاسکتا اس میں امرا و غربا سبھی طبقات حصہ بنتے ہیں۔ اس

لیے بنیادی مأخذ پر انحصار قدرے زیادہ رہا۔اس کے ساتھ ساتھ انٹرنیٹ پر موجود آرٹیکل بھی پس منظری مطالعہ کا حصہ بنے۔

x. تحقیق کی اہمیت:

مجوزہ مقالے کا مو ضوع "پاکستانی اردو ناول کے تناظر میں انسانی استحصال کا تنقیدی مطالعہ (۲۰۰۰ء تا ۲۰۱۸ء)" ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اردو خاص کر پاکستانی اردو ناول میں ہر سطح پر استحصال کی کئی صورتوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔انسان نے جہاں ترقی کے مدراج طے کرتے ہوئے چاند پر قدم رکھا وہیں اس نے قدم قدم پر ایک دوسرے کا استحصال بھی کیا۔نہ صرف دوسرے کا بلکہ اپنی ذات کو بھی نہ بچا سکا۔جدیدیت کی آڑ میں اتنا آگے نکل گیا۔کہ اپنے انسان ہونے کی وجہ کو فراموش کر بیٹھا۔ایسے میں ادیب وہ واحد ہستی ہے جو معاصر ادب کے ذریعے سماج کو درپیش مسائل کو تحریر کے ذریعے زندہ رکھے ہوئے ہے ۔کرہ ارض پر انسانی استحصال کی کہانی بہت قدیم ہے۔کب اور کہاں کا تو معلوم نہیں لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جب اس سرزمین خداوندی پر پہلے انسان نے ملکیت کا حق جتایا وہیں سے استحصال شروع ہو گیا۔ملکیت کے اس حق نے سماج میں عجب طرح کی بے چینی کی فضا پیدا کر دی۔اپنی ملکیت کو لا محدود کرنے کی غرض نے اس کو انسانیت کی پامالی کے کئی طریقے سیکھا دیئے۔اس نے دوسروں کے حقوق غصب کرنے اور اذیت دینے میں کوئی آر محسوس نہ کی۔انسانی حقوق کی پامالی کی اس تمام داستان کو من و عن سماج کے سامنے ادیب نے ناول کی صورت میں پیش کیا۔اردو ناول کے تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو استحصال پہلے پہل محدود سطح پر ہوتا تھا۔لیکن جونہی سرمایہ داری نظام متعارف کرایا گیا تو انسانی ترقی کے ساتھ ساتھ استحصال کی بھی متعدد صورتیں پیدا ہوئیں۔پاکستانی اردو ناول میں جابجا ایسی صورتحال دکھائی دیتی ہے جس کے لیے تحقیق کی ضرورت و اہمیت بڑھ جاتی ہے۔لفظ 'استحصال' کا استعمال جب اور جہاں بھی کیا جائے انسانی ذہن مخصوص مفہوم تک جا کر رک جاتا ہے۔جب اس کو محض جسمانی زیادتی تک محدود رکھا جاتا تھا مگر آج جب کہ ادب اکیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے خاتمے کے قریب ہے تو اس میں جہاں سائنسی ترقی زوروں پر ہے وہیں انسانی استحصال کی بھی کئی صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔جس بنا پر شب و روز استحصال کی بڑھتی اس صورتحال کے اسباب کا جائزہ لینا ضروری ہو جاتا ہے جس کو ادیب گزرتے وقت کے ساتھ مختلف سطحوں پر بیان کرتا آرہا ہے۔

ب۔ استحصال اور اردو ناول: بنیادی مباحث

اس بات سے ہر ذی شعور آگاہ ہے کہ از منہ قدیم میں انسان بستیاں بنا کر رہنے کا عادی نہیں تھا۔ وہ خوراک اور پناہ کا متلاشی جگہ جگہ گھومتا رہتا اور جس جگہ موسم اور بھوک کی شدت سے پناہ ملنے کا امکان ہوتا وہیں ڈیرے جما کر رہنا شروع کر دیتا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس نے فطرت کو اپنے لیے کار آمد بنانے کے متعدد طریقے ڈھونڈ نکالے۔ یہ وہ دور تھا جس میں انسانی آبادی کسی مستقل ٹھہراؤ کی جانب مائل ہوئی۔ اور اس طرح ابتدائی انسانی مخلوق میں دو طرح کے میلانات دکھائی دیے۔

اول: ایسے انسان جو مستقل سفر اختیار کرتے تھے۔

دوم: ایسے جو کسی مقام پر ٹھہرنے ہی کو پسند کرتے تھے۔

لیوس ممفرڈ کے بقول:

"Human life swing between two poles, movement and settlement"۔[1]

انسانوں کا اولین گروہ خوراک کے حصول اور موسم کی شدت سے خود کو بچانے کی خاطر شدید قسم کی تھکان سے نبرد آزما ہونے کی خصوصیات کا حامل تھا۔ یہ انسانوں کی ایسی نوع تھی جس میں خطرات سے کھلواڑ، فوری فیصلہ کی قوت جیسی خصوصیات تھیں۔ ان قائدانہ صلاحیتوں کی ضرورت مستقل انسانی آبادی کے لیے بھی ضروری تھیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے جب انسانی بستیاں آباد کرنا شروع کیں تو ابتدا میں چھوٹے چھوٹے قبائل وجود میں آئے۔ گویا گروہی زندگی کو انسان نے دو خصوصیات کی بنا پر ترجیح دی۔ اولاً اس کی عملاً احتیاجات کی تکمیل اور ثانیاً دفاعی عمل۔ انسان کو خدائے بزرگ و برتر نے عقل و دیعت کی جس کی بنا پر وہ تمام حیوانات سے افضل قرار پایا اور فضیلت کا بلند درجہ پا لینے کے بعد جو مسئلہ اس کو در پیش رہا۔ وہ یہ کہ اپنا دفاع انفرادی سطح پر کرنے سے قاصر تھا۔ اس لیے اجتماعی زندگی کی جانب قدم بڑھانے کی سعیٔ کی۔ مگر اس گروہی و اجتماعی زندگی کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی اس کے اندر حیوانی فطرت نے انگڑائی لی جس میں ابن خلدون کے بقول خصومت اور تشدد غالب دکھائی دیتا ہے۔ اس حیوانی فطرت نے اسے دوسروں سے جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔ جس سے متعدد قبائل ایک دوسرے کے مد مقابل آئے۔ کئی غالب تو کئی مغلوب ٹھہرے۔ غالب آنے والے طبقات نے ہر جائز و ناجائز ہتھکنڈے اختیار کر کے اپنے سے کمتروں کا استحصال کرنا شروع کر دیا۔

"استحصال" عربی زبان کا لفظ ہے جو مطلب، حصول، حاصل اور چھین وغیرہ جیسے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے لفظ 'Exploitation' استعمال کیا جاتا ہے۔ استحصال (exploitation) کو باقاعدہ معاشیات کی اصطلاح کے طور پر سب سے پہلے کارل مارکس نے متعارف کرایا۔ جس کے مطابق استحصال کے معنی 'حصہ داری کے کام میں کسی دوسرے کا حصہ ہتھیانا، حاصل کرنا، حاصل کرنے کی خواہش کرنا، فائدہ حاصل کرنا، ناجائز فائدہ اٹھانا' وغیرہ۔ اردو زبان میں استحصال کے لیے متعدد مترادفات مستعمل ہیں۔ مثلاً چھین جھپٹ، حصول، خود مطلبی اور ناجائز استفادہ وغیرہ۔ یہاں ایک بات قابل توجہ ہے کہ مارکسی منشور انیسویں صدی میں منظر عام پر آیا۔ جبکہ تاریخی تناظر میں انسانی استحصال کی ابتدا بہت قدیم ہے۔

کرہ ارضی پر انسان صدیوں سے آباد ہے۔ استحصال کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟ اس بات سے واقفیت مشکل ہی نہیں کسی حد تک ناممکن بھی ہے۔ البتہ یہ بات قرین قیاس ہے کہ استحصال کی ابتدائی تاریخ انسانی ظہور کے ساتھ ہی شروع ہو گئی ہو گی۔ محققین نے انسانی تاریخ کا مطالعہ کر کے اس بات کا تو ادراک حاصل کر لیا کہ زمین پر انسان نے اپنے جیسے انسان کا استحصال کن وجوہات کی بنا پر کرنا شروع کیا۔ البتہ چند سوالات آج بھی جواب طلب ہیں، کہ زمین پر انسان نے پہلے پہل کس کا اور کب استحصال کیا؟ انسانی زندگی کے مختلف ادوار اور ارتقا کے مختلف مراحل ہیں اس لیے ریاضی کے کلیے دو جمع دو کے مطابق جواب دینا اگرچہ مشکل ہے مگر قرین قیاس ہے کہ زمین پر جب انسان نے ذاتی ملکیت کا پہلا دعویٰ کیا تو استحصال کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ذاتی ملکیت کا لفظ استعمال کرنے سے یہاں ابہام کی صورت پیدا ہوتی ہے کہ ذاتی ملکیت اگر ہے تو کس قسم کی، انسان کی اپنی ذات اور اس کے استعمال کی اشیا بھی ذاتی ملکیت میں شمار ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہاں ذاتی ملکیت کی وضاحت ضروری ہے۔ ایسی ملکیت جس سے استحصال کی صورت پیدا ہوتی ہے وہ کس قسم کی ہو گی؟ وہ ذاتی ملکیت استحصال کی وجہ بنتی ہے جس کی بدولت دوسروں کی محنت کا استحصال کر کے اپنی دولت و ثروت بڑھائی جائے اس قسم میں زمین، فیکٹری اور سرمایہ جیسی اشیا شامل ہیں۔ اس کے برعکس اشیائے صرف پر مشتمل ہونے والی ذاتی ملکیت کسی کے نقصان کا باعث نہیں بنتی۔

درج بالا ذاتی املاک میں سے اولاً ایک انسان کو دوسرے انسان کے مدمقابل لانے کی وجہ بنی۔ روسو کے بقول "ابتدائی دور کا انسان نیک اور بھولا بھالا و معصوم تھا۔" وہ ہوس لالچ نفرت و عداوت جیسی تمام معاشرتی برائیوں سے پاک دامن صاف ستھری زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کی ذات دوسروں کے لیے اگر باعث

نفع نہ تھی تو موجب نقصان بھی نہ تھی۔ گویا انسان اپنے ابتدائی ادوار میں ایک دوسرے کے لیے بے ضرر تھا۔ لیکن اس وقت تک جب ذاتی ملکیت کا رواج عام نہیں ہوا تھا۔ جونہی املاک پر ذات حاوی ہوئی مساوات اور فراغت کا دور ختم ہو گیا۔ اس کی جگہ خود غرضی، نفرت، قتل و غارت گری نے لے لی۔ انسان اپنے فائدے کے لیے دوسروں کا استحصال کرنے لگا۔

سبط حسن لکھتے ہیں:

> "روسو کے بقول سول سوسائٹی کا حقیقی بانی وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے زمین کے ایک ٹکڑے کو چاروں طرف سے گھیرا اور یہ دعویٰ کیا کہ یہ زمین میری ہے۔ اگر کسی شخص نے اس گھیرے کو توڑ دیا ہوتا اور لوگوں کو خبردار کیا ہوتا۔۔۔ کیونکہ زمین کسی ایک فرد کی ملکیت نہیں ہے۔ بلکہ زمین کا پھل سب کا ہے تو نسل انسانی کتنی جنگوں، کتنے جرائم، کتنے قتل، کتنی بپتاؤں، کتنی بربادیوں سے بچ گئی ہوتی"۔ (۲)

انسان اس وقت تک آزادی اور خوشحالی کی زندگی بسر کر رہا تھا جب تک وہ اپنے کام خود کرتا تھا۔ اس نے جھونپڑے بنانے کا ہنر سیکھا، وہ کھیتی باڑی میں ایک قدم آگے بڑھا۔ نجی سطح پر دستکاریاں عام ہوئیں۔ زندگی ایک ڈگر پر چل نکلی۔ کہ اچانک تسلسل رفتار میں ایک ایسا موڑ آیا جس نے آنے والے وقت کے خوف سے بچنے کی ترکیب گوش گزار کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت انسان ایک دن میں دو تین دن کا رزق جمع کرنے میں لگ گیا۔ تو مساوات کی جگہ عدم مساوات نے لے لی۔ ذاتی ملکیت نے اپنا گھیرا بڑھانا شروع کر دیا اور انسانیت کا گھیرا تنگ ہو گیا۔ جنگلوں کو لہلہاتے کھیتوں میں بدل کر انھیں سیراب کرنے کے لیے انسانی پسینہ استعمال کیا جانے لگا۔ جس کے نتیجے میں آقا و غلام کا تصور ابھر کر سامنے آیا۔ زمین کے چھوٹے سے حصے سے شروع ہونے والی برائی اب بھیانک صورت اختیار کرنے لگی۔ فصلوں کی بیجائی کے ساتھ ساتھ غلامی اور افلاس کے بیج بھی بوئے گئے جو فصلوں کے ساتھ پروان چڑھنے لگے۔ جوں جوں زمین کی زرخیزی بڑھی استحصال کی مقدار میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ انسان کی آزادی سلب ہو گئی۔

توکل و قناعت کے بجائے مفاد پرستی نے غلبہ پالیا۔ مختصر الفاظ میں اگر استحصال کی تاریخ کا جائزہ پیش کیا جائے تو وہ یہ ہو گا کہ کرہ ارضی پر زمین کے مالکانہ حقوق سے حد بندی کا رواج جب قائم ہوا تو اس کے ساتھ ہی انسانی استحصال کی ابتدا ہو گئی تھی۔ گویا استحصال کی تاریخ اس قدر قدیم ہے جس قدر قدیم تصور ملکیت۔

اردو انسائکلوپیڈیا کے مطابق

"استحصال (Exploitation) کسی طاقتور فرد، طبقہ یا گروہ (مثلاً سرمایہ دار، زمیندار) کا اپنے فائدے کے لیے اپنے سے کم طاقتور فرد، طبقے، گروہ (مثلاً مزدور، کسان) کی قوت، محنت یا اس کے ذرائع دولت آفرینی کو حسب منشا استعمال میں لانا۔ استحصال کی بنیاد پر مارکس نے ایک نظریہ قائم کیا تھا جو اشتراکیت کا جزو لاینفک ہے۔ اس نظریے کا اصل اصول یہ ہے کہ کسی طبقے کو کسی دوسرے طبقے سے ناجائز معاشی فائدہ اٹھانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس مقصد کی خاطر مظلوم طبقے کا بغاوت کرنا اور انقلاب لانا بالکل جائز ہے۔"(۳)

According to Stand ford Encyclopedia philosophy:

"Exploitation: To exploit someone is to take unfair advantages of them. It is to use another person's vulnerability for one's own benefit. Of course, benefitting from another's vulnerability is not always morally wrong". (۴)

Exploitation–Definition in the study of Sociology:

"Exploitation occurs when one social group is able to take for itself what is produced by another group. The concept is central to idea of social oppression, especially from a Marxist perspective, and can also include noneconomic forms, such as the sexual exploitation of women by men under patriarchy". (۵)

استحصال کا لفظ چونکہ سب سے پہلے کارل مارکس نے متعارف کرایا اور کارل مارکس معاشیات کے تناظر میں اس کی بات کرتا ہے۔ اس کے مطابق معاشرے میں دو علوم اہم ہیں ایک اقتصادیات اور دوسرا سیاست۔ جو ریاستیں ان دونوں میں مساویانہ طرز اپناتی ہیں وہ کبھی زوال و انحطاط کا شکار نہیں ہوتیں۔ اس لیے استحصال سے آج تک جتنے بھی معنی و مفاہیم سامنے آئے ہیں۔ کم و بیش سبھی میں دولت کی غیر مساویانہ تقسیم سے معاشرے میں پیدا ہونے والے مسائل کا تذکرہ ملتا ہے۔ انسان جب تک ذاتی املاک سے واقف نہ تھا وہ ایک دوسرے کے آرام کا خیال رکھتا تھا۔ مگر ذاتی ملکیت کے تصور سے اس نے اپنے ہی جیسے دوسرے انسان

میں فرق محسوس کرنا شروع کیا۔ وہ طبقات میں بٹ گیا۔ اس کی اس تقسیم سے فطری معاشرے میں آرام و سکون مفقود ہو گیا۔ اس کی جگہ خود غرضی، ہوس اور لالچ جیسی برائیوں نے لے لی۔ استحصال کو قدیم و جدید دونوں ادوار میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس کا مفہوم کچھ اس طرح سے سامنے آتا ہے۔

۔ کسی طاقت ور انسان کا کم اجرت پر کمزور سے کام کروانا۔

۔ طاقت کے بل بوتے پر غریب انسان کی فطری آزادی سلب کرنا اور اسے اپنا غلام بنالینا۔

۔ دولت پانے کی ہوس میں معاشرے کے کمزور افراد، بوڑھے، بچے اور عورتوں کی تذلیل کرنا۔ ان پر ظلم و زیادتی کے متعدد طریقے اختیار کرنا تاکہ زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹی جاسکے۔

۔ سماجی سطح پر اگر کوئی مرد کسی عورت کو جنسی زیادتی کا نشانہ بنائے گا تو وہ بھی استحصال کے زمرے میں آتا ہے۔

لغات اور انسائیکلو پیڈیا سے ہٹ کر اگر سماج کے موجودہ حالات کا جائزہ لے کر استحصال کے مفاہیم متعین کیے جائیں تو وہ کچھ اس طرح سے سامنے آتے ہیں کہ استحصال کی ابتدا آقا و غلام کے تصور سے ہوئی۔ یعنی طاقت ور کمزور کا استحصال کرتا تھا۔ جبکہ آج جدید دور میں استحصال کے لیے کم اور زیادہ کا معیار نہیں دیکھا جاتا۔ ایک جیسے طبقات اپنے جیسے دوسروں کا طاقت کے بل بوتے پر استحصال کرتے ہیں۔ سرمایہ دار اپنی دولت بڑھانے کے لیے اپنے جیسے سرمایہ دار کو نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرتا۔

استحصال کے حوالے سے مختلف مفکرین کے نظریات و نکات:

ابن خلدون اور انسانی استحصال:

ابن خلدون (۱۳۳۲ء۔۱۴۰۶ء) ایک مشہور مسلم مؤرخ، فلسفی اور ماہر معاشیات تھے۔ ان کی سب سے معروف کتاب "مقدمہ ابن خلدون" ہے، جس میں انھوں نے انسانی تاریخ، سماجی ڈھانچوں، اور تہذیبوں کے عروج و زوال سے متعلق تفصیل سے بیان کیا۔ اس کتاب میں انھوں نے معاشرتی زندگی کے جن پہلوؤں کے بارے بیان کیا ان میں انسانی استحصال بھی شامل ہے۔

ابن خلدون نے انسانی استحصال کو معاشرتی ترقی اور طاقت کے حصول کے ساتھ جوڑا۔ ان کا نظریہ تھا کہ معاشروں کی ترقی ایک تسلسل کے تحت ہوتی ہے، جہاں طاقتور گروہ کمزور طبقوں کا استحصال کرتے ہیں۔ ان کے مطابق:

۱۔ عصبیت اور طاقت :ابن خلدون نے "عصبیت" کا تصور پیش کیا، جو کہ اجتماعی اتحاد اور قبائلی وابستگی کی صورت میں طاقت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ جب ایک گروہ طاقت میں آتا ہے، تو وہ اپنی طاقت کو برقرار رکھنے کے لیے دیگر گروہوں کا استحصال شروع کرتا ہے۔

۲۔ زرعی اور معاشی استحصال :ابن خلدون نے معاشرتی طبقاتی تقسیم کو بھی زیر بحث لایا، جہاں حکمران طبقہ کسانوں اور مزدور طبقہ کا استحصال کرتا ہے۔ یہ استحصال بنیادی طور پر معاشی اور معاشرتی ہوتا ہے، جس کا مقصد حکمران طبقے کی آسائش اور طاقت کا قائم رہنا ہوتا ہے۔

۳۔ حکومتوں کا زوال اور استحصال :ابن خلدون کے نزدیک ہر حکومت اپنے آغاز میں نسبتًا انصاف پر مبنی ہوتی ہے، لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، یہ طاقت اور حکومت کا زعم انھیں استحصالی قوت بنا دیتا ہے۔ جس سے معاشرتی تناؤ پیدا ہوتا ہے، جو بالآخر اس حکومت کے زوال کا باعث بنتا ہے۔

۴۔ عصبیت اور نفسیاتی دباؤ :ابن خلدون کا "عصبیت" کا نظریہ، جو کہ قبائلی اتحاد اور طاقت کے گرد گھومتا ہے، میں نفسیاتی دباؤ کا عنصر بھی شامل ہے۔ جب ایک گروہ طاقت حاصل کر لیتا ہے تو وہ کمزور گروہوں پر دباؤ ڈالتا ہے، نہ صرف جسمانی یا معاشی سطح پر بلکہ نفسیاتی طور پر بھی۔ طاقتور طبقہ یا گروہ اپنی طاقت کو برقرار رکھنے کے لیے خوف، عدم تحفظ، اور ذہنی دباؤ کا استعمال کرتا ہے۔

۵۔ مظلومیت کا احساس :ابن خلدون کے مطابق، استحصال زدہ افراد یا گروہ نہ صرف مادی طور پر نقصان اٹھاتے ہیں۔ بلکہ ان میں مظلومیت اور ناکامی کا ایک نفسیاتی احساس بھی پروان چڑھتا ہے۔ جب کسی گروہ کا بار بار استحصال کیا جاتا ہے، تو اس کا نفسیاتی اثر ان کی اجتماعی خودی (collective self) پر ہوتا ہے۔ نتیجتًا وہ اپنی شناخت اور قابلیت کے بارے میں مایوس ہو سکتے ہیں، جو کہ نفسیاتی استحصال کی ایک شکل ہے۔

۶۔ حکومتیں اور نفسیاتی تبدل: ابن خلدون کے مطابق، حکومتیں اور حکمران طبقے اپنی طاقت کو برقرار رکھنے کے لیے لوگوں میں خوف، عدم تحفظ، اور ناامیدی کو فروغ دیتے ہیں تاکہ وہ ان کے خلاف بغاوت یا مزاحمت نہ کر سکیں۔ یہ نفسیاتی استحصال کا ایک اہم پہلو ہے، جس کے ذریعے حکمران اپنے استحصالی نظام کو برقرار رکھتے ہیں۔ ابن خلدون نے معاشرتی تبدیلی کے سلسلے میں یہ بھی کہا کہ

جب معاشرہ زوال پذیر ہوتا ہے، تو لوگوں کی نفسیاتی حالت میں تبدیلی آتی ہے۔ وہ خوفزدہ، بے یقین اور مستقبل سے مایوس ہو جاتے ہیں۔

مجموعی طور پر ابن خلدون کے نظریات کو جب ہم نفسیاتی استحصال کے زاویے سے دیکھتے ہیں تو وہ براہِ راست نفسیات پر بات نہیں کرتے، کیونکہ ان کے دور میں نفسیات بطور ایک باقاعدہ علم موجود نہیں تھی۔ تاہم، ان کے سماجی و معاشی نظریات میں نفسیاتی پہلوؤں کی جھلکیاں موجود ہیں، خصوصاً جب وہ انسانوں کے باہمی تعلقات، طاقت کی حرکیات، اور استحصال کے موضوعات پر بات کرتے ہیں۔

روسو اور انسانی استحصال:

ژاں ژاک روسو (۱۷۱۲ء۔۱۷۷۸ء) ایک مشہور فلسفی، سیاسی نظریہ دان، اور مصنف تھے، جن کے خیالات نے خاص طور پر انقلابِ فرانس اور جدید جمہوری نظریات پر گہرا اثر ڈالا۔ روسو نے انسانی فطرت، معاشرتی ناانصافی، اور استحصال پر اپنے خیالات کا اظہار اپنی کتابوں "معاہدہ عمرانی" (Social Discourse)، "نابرابری کی پیداوار" (Discourse on the Origin of Inequality) میں کیا۔ روسو کے مطابق استحصال کا تصور بنیادی طور پر معاشرتی ڈھانچوں اور نجی ملکیت سے جڑا ہوا تھا۔

۱۔ **فطری حالت:** روسو کا ماننا تھا کہ ابتدائی انسانی حالت میں انسان آزاد اور پرامن تھے۔ "فطری حالت" میں کوئی استحصال موجود نہیں تھا۔ کیونکہ کوئی نجی ملکیت اور سماجی طبقے نہیں تھے۔ لیکن جب انسانوں نے معاشرتی نظام تشکیل دیا اور خاص طور پر نجی ملکیت کا تصور متعارف کرایا، تو اس کے نتیجے میں استحصال اور عدم مساوات نے جنم لیا۔

۲۔ **نجی ملکیت اور استحصال:** روسو کے نزدیک نجی ملکیت انسانی عدم مساوات اور استحصال کی اصل جڑ ہے۔ جب لوگوں نے زمین اور وسائل کو اپنی ذاتی ملکیت میں لینا شروع کیا، تو طاقت نے کمزور طبقات کو جنم دیا۔ جو لوگ وسائل پر قابض ہو گئے، انھوں نے ان لوگوں کا استحصال شروع کیا جن کے پاس وسائل نہیں تھے، اور یہ سلسلہ معاشرتی ڈھانچے میں استحکام پیدا کرتا رہا۔

۳۔ **سماجی معاہدہ اور استحصال:** روسو کی کتاب "معاہدہ عمرانی" میں انھوں نے ایک مثالی معاشرتی معاہدے کا تصور پیش کیا، جس میں لوگ اجتماعی مفاد کے لیے اپنی شخصی آزادی کو ریاست کے سپرد

کرتے ہیں۔ تاہم، روسو کے مطابق، موجودہ معاشرتی معاہدہ دراصل ایک استحصالی معاہدہ بن گیا تھا، جہاں امیر طبقہ اپنے مفادات کے لیے قوانین بناتا ہے اور غریبوں کو ان قوانین کے ذریعے کنٹرول کرتا ہے۔

۴۔ **معاشرتی عدم مساوات** :روسو نے دو طرح کی عدم مساوات کی بات کی۔

۔قدرتی عدم مساوات :جو جسمانی یا ذہنی صلاحیتوں کے فرق پر مبنی ہو۔

۔اخلاقی یا سیاسی عدم مساوات :جو معاشرتی ڈھانچوں کی پیداوار پر مبنی ہو، جیسے دولت، طاقت، اور مراعات کی تقسیم۔

ان کے مطابق، اخلاقی اور سیاسی عدم مساوات استحصال کی بنیادی وجہ ہے کیونکہ یہ طبقاتی فرق کو برقرار رکھتی ہے اور کمزور طبقوں کو استحصالی نظام کا شکار بناتی ہے۔

۵۔ **آزادی کا خاتمہ:** روسو کے نزدیک استحصال کا سب سے گہرا اظہار آزادی کے خاتمے اور غلامی کی صورت میں ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "انسان آزاد پیدا ہوتا ہے، مگر ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے"۔ ان کے مطابق، جدید سماج میں انسانوں کو قانونی اور معاشرتی پابندیوں کے ذریعے غلام بنا دیا گیا ہے، جو ایک نفسیاتی اور مادی استحصال کی صورت ہے۔

روسو کے نظریات میں استحصال کا مرکز معاشرتی ڈھانچوں، نجی ملکیت، اور قانونی نظاموں کے ذریعے طاقتور طبقوں کا کمزور طبقوں پر تسلط ہے۔ انھوں نے ایک ایسے معاشرے کا تصور پیش کیا جس میں لوگ برابر ہوں اور استحصال کا خاتمہ ہو، جو ان کے نظریہ "عوامی مرضی (general will) "میں جھلکتا ہے۔

کارل مارکس اور انسانی استحصال:

کارل مارکس (۱۸۸۳ء۔۱۸۱۸ء) ایک جرمن فلسفی، ماہر اقتصادیات اور سماجی نظریہ دان تھا۔ جس نے انسانی معاشرت میں استحصال کے موضوع پر گہرائی سے بحث کی۔ مارکس کے نظریات سرمایہ دارانہ نظام، طبقاتی کشمکش، اور استحصال کے گرد گھومتے ہیں، اور ان کی سب سے اہم تحریر "داس کیپیٹل" اور "کمیونسٹ مینی فیسٹو ہیں۔

مارکس کے مطابق استحصال کی جڑیں سرمایہ دارانہ نظام میں پائی جاتی ہیں، اور اس نظام کا پورا ڈھانچہ استحصالی بنیادوں پر استوار ہے

۱۔ قدرِ زائد (Surplus Value) اور استحصال:

مارکس کا سب سے مشہور نظریہ **قدرِ زائد** (surplus value) ہے، جس کے مطابق سرمایہ دار مزدور کی محنت کا استحصال کرتے ہیں۔

۔ مزدور کو اس کی محنت کے بدلے ایک خاص اجرت دی جاتی ہے۔ لیکن اس قیمت کے مقابلے میں مزدور اپنی محنت کے ذریعے سرمایہ دار کے لیے اس سے کہیں زیادہ مال پیدا کرتا ہے۔

۔ سرمایہ دار اس اضافی قدر (surplus value) کو اپنے منافع کے طور پر حاصل کرتا ہے، جبکہ مزدور کو صرف اتنی اجرت دی جاتی ہے جس سے وہ زندہ رہ سکے۔ یہ اضافی پیداوار مزدور کی محنت کا حقیقی استحصال ہے، جو سرمایہ دار کرتا ہے۔

۲۔ طبقاتی کشمکش اور استحصال:

مارکس کے مطابق، انسانی تاریخ طبقاتی کشمکش کی تاریخ ہے، جس میں ایک طبقہ دوسرے طبقے کا استحصال کرتا ہے۔

۔ مارکس نے سرمایہ دارانہ نظام کے تحت دو طبقات انسانی کو بیان کیا۔ بورژوازی (سرمایہ دار طبقہ) اور پرولتاریہ (مزدور طبقہ)۔ سرمایہ دار، جو پیداواری وسائل کے مالک ہیں، مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ منافع کما سکیں۔

۔ مزدور طبقے کا استحصال اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ انھیں اپنے استحصال کا شعور نہیں ہوتا۔ مارکس نے طبقاتی شعور کی بیداری پر زور دیا تاکہ مزدور اپنی حالت کو سمجھ سکیں اور استحصالی نظام کے خلاف جدوجہد کر سکیں۔

۳۔ غیر ملکیانہ (Alienation) :

مارکس کے نظریات میں **غیر ملکیانہ** (alienation) کا تصور بھی اہم ہے، جو استحصال کے نفسیاتی پہلو کو بیان کرتا ہے۔

۔مارکس کے مطابق، سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور اپنی محنت، مصنوعات اور حتیٰ کہ اپنی ذات سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔ وہ صرف ایک مشین کی طرح کام کرتا ہے اور اس کی محنت کا کل سرمایہ دار کے پاس چلا جاتا ہے۔

مارکس نے چار قسم کی غیر ملکیانہ کا ذکر کیا۔

۔مزدور اس شے سے بیگانہ ہو جاتا ہے جو وہ پیدا کرتا ہے، کیونکہ وہ اس کا مالک نہیں ہوتا۔

۔مزدور کام کے عمل سے بیگانہ ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ صرف ایک خودکار عمل انجام دیتا ہے جس کا اس کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

۔مزدور کی محنت صرف زندہ رہنے کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے، نہ کہ اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار۔

۔مزدور طبقہ دیگر مزدوروں سے بیگانہ ہو جاتا ہے، کیونکہ سب ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

۴۔ انقلاب اور استحصال کا خاتمہ:

مارکس کے مطابق، مزدور طبقے کا استحصال صرف اس وقت ختم ہو سکتا ہے۔ جب سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور ایک کمیونسٹ معاشرہ وجود میں آئے۔ جس میں:

۔تمام وسائل اجتماعی ملکیت ہوں گے۔

۔طبقاتی فرق اور استحصال ختم ہو جائے گا۔

۔ہر فرد اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرے گا اور اپنی ضروریات کے مطابق وسائل حاصل کرے گا۔

مجموعی طور پر کارل مارکس کے نظریات میں استحصال کا بنیادی نظریہ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر پیداوار، قدرِ زائد، اور طبقاتی کشمکش پر مبنی ہے۔ ان کے نزدیک سرمایہ داری میں مزدوروں کی محنت کا استحصال بنیادی معاشرتی مسئلہ ہے، جس کا حل صرف ایک انقلابی جدوجہد کے ذریعے ہی ممکن ہے، جو کہ استحصالی ڈھانچوں کو ختم کرے اور ایک مساویانہ اور منصفانہ معاشرہ تشکیل دے۔

علی عباس جلالپوری اور انسانی استحصال:

علی عباس جلالپوری (۱۹۹۷ء۔ ۱۹۱۴ء) ایک مشہور پاکستانی فلسفی، مصنف، اور سماجی علوم کے ماہر، جو بنیادی طور پر انسانی فکر، فلسفے، اور معاشرتی مسائل پر اپنے گہرے تجزیات کے لیے جانے جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں انسانی فطرت، معاشرتی تبدیلیوں، اور مذہب و سائنس کے تعلق پر بحث ملتی ہے۔ جلالپوری نے استحصال کے موضوع پر براہِ راست کوئی وسیع فلسفیانہ نظریہ پیش نہیں کیا، جیسا کہ مارکس یا روسو نے کیا، لیکن ان کے خیالات میں انسانی استحصال کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ ملتا ہے۔

۱۔ معاشرتی اور ثقافتی استحصال:

علی عباس جلالپوری کا زیادہ زور سماجی اور ثقافتی استحصال پر رہا۔ ان کے مطابق، معاشرتی ڈھانچے میں پائے جانے والے غیر منطقی اور قدامت پسند خیالات، مذہبی انتہا پسندی، اور فرسودہ روایات اکثر افراد کے ذہنی اور جسمانی استحصال کا سبب بنتے ہیں۔ وہ ان سماجی ڈھانچوں کو زوال پذیر قرار دیتے تھے جو فرد کی آزادی اور سوچنے کی صلاحیت کو محدود کرتے ہیں۔

۲۔ سائنسی فکر اور استحصال سے نجات:

جلالپوری کا ماننا تھا کہ سائنسی فکر اور منطقی استدلال کا فروغ انسانی استحصال کے خلاف بہترین ہتھیار ہیں۔ ان کے نزدیک، معاشرتی استحصال کی جڑیں جہالت، فرسودہ روایات، اور غیر سائنسی سوچ پر مرکوز ہوتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تک انسان اپنی سوچ کو سائنسی بنیادوں پر استوار نہیں کرے گا، وہ استحصالی نظاموں کا شکار رہے گا۔ جلالپوری نے ہمیشہ فکری آزادی اور تنقیدی سوچ کی وکالت کی تاکہ انسان ان فرسودہ سماجی اور ثقافتی ڈھانچوں سے آزاد ہو سکے جو استحصال کو فروغ دیتے ہیں۔

۳۔ مذہبی استحصال:

علی عباس جلالپوری نے اپنی کئی تحریروں میں مذہبی انتہا پسندی اور اس سے جڑے استحصالی نظاموں پر تنقید کی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب مذہب کو ذاتی یا معاشرتی مفادات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو یہ انسانی استحصال کا ایک اہم ذریعہ بن جاتا ہے۔ مذہبی پیشوا اور طاقتور طبقات عوام کا مذہب کے نام پر استحصال کرتے ہیں، ان کی سوچ کو محدود کرتے ہیں اور انھیں تعصب و تنگ نظری میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

۴۔ تعلیم اور فکری آزادی:

جلالپوری کے مطابق، تعلیم کا ایک اہم مقصد انسان کو استحصالی نظاموں سے آزاد کرانا ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ فرد کو آزادانہ اور تنقیدی سوچ کی تربیت دینی چاہیے تاکہ وہ ہر قسم کے استحصال کو پہچان سکے اور اس کے خلاف آواز اٹھا سکے۔ ان کے مطابق، معیاری تعلیم اور فکری آزادی سے ہی ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جا سکتا ہے جو استحصال سے پاک ہو۔

۵۔ نفسیاتی استحصال:

علی عباس جلالپوری نے اپنی تحریروں میں نفسیاتی استحصال کے حوالے سے بھی بات کی ہے۔ ان کے مطابق، معاشرتی ڈھانچے، روایات، اور مذہبی عقائد اکثر فرد کی نفسیات پر بوجھ ڈال کر اسے ذہنی طور پر مفلوج کرتے ہیں۔ جب انسان اپنی زندگی کے فیصلے آزادانہ طور پر نہیں کر سکتا یا معاشرتی دباؤ کے تحت رہتا ہے، تو وہ نفسیاتی استحصال کا شکار ہو جاتا ہے۔

۶۔ انسانی آزادی اور استحصال کا خاتمہ:

جلالپوری کے فلسفے کا ایک مرکزی نکتہ انسانی آزادی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک انسان کو فکری، سماجی، اور معاشی آزادی نہیں ملتی، تب تک استحصال کا خاتمہ ممکن نہیں ہے۔ وہ ایک ایسے معاشرے کی حمایت کرتے تھے جس میں ہر فرد کو اپنی زندگی کے بارے میں آزادانہ فیصلے کرنے کا حق ہو، بغیر کسی معاشرتی یا مذہبی دباؤ کے۔

علی عباس جلالپوری نے انسانی استحصال کو سماجی، ثقافتی، اور فکری غلامی کے تناظر میں دیکھا اور اس بات پر زور دیا کہ معاشرتی استحصال کی جڑیں جہالت، غیر سائنسی سوچ، اور فرسودہ روایات میں پیوست ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ فکری آزادی، تنقیدی سوچ، اور سائنسی فکر کی وکالت کی، تاکہ انسان خود کو ان استحصالی نظاموں سے آزاد کر سکے۔ جو اس کی ذہنی اور جسمانی آزادی کو محدود کرتے ہیں۔

غرضیکہ استحصال کی بنا پر حاصل کی گئی مراعات اخلاقی لحاظ سے کوئی قدر نہیں رکھتیں۔ گویا معاشرے میں اس فعل کا مرتکب اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔

جدید علوم کی آمد سے انسان نے جہاں ترقی کی متعدد منازل طے کیں وہیں دوسروں کے حقوق بھی غصب کرنے کے نئے انداز سیکھے۔ انسانی طرز عمل کی بنیاد چند خواہشات و جذبات پر ہوتی ہے۔ ان جذبات و خواہشات میں سے ایک اہم شے ذاتی تحفظ بھی ہے۔ ذاتی تحفظ کے لیے وہ معاشرے کے چند لوگوں پر انحصار کرتا ہے، کچھ لوگوں سے لین دین کا ایک سلسلہ قائم کرتا ہے۔ توازن برقرار رکھنے کے لیے وہ برابری کے اصول کو اپناتا ہے۔ مگر جب گاڑی کا پہیہ چاروں اور گھومنے کی بجائے ایک طرف کو چل دیتا ہے تو استحصال اور ظلم کا قیام عمل میں آتا ہے۔

عمرانیات چونکہ سماج کا علم ہے اور سماجی سطح پر ہونے والی ہر پیش رفت کا تعلق انسانی نفسیات سے ہوتا ہے۔ انسانی جذبات کی ناقدری و نااہلی، جائز حق سے محرومیت، غیر یقینی صورتحال کے نتیجے میں ناسٹلجیائی کیفیت کا پیدا ہونا وغیرہ نفسیاتی استحصال کا موجب بنتے ہیں۔

سماجی سطح پر جائز و ناجائز رسم و رواج کا انسانی زندگی میں دخول استحصال کی کمیت کو بڑھانے کی وجہ بنتے ہیں۔ قدیم و جدید ادوار میں انسان کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے منفی افعال میں بھی ترقی دیکھنے کو ملتی ہے۔ حق ملکیت کے ابتدائی ادوار میں استحصال محض معاشی سطح پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ مگر اب معاشیات کے دائرے سے نکل کر نفسیات کے ساتھ ساتھ تمام شعبہ زندگی میں شامل حال دکھائی دیتا ہے۔ استحصال اپنا اظہار متعدد شکلوں میں کرتا ہے۔

استحصال کی اقسام:

استحصال (Exploitation) کی مختلف اقسام ہیں، جو مختلف شعبہ جات اور حالات میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں چند اہم اقسام کا تذکرہ کیا جائے گا۔

سماجی استحصال: اس میں کسی شخص یا گروہ کو سماجی طور پر نیچا دکھانا، ان کی عزت یا حقوق کو نظر انداز کرنا، یا ان کے ساتھ ناروا سلوک روا رکھنا شامل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، اقلیتوں کا استحصال۔

معاشی استحصال: اس میں افراد یا گروہوں کا معاشی فائدہ اٹھایا جاتا ہے، جیسے کم مزدوری یا غیر منصفانہ شرائط پر کام کروانا۔ اس میں مزدوروں، کسانوں، اور کمزور طبقات کا استحصال شامل ہوتا ہے۔

جنسی استحصال: یہ استحصال خواتین، بچوں یا دیگر افراد کے خلاف جنسی بدسلوکی یا تشدد کی صورت میں ہوتا ہے، جس میں جنسی ہراسانی، زبردستی شادی، یا جسم فروشی کا دھندا وغیرہ شامل ہیں۔

سیاسی استحصال: جب حکمران، طاقتور افراد یا گروہ عوام کی سیاسی آزادی یا حقوق کا غلط استعمال کرتے ہیں تو ریاستی سطح پر سیاسی استحصال ہوتا ہے، مثلاً ووٹ کے حق کو دبانا، آزادی اظہار پر پابندیاں لگانا اور سیاسی دباؤ ڈالنا وغیرہ۔

نفسیاتی استحصال: اس میں کسی شخص کی ذہنی حالت کو متاثر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جیسے مسلسل دباؤ، دھمکیاں، یا جذباتی طور پر نقصان پہنچانا۔

ماحولیاتی استحصال: قدرتی وسائل کا غیر منصفانہ اور بے دریغ استعمال، جیسے جنگلات کی کٹائی، آلودگی میں اضافہ، یا ماحولیات کو نقصان پہنچانا، جس کا اثر عام عوام اور خاص طور پر کمزور طبقات پر پڑتا ہے۔

یہ تمام اقسام کسی فرد، گروہ، یا معاشرے پر منفی اثرات ڈال سکتی ہیں اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مختلف قانونی، سماجی، اور سیاسی اقدامات ضروری ہیں۔ استحصال کی تمام اشکال میں ایک قدر ہر جا مشترک دکھائی دیتی ہے۔ وہ یہ کہ اس عمل میں جہاں ایک فرد کا حق مارا جاتا ہے، وہیں دوسرا بے پناہ فائدہ بھی حاصل کرتا ہے۔ اس فعل کی بنا پر معاشرے میں نابرابری کی کیفیت جنم لیتی ہے۔ اعلیٰ و ادنیٰ کا ایک ایسا معیار قائم ہوتا ہے، جس سے احساس برتری اور کمتری کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ اس احساس سے سماج میں طبقاتی کشمکش سے انار کی پیدا ہوتی ہے۔ جو پر سکون روحوں کو بے چین کرتی ہے۔ گویا استحصال ایک ایسا بھیانک انسانی رویہ ہے جس میں فطرت کی بندوق کو تقدیر کے کندھے پر رکھ کر محنت کش طبقے پر شب خون مارا جاتا ہے۔

گذشتہ اوراق میں استحصال کے ساتھ مستقل ملکیت کے تصور کا تذکرہ ہوا، انسانی خونریزی کی جنگ میں جو سوال جواب چاہتا ہے وہ یہ کہ انسان میں مستقل تصور ملکیت کس طرح قائم ہوا؟ تاریخ کی ورق گردانی سے حقائق کچھ اس طرح سے سامنے آتے ہیں کہ ابتدائی دور میں زمین تمام انسانوں کی مشترکہ ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ جو شخص بھی زمین کے کسی ایک ٹکڑے کو استعمال کرتا وہ اس کی عارضی ملکیت تصور کر لی جاتی تھی۔ اور عارضی ملکیت اس وقت تک قائم رہتی جب تک کہ وہ خود اس سے دستبردار نہ ہو جاتا۔ اس دوران اگر کوئی شخص قابض ہونے کی کوشش کرتا تو وہ قانون فطرت کی خلاف ورزی کے مترادف تصور ہوتا تھا۔ اس طرح سے زندگی کی گاڑی چلتی رہی۔

مگر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ جہاں قانون کے پاسدار ہوں وہیں اس کے توڑنے والے بھی آ جاتے ہیں۔ چنانچہ خود غرضی جیسی شیطانی صفت نے انسان کے اندر اس بات کا احساس اجاگر کیا کہ وہ اگر

طاقتور ہے تو لازم ہے کہ کمزور کا استحصال کرے۔ اس کی عارضی ملکیت کو طاقت کے بل بوتے پر اپنی مستقل ملکیت میں ڈھال لے چنانچہ چھینا جھپٹی کی اس کیفیت کے نتیجے میں مستقل ملکیت کا تصور قائم ہوا۔ محمد تقی امینی اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"پہلے تو صرف زمین استعمال کرنے کا حق تھا۔ لیکن مستقل ملکیت کے تصور قائم ہونے کے بعد زمین کی ذات کی بنیاد پڑ گئی۔ ابتدا میں قبضہ نے بلا شرکت غیر ایک حق پیدا کیا تھا اگرچہ وہ عارضی تھا لیکن یہی حق بعد میں رفتہ رفتہ مستقل ملکیت کا سبب بن گیا۔ اس کے متعلق بلیک سٹون کا یہی نظریہ ہے اور جرمنی کا مشہور مقنن سوگنی بھی تقریباً اسی رائے کا مؤید ہے۔ اہل روما میں جائیداد کا ابتدائی تصور یہی پایا جاتا ہے۔"(۶)

ابتدائی مستقل تصور ملکیت میں املاک کسی ایک شخص کی ملکیت نہیں بلکہ خاندان اور جماعتیں اس کی مالک تھیں۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ مشترکہ حقوق سے شخصی حقوق کی علیحدگی کے نتیجے میں شخص واحد اس کا مالک مانا گیا۔ جدید دور میں جو صورت تصور ملکیت کی رائج ہے وہ متذکرہ بالا ہی ہے۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ناگزیر ہے وہ یہ کہ انسان کی معاشرتی زندگی کے ہر دور میں ملکیت کی نوعیت تبدیل ہوتی رہی۔ جس سے استحصال کی نوعیت بھی تبدیل ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

ابتدا میں جب کہ کاشت کاری کے فرائض غلاموں سے ادا کرائے جاتے تھے۔ ایسی صورت میں ادنیٰ درجوں کے متعدد غلاموں کو چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اور انھیں اعلیٰ و معتبر غلاموں کی نگرانی میں دے کر ان سے کاشت کاری کے کام انجام دلوائے جاتے۔ اس صورت میں جب بد نظمی پھیلنا شروع ہوئی تو زمینداروں کو اس بات کا احساس ہوا کہ مکمل طور پر غلاموں کے ہاتھ زمین دے کر نہ تو زمین کی قدر و قیمت میں کسی قسم کا اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی پیداوار بہتر بنیادوں پر حاصل کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ زمینی مالکان نے (پٹہ دوامی) اور مقررہ لگا کر آزاد آسامیوں سے کاشت کروانا شروع کر دیا۔ اس طریقے سے کاشت کاروں کی دو قسمیں سامنے آئیں:

1۔ غلام کاشت کار

2۔ آزاد آسامی کاشت کار

کاشت کاروں کی اس نئی قسم کے سامنے آتے ساتھ ہی مالکان نے ان کو چند اختیارات بھی دے دیے ،ان اختیارات کو محدود ملکیت کا نام دیا جاتا۔ سب سے پہلے روما میں کاشت کاروں کی اس قسم کو بہت زیادہ

مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس قسم سے عوام کو کافی فائدہ حاصل ہوا۔ اس طرز نے کاشت کاروں کو اتنے وسیع اختیارات کا مالک بنا دیا یا یہاں تک کہ عام شخص انھی کو مالک سمجھنے لگتا۔ محصول وقت پر ادا کر دینے سے مالک کو بھی یہ اختیار نہ تھا کہ وہ کاشت کار سے کسی قسم کی پوچھ گچھ کرتا۔ اور یہی محدود ملکیت کا نظام آگے چل کر جاگیر داری نظام کی بنیاد کا باعث بنا۔ زمینداری اور جاگیر داری نظام کی تمام اچھائیوں اور برائیوں کی پیداوار یہ نظام تھا۔ کیونکہ

۔ استفادہ کے تمام حقوق نے اسی محدود ملکیت سے موروثی شکل اختیار کی۔ اس طرح سے دی جانے والی تمام زمینیں بالعموم آزاد آسامیوں کے ورثا تک منتقل ہو جایا کرتیں۔

۔ آزاد آسامیوں ہی کی بدولت کھیتوں کو بٹتی پر دینے کا رواج قائم ہوا۔ اس میں لوگ سالانہ پیداوار کا ایک مخصوص حصہ مالک کی نذر کرتے تھے۔

اب حالات نے پلٹا کھایا تو آزاد آسامی کے تحت سامنے آنے والے کاشتکاروں کو ایک وقت میں پہلے جیسی مراعات نہیں دی جارہی تھیں۔ جس سے اس طبقہ کی تنزلی کا دور شروع ہوا۔ اور زمینوں پر زمینداروں کی گرفت سخت ہوتی گئی۔ جس کی بدولت ایک تیسرا طبقہ پیدا ہوا۔ یہ رعایا کا درمیانی طبقہ تھا جو نہ غلاموں کی طرح مجبور و بے کس تھا اور نہ ہی آزاد آسامیوں کی مانند مکمل اختیارات کا مالک تھا۔

کاشت کاری نظام کی وقتاً فوقتاً اس بدلتی ہوئی صورت حال کا بادشاہان وقت نے بغور جائزہ لے کر ایک نئے نظام کی داغ بیل ڈالی جو جاگیر داری نظام کہلایا۔ ابتدائی دور میں جاگیریں بادشاہوں کے مصاحبوں کو درباری صلہ میں عطا کی جاتی تھیں۔ زمینداری کی ابتدائی صورتیں کم و بیش ہر قوم میں ایک سی تھیں۔ یہاں تک کہ رومی و یونانی اقوام میں بھی یہ تصورات دکھائی دیتے ہیں۔

> "زرعی معاشرے کی ابتدا غلامی سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد کاشتکاروں، مزارعوں اور دوسرے محنت کشوں کی حالت غلاموں سے چنداں بہتر نہیں تھی۔ ان کی کمائی کا بیشتر حصہ سلاطین اور جاگیرداروں کی نذر ہو جاتا تھا۔ زرعی معاشرہ دو طبقات میں منقسم تھا۔ کام چور، کاہلی اور بے کار طبقہ آزاد تھا۔ اور محنت کش طبقہ غلام تھا"۔ (۷)

جاگیر داری کے اس نظام نے ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے انسانی زندگی پر بھیانک اثرات مرتب کیے۔ قدرت کی وہ زمین جو سب انسانوں کی مشترکہ تھی اور جس کی مساویانہ حیثیت سے سبھی حقدار تھے اس نظام کی کاریگری سے محض زمینداروں کے ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ گئی۔ اور کاشتکاروں کا طبقہ جبر کے

شکنجے میں جکڑ کر رہ گیا۔ جو ہر قسم کے وحشیانہ مظالم کو برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ چنانچہ جبر و تحکم کے شکنجے میں جکڑا یہ طبقہ نہ تو آزاد کاشت کار جیسے حقوق کا مالک رہا اور نہ رعایا جیسے ابتدائی حقوق پا سکتا تھا۔ بلکہ تمام فطری صلاحیتوں کو خیر باد کہہ کر زرعی غلام میں تبدیل ہو گیا۔ استحصال کا شکار ہونے والا طبقہ غلام و بے بس تھا۔ اس کو نہ تو زمین چھوڑ کر کسی دوسرے پیشے اختیار کرنے کی اجازت تھی اور نہ ہی اپنے مالک سے کسی نیکی کی امید تھی۔

تاریخ کی ورق گردانی کر کے اگر یونان، روما اور ایشیا وغیرہ کے حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے تو ہر جا انفرادیت کا بھوت لوگوں کے سروں پر منڈلاتا ہوا انھیں تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کر رہا تھا۔ اس طرز پر زندگی سادگی سے عیش پرستی کی جانب مائل ہونا شروع ہو گئی تھی۔

سیاسی اقدار صرف شخصی آرزؤں کو پورا کرنے کا وسیلہ بن گیا۔ اور ریاست کی بنیاد ایک مخصوص طبقہ کی اغراض پر رکھی جانے لگی۔ جس سے عوام اور امرا میں آئے دن خانہ جنگیاں زوروں پر رہتیں۔ اور ظالم حکمران اپنے لمبے ہاتھوں اور اختیارات کا استعمال کر کے عوامی حقوق کی کوششوں کو بغاوت کا نام دے کر ان کے ساتھ ہر قسم کا وحشیانہ برتاؤ کرتے۔ اہل روم کے رؤسا کی زندگیوں میں تمام عیش و عشرت اسی نچلے طبقے کی بدولت تھی۔

کاشت کاروں اور عوام کی زندگی گدھوں اور بیلوں سے کسی طور کم نہ تھی۔ حکام غیر محدود اختیارات کے مالک تھے اور ہر طرح کی سزا دینے کا اختیار رکھتے تھے۔ دنیا میں رائج تمام عبرتناک سزائیں گویا مجبور و بے کس طبقہ کے حصے میں آتیں۔ تاریخ اہل روما کی تاریک راتوں کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روشنی کی کرن آگسٹن نے جلائی۔ جس نے چند اصطلاحات نافذ کر کے عام انسان کی زندگی کو بھی اہم بنانے کی کوشش کی۔ مگر رعایا پروری کا یہ جذبہ زیادہ دیر پا ثابت نہ ہو سکا۔ کیونکہ مکمل زہریلے نظام میں چند قطرے مٹھاس کے کب تک اپنا اثر دکھا سکتے تھے۔

یونان اور روما کے ساتھ اگر ایشیا کی سلطنتوں کا حال بیان کیا جائے تو وہ بھی اسی طرح دردانگیز رہا۔ عیش پرستی اور ظلم و تعدی کا بازار ایشیا کی تاریخ میں بھی ہر جگہ گرم نظر آتا ہے۔

مختصراً یہ کہ ابتدائی ادوار میں انسان ایک ایسے معاشرے کا خواہشمند دکھائی دیتا ہے جہاں اس کی ضروریات پوری ہوتی رہیں اور تمام انسانوں کو یکساں حقوق فراہم کیے جائیں۔ یہ ایسا معاشرہ تھا جسے اشتمالی معاشرہ کہا گیا۔ جس میں خوراک، لباس اور ٹھکانا قبیلہ کے تمام افراد کی مشترکہ ملکیت جانا تھا۔ شخصی املاک کے

وجود کے ساتھ زرعی انقلاب کے نفوذ کا آغاز ہوا تو وحدت انسانی پارہ پارہ ہو گئی۔ مجبور و بے بس لوگوں کے لیے یہ کائنات دوزخ کے مناظر پیش کرنے لگی۔

ڈاکٹر مظفر حسن ملک کا کہنا ہے:

"دولت کا ارتکاز استحصالی طبقات کو تخلیق کرتا ہے۔ جب بڑے بڑے زمیندار وجود میں آئے تو مالک اور مزارع کا جھگڑا بھی پیدا ہوا پھر درمیانہ طبقہ وجود میں آ گیا۔۔۔ درمیانہ طبقہ ایک طرف تو اعلیٰ طبقے سے برسرپیکار تھا۔ اور دوسری طرف ادنیٰ طبقات پر ظلم و ستم کی ایجاد میں اعلیٰ طبقات کا ہم نوا بھی تھا۔۔۔ یہ تمام عوامل مل کر صرف ایک ہی شے پیدا کر سکے جسے استحصال اور ظلم و ستم کا نام دیا جاتا ہے۔"(۸)

شخصی املاک نے جہاں انسان کے اخلاق حمیدہ کو پست کیا، وہیں خون ریزی، سفاکی اور قتل و غارت جیسے بے پناہ گھناؤنے جرائم کا سبب بھی بنا۔ اور آج لالچ کی یہی صفت انسانی دنیا میں جرائم اور استحصال کا اولین محرک ثابت ہو رہی ہے۔

i. ادب اور استحصال:

زبان و بیان کے دلکش پیرائے میں انسانی جذبات و احساسات کے اظہار کو ادب کا نام دیا جاتا ہے۔ ادب اگرچہ کسی ایک فرد کا تخلیق کردہ ہوتا ہے لیکن وہ فرد کسی ایک معاشرہ کا حصہ اور تہذیب کا نمائندہ ہوتا ہے۔ تہذیب کا یہ نمائندہ اپنی تحریروں کے ذریعے ادب کو اظہار و ابلاغ کا ذریعہ بناتا ہے۔

ادیب اپنے دور کا عکاس ہوتا ہے۔ اس کا تخیل اپنی تہذیب و معاشرہ کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں اس کائنات کے تمام مظاہر، جملہ حقائق، انسانی زندگی کے مشاغل اور ہر جا بکھری ہوئی صداقتوں کو بیان کرتا ہے۔ ادب اور ادیب دونوں کا معاشرے سے گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ گرد و پیش کے حالات و واقعات اور زمانہ کے انقلابات سے واقفیت کو محسوس کیے بنا کوئی بھی قلم کار اپنے قلم سے زندہ اور تابناک تخلیق سامنے نہیں لا سکتا۔

ادیب چونکہ حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے اس لیے اس کے عہد کے سماجی و معاشی مسائل اور مختلف تحریکیں اس پر عام بندے سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ معاشرے میں ظلم و جبر اور ناانصافی و استحصال عام

ہوتے دکھائی دیں تو انھیں صفحہ قرطاس پر بکھیر کر انصاف کے علمبرداروں کی توجہ اس جانب مبذول کراتا ہے۔ علی عباس جلالپوری اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

"یہ سچ ہے کہ ہر عہد کا ادیب اپنے زمانے کے جبر، رواں نظام کی بے چینی نیز عوام کی بے بسی سے مضطرب ہو کر ہی قلم اٹھاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس درد کو جو اس کے عہد نے اسے دیے ہیں صفحہ قرطاس پر کچھ اس نوع سے بکھیرے کہ اس کی آواز ہر عہد کی آواز میں شامل ہو سکے۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے تو اچھا ادب ظہور میں آتا ہے۔"(۹)

ادب کا ہر عہد انسانی استحصال کی طویل تاریخ پیش کرتا رہا ہے۔ ادب میں انسانی استحصال کا بیان متضاد رویوں کو سامنے لاتا ہے۔ جو حاکم و محکوم کے مابین پائے جاتے ہیں۔ استحصالی رویوں کی بدولت ادب کی تخلیق ہر ملک اور علاقے کے مخصوص سماجی ماحول اور حالات کے تابع ہوتی ہے۔ استحصالی رویوں پر مشتمل ادب خاص طور پر وہاں زیادہ تخلیق ہوتا ہے۔ جہاں لوگ ظالم اور مظلوم میں منقسم ہو جائیں۔ ایسے معاشروں میں لوگوں کی جرات اور بے باکی پر مہر ثبت کر دی جاتی ہے۔ ان کے ذہنی شعور کو پاگل پن کا نام دے کر دار و رسن پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ ناامیدی اور یاسیت کو ان کا مقدر ٹھہرایا جاتا ہے۔ ایسے میں ادیب اپنے قلم کے ذریعے راہ جہاد اختیار کرتا ہے تو بے پناہ مسائل و مشکلات راستے کی رکاوٹ بنتے ہیں۔ ظالم طبقہ اس عظیم بشر کی آواز دبانے کی ہر ممکن سعئ کرتا ہے۔ کبھی سنسر شپ کی پابندیاں اور سختیاں تو کبھی حقائق کو بغاوت کا نام دے کر ڈرا دھمکا کر تخلیقی عمل روکنے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے۔ مگر یہ راہ حق کے متلاشی ہزارہا پابندیوں کے باوجود اظہار کے منفرد راستے تلاش کر لیتے ہیں۔ کبھی علامات کے ذریعے تو کبھی شعوری ابہام کو وسیلہ بناتے ہوئے ذو معنی الفاظ استعمال کر کے اپنے مافی الضمیر کو بیان کرتے ہیں۔ ایسا ادب جو سوسائٹی میں پھیلی ہوئی خود غرضی اور انسانی بے حسی کو اپنا موضوع بنائے، یا کوئی بھی ایسا عمل جو انسانی زندگی کی قدر و قیمت کم کرے استحصالی ادب کہلائے گا۔

یہ دنیا پسماندگان اور مظلوم افراد سے بھری پڑی ہے۔ غربت، جہالت، توہمات اور تعصبات و عدم استحکام جیسے بے شمار عوامل ایسے ہیں جن کی وجہ سے تمام مخلوق خدا جبر کی قوتوں کا نوالہ بن دکھائی دیتی ہے۔ استحصال و جبر کی بے پناہ قوتیں ہیں۔ جنھیں اپنا کر بین الاقوامی سطح پر کئی مضبوط اقوام کمزور قوموں کو اپنے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ بالادست طبقہ غریب عوام کا استحصال کرتا ہے کبھی ریاست و سیاست کے نام پر تو کبھی کلچر و معیشت کے نام پر۔ استحصال سماج میں ناآسودگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ جہاں انسانی حقوق کو پامال کرنے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں۔

ادب کے ذریعے استحصال کو اجاگر کرنے کے مقاصد:

سماجی شعور بیدار کرنا:

ادب ایک طاقتور ذریعہ ہے جس کے ذریعے لوگ ان مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں جنھیں وہ عام زندگی میں نظر انداز کیے ہوتے ہیں۔ ادیب اپنی تخلیقات کے ذریعے استحصال اور ناانصافی کے خلاف سماجی شعور بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

احتجاج اور مزاحمت:

ادب ایک ایسا مزاحمتی آلہ ہے جو سماجی اور سیاسی استحصال کے خلاف احتجاج کو ممکن بناتا ہے۔ ادیب ظلم و جبر کے خلاف لکھ کر اسے چیلنج کرتے ہیں اور قارئین میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

متاثرین کی آواز بننا:

ادیب ان لوگوں کی کہانیوں کو بیان کرتا ہے جو خود اپنی آواز بلند نہیں کر پاتے۔ استحصال زدہ افراد یا گروہوں کے دکھ درد، ان کی محرومیوں، اور ان کے حقوق کی آواز کو ادیب اپنی تحریروں میں نمایاں کرتے ہیں۔

ii. استحصال اور دنیائے ادب میں اہم انقلابات کا تذکرہ:

قدیم و جدید دنیائے ادب کے اوراق کھنگالے جائیں تو انسانیت سوز کئی واقعات آنکھوں کے چاروں اور گھوم جاتے ہیں۔ اپنے اپنے دور کے ایسے واقعات جنھیں پس پردہ رکھ کر انسانی دکھوں کو صحیح معنوں میں سمجھا نہیں جاسکتا۔ ہم بات کرتے ہیں دنیا میں ہونے والے چیدہ چیدہ اہم انقلابات کی جن کے ظہور پذیر ہونے میں ادب کا بہت بڑا کردار رہا ہے۔ لیکن تفصیلاً بیان سے قبل ایک سوال ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے۔ کہ انسانی استحصال کی تاریخ میں بھلا انقلابات کا تذکرہ کرنا کہیں وقت کا ضیاں / موضوع سے ہٹنا تو نہیں۔ کیونکہ انقلاب بالواسطہ یا بلاواسطہ حکومتی خامیوں، آمریت، سماجی ناہمواریوں اور انسانوں پر ظلم و ستم سے متعلق ہوتا ہے۔ انقلاب کسی بھی عظیم اتھل پتھل کا نام ہوتا ہے۔ اور اگر دیکھا جائے تو استحصال بھی انسانی حقوق کی پامالی، ناانصافی، عدم مساوات، مملکت کی بدعنوانی وغیرہ کو بیان کرتا ہے۔ انقلاب اور استحصال کا ادب میں بیان کس کی بدولت؟ گذشتہ اوراق میں ادب اور استحصال کا تعلق واضح کرنے کی جسارت کی گئی ہے۔ یہاں بات انقلاب اور ادب کی کرتے ہیں۔

اس بات سے ہم سب آگاہ ہیں کہ آج تک ادیبوں نے کوئی انقلاب برپا نہیں کیا۔ لیکن اس بارے بھی انکار ممکن نہیں کہ انسانوں پر ہونے والے سماجی، سیاسی، معاشی اور زراعتی حوالے سے مظالم کی داستانیں رقم کرنے والے بھی ادیب ہی ہوتے ہیں۔ ادبا کی نایاب تحریریں انقلابات کا ذریعہ ضرور بنی ہیں۔ عالم موجودہ میں جہاں بھی انقلاب برپا ہوا ادب کا کردار واضح رہا۔ تاریخی اعتبار سے عالمی انقلابات کی طویل فہرست موجود ہے۔ لیکن یہاں موضوع کی مناسبت سے دو اہم انقلابات کا تذکرہ کیا جائے گا۔ جس میں انسانیت سوز واقعات کے بیان کے ساتھ ساتھ اس کا اثر ادب عالیہ پر واضح طور سے دیکھا جاسکتا ہے۔

۔ انقلاب فرانس ۱۷۹۹ء۔۱۷۸۹ء

۔ انقلاب روس ۱۹۱۷ء

یہ دو ایسے انقلابات تھے جن کی جڑوں میں دانشوروں کے تصورات تھے۔ ان عظیم مفکروں نے عوام الناس کے اذہان کو اپنی بیش بہا تخلیقات سے بدلا۔ انھیں بنیادی حقوق سے روشناس کرا کے ان کے لہو میں جوش وولولہ پیدا کیا گیا۔

انقلاب فرانس: ۱۷۹۹ء۔۱۷۸۹ء (French Revolution)

فرانسیسی انقلاب تاریخ عالم میں عظیم انقلاب کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ ایسا اقدام تھا جس نے پورے یورپ پر ان مٹ نقوش چھوڑے۔

تاریخ میں انقلاب فرانس کی ابتدا ۱۶۴۳ء تا ۱۷۱۵ء سے ہونا شروع ہوئی، جب لوئی چہاردہم کی آمرانہ طرز حکومت تھی۔ جس کا کہنا تھا کہ "میں ریاست ہوں" یہ ایسا جابر حاکم تھا جس نے شاہی شان و شوکت کا علم بلند رکھنے کی خاطر ایسے محلات تعمیر کرائے جن پر بے تحاشا دولت خرچ ہوئی۔ اور تمام عوام کو اپنا غلام بنائے رکھا۔ اور ان کی فطری آزادی سلب کرلی۔ آمرانہ طرز کا یہ رویہ لوئی پانچ دہم (۱۷۱۵ء۔۱۷۷۴ء) کے دور میں بھی جوں کا توں رہا۔ یہاں تک کہ لوئی چھ دہم (۱۷۷۴ء۔۱۷۹۳ء) کا دور آیا تو عوام الناس کی نا آسودگی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ کسی نے بھی اپنے حق کے لیے لب کشائی نہ کی۔ اور نہ ہی کسی کو ایسا کرنے کی جرات تھی۔ بنا کسی وجہ اور قصور کے لوگوں کو گرفتار کر کے قید کر دیا جاتا۔ جبر واستبداد کے ایسے ماحول میں لوگوں کی سانسیں بند ہونے لگیں۔

اتنے سخت ماحول میں تبدیلی کی زیریں لہریں اٹھنے لگیں۔ محدود سطح پر اٹھتی ان لہروں کے لیے راہیں ہموار کرنے راہ حق کے سپاہی اپنے قلم کو ہاتھوں میں لیے میدان عمل میں اترے۔ ان میں مانٹیکو، والٹیر، جان لاک اور روسو وغیرہ کا نام خاص قابل ذکر ہے۔

مانٹیکو نے اپنی کتاب "Spirit of Laws" میں سب سے پہلے فرد کی آزادی اور تحفظ کے بارے میں بات کی۔ اس نے کہا کہ شہریوں کی شخصی آزادی کو یقینی بنانے کے لیے ہر مثبت اقدام کو یقینی بنایا جائے۔

"Civil Government" کے خالق جان لاک (Jahn Locked) کے خیالات نے فرانسیسی انقلاب کو جلا بخشنے میں اہم فریضہ انجام دیا۔ اس نے اپنی کتاب میں اس زمانے کی بات کی جبکہ دنیائے انسانی فطری حالت میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ ہر انسان آزاد فطری حالت (state of nature) میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ جب تمام انسانوں کی ضروریات بآسانی پورا ہو جایا کرتی تھیں۔ ہر شخص آزاد و خود مختار تھا۔ اس کے باوجود کوئی جرائم کی دنیا نہ تھی۔ کہیں حق تلفی کا وجود تک نہ تھا۔ سب کچھ ایک خوبصورت خواب کی مانند تھا۔ مگر پھر حالات نے پلٹا کھایا اور انسان نے اس راہ کا انتخاب کر لیا جہاں فطری آزادی مفقود تھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان نے اس پر امن معیار زندگی / فطری حالت سے نجات کا راستہ کیونکر اپنایا؟ اس کا جواب جان لاک اس طرح سے دیتا ہے کہ

۔ سماج میں باقاعدہ کوئی قانون نہیں تھا جس پر عمل پیرا ہوا جاتا۔

۔ کوئی معروف اور غیر جانبدار ثالث نہ تھا۔

۔ کوئی ایسا حاکم نہ تھا جو بننے والے قانون کی پاسداری پر غور و فکر کرتا۔

ایسے حالات میں چند آزاد منش لوگوں نے اپنے من کی سنی اور ہر وہ طرز اپنائی جس سے ان کا فائدہ وابستہ تھا۔ لہذا انسان فطری آزادی اور پر سکون حالت سے دور ہو کر تباہی کے دہانے پر آن کھڑا ہوا۔ تباہی سے خود کو بچانے کے لیے سماج میں مستقل مملکت کی بنیاد ڈال کر ایک بار پھر امن و امان کی جانب قدم بڑھایا گیا۔ امن کی اس کیفیت کو جان لاک نے دو معاہدوں کے طور پر بیان کیا:۔

۔ پہلا معاہدہ: یہ ایسی طرز کی مملکت ہو گی جس میں تمام اختیارات اور حقوق کا مالک سماج ہو گا۔ کسی ایک شخص کو اختیارات کا مالک نہیں بنایا جائے گا۔

۔دوسرا معاہدہ: اس کے تحت لوگوں کے تمام حقوق ایک بادشاہ کے حوالے کیے جائیں گے۔ جان لاک نے اپنی کتاب میں اس امر پر زور دیا کہ بادشاہ چونکہ معاہدے کا ایک فریق ہو گا اس لیے اگر وہ عوام کے حقوق، آبرو اور جان ومال کی حفاظت صحیح طرح سے نہ کر سکا تو اسے اختیارات سے ہٹا دیا جائے گا۔
اس طرح جان لاک نے اپنے نکات کے ذریعے فرانسیسی عوام کو آمریت کے خلاف متحد ہونے کا تابناک راستہ دکھایا۔ اس نے اپنی کتاب میں واضح کر کے عوام کو بتایا کہ بادشاہ کے اختیارات محدود ہیں۔

"انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جدھر دیکھو وہ پا بہ زنجیر ہے۔ بہت سے لوگ اپنے آپ کو دوسروں کا مالک سمجھتے ہیں حالانکہ وہ خود ان سے بڑھ کر غلام ہوتے ہیں۔"(۱۰)

فرانس کے نامور ادیب روسو نے اپنی کتاب کا آغاز ہی انسان کی فطری آزادی سے کیا۔ اس کے مطابق مملکت کے قیام سے قبل انسان پر امن اور خوشحال زندگی بسر کر رہا تھا۔ اڑتے ہوئے آزاد پرندوں کی مانند ہر قسم کی قید سے بے بہرہ تھا۔ آبادی کی افراط اور دیگر معاشی وجوہات کی بنا پر انسان نے سادہ زندگی کو خیر باد کہا اور ہوس وخود غرضی پہلو سے لگائے ذاتی ملکیت جیسے فساد کو اپنانے لگا۔ جس کی بدولت سماج میں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا علَم بلند ہوا۔ انسانی استحصال کی ایک طویل تاریخ سامنے آئی۔ روسو نے اپنی کتاب میں استحصال زدہ عوام کو یہ شعور دیا کہ ان کے جابر حکمران / نمائندے انھی کے منتخب کردہ ہیں۔ عوام یکجا ہو کر اپنے نمائندوں کو بآسانی بدل سکتی ہے۔ روسو کے نظریات میں رائے عامہ سب سے بڑی طاقت بن کر سامنے آتی ہے۔

درج بالا ادیبوں کے علاوہ بھی متعدد لکھنے والے ایسے تھے جنھوں نے انقلاب فرانس کی کوششوں میں راہیں ہموار کیں۔ جن کا تذکرہ تفصیل سے خاص اوپر کیا گیا وہ اس لیے ضروری تھا کیونکہ یہ ایسے کمیاب لوگ تھے جنھوں نے کڑے وقت اور حالات میں اپنے جرات مندانہ خیالات سے فرانسیسی انقلاب کی تخم ریزی کی۔ انھی کے نظریات کی بدولت عوام الناس کی توجہ سماجی بدحالی، آمریت اور معاشی بدعنوانیوں پر پڑی۔

انقلاب روس ۱۹۱۷ء(Russian Revolution)

انقلاب روس سے نہ صرف یورپین بلکہ پوری دنیائے انسانی متاثر ہوئی۔ یہ ایک ایسا بھرپور سماجی و معاشی انقلاب تھا۔ جس کی بدولت دنیا کے معاشی نظام کی ہیت یکسر بدل گئی۔ اس نظام کی بدولت روس سمیت پوری دنیا میں آزادی اور اخوت کا پرچار ہوا۔ معاشی مساوات کے اصول باقاعدہ طور پر وضع کیے گئے۔ بعد میں اسی کی اساس کارل مارکس کا نظریہ اشتراکیت سامنے آیا۔ اس انقلاب سے قبل دنیا میں طبقاتی کشمکش نے مزدور

اور غریب طبقہ کا جینا دو بھر کر رکھا تھا۔ سرمایہ دار، مظلوم، دبے، کچلے ہوئے لوگوں کا استحصال کرتے ہوئے آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔

۱۹۰۰ء میں نکولسن کی ظالمانہ و جارحانہ حکومت کے بارے مزدوروں اور کسانوں نے شدید غم و غصہ کا اظہار کیا۔ ان ہی دنوں ملکی سطح پر روس اور جاپان کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ اور ہار کی صورت میں نکولسن کی اندرونی کمزوریاں واضح طور پر سامنے آئیں۔ ۲۳ جنوری ۱۹۰۵ء کو جب مظلوم عوام اتحاد کا دامن پکڑے ہوئے جلوس کی صورت زار کے محل کی جانب بڑھی تو مخالفین نے اندھا دھند فائرنگ کر دی جس سے بے پناہ مظلوم لوگ مارے گئے۔ بچ جانے والوں نے امرا کے گھروں کو آگ لگادی۔ ۱۹۱۷ء میں رونما ہونے والے انقلاب کے پس پردہ ۱۹۰۵ء کا واقعہ تھا۔ جس میں روس کی آمرانہ حکومت کا ظالمانہ سلوک واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

انقلاب روس کو جلا بخشنے میں وہاں کے ادبی سرمائے سے کسی طور انکار ممکن نہیں۔ انیسویں صدی میں روس کی عوام میں ذہنی بیداری عروج پر تھی۔ ہر خاص و عام تعلیمی ادارے انقلابی خیالات کا مرکز بنے دکھائی دیے۔ حالانکہ زار حکومت نے تمام ملکی و غیر ملکی ادب جو لوگوں میں شعور پیدا کر رہا تھا اس پر پابندی لگادی۔ اس کے باوجود ٹالسٹائی، چیخوف اور میکسم گور کی جیسے ادیب ایسے تھے جن کی تحریروں نے انقلابی اذہان کو تقویت دی۔ میکسم گور کی کی تصنیف "ماں" نے ہر خاص و عام کو متاثر کر کے اس میں شعوری بیداری پیدا کی۔ کارل مارکس کی کتاب "منشور کیمو نزم "(Communism Manifesto) اشتراکیت کے حوالے سے قابل ذکر ہے۔ علی عباس جلالپوری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "کارل مارکس نے لکھا
> "ہمارا مقصد شخصی املاک کو ایک طبقے سے دوسرے طبقے میں منتقل کرنا نہیں ہے۔ بلکہ اسے مٹا دینا ہے۔ طبقاتی جدوجہد کو نرم کرنا نہیں بلکہ ایک نئے معاشرے کی بنیاد رکھنا ہے۔"(۱۱)

کارل مارکس نے یورپی معاشروں میں اس وقت رائج مخصوص نظام کی بدولت پھیلنے والی طبقاتی کشمکش کو کھل کر بیان کیا۔ اس نے اپنے اشتراکی منشور میں جس قسم کے سماج کی رونمائی کرائی وہ دراصل جاگیرداری نظام ہی کی جدید شکل تھا۔ اس نئے سرمایہ داری نظام کی جڑوں میں قدیم جاگیرداری نظام موجود تھا۔ جس نے انسانی نسلوں کے آپسی اختلافات کو کم یا ختم کرنے کی بجائے بڑھاوا دیا۔ نتیجے کے طور پر جبریت و استحصال کی کئی

نئ صورتیں پیدا ہوئیں۔ مارکسی منشور یورپی دنیا کی ابتری کو بیان کر رہا تھا۔ استحصال کی ایک طویل تاریخ اس منشور کا حصہ بنی۔ کارل مارکس نے شہری غلاموں کی ابتر حالت کو کھل کر بیان کیا۔ اس نے بتایا کہ عہد وسطیٰ کے زرعی غلاموں میں سے جو غلام شہروں میں پناہ گزیں تھے۔ انھی کی بدولت سرمایہ داروں نے اپنے ابتدائی عناصر کی نشوونما کی۔

اس کے ساتھ ہی امریکہ کی دریافت کے ساتھ ساتھ ہندوستان اور چین کے تجارتی راستے کھلنے کی بدولت ترقی کی نئ راہیں کھلیں، تو سرمایہ داروں نے اورزیادہ استفادہ کیا، صنعتی منڈیاں قائم ہوئیں۔ سرمایہ دار طبقہ کو جہاں بھی غلبہ ہوا اس نے انسانی جوہر کو آنے اور پائی میں بدل دیا۔ دور جدید میں انسانی استحصال کے تقاضے بھی جدید ہونے لگے۔ پہلے پہل مذہب اور سیاست کی آڑ میں چھپا ظلم و جبر اب عریاں، حیاسوز اور براہ راست وحشیانہ طرز اختیار کر گیا۔

جبر واستحصال کی انسانیت سوز تاریخ میں یہ ایک نیا انداز اپنایا جارہا تھا کہ اہل حرفہ چاہتے تو وحشی واجڈ قوموں کو بھی تہذیب کے دائرے میں لا کھڑا کرتے اور تہذیب یافتہ کو دور جہالت میں دھکیل کر ان کا اثر ورسوخ صفر کر دیتے۔ دیو ہیکل صنعتوں کی بدولت سرمایہ داروں نے پوری دنیا کو اپنی مٹھی میں قید کر لیا۔ انھوں نے اجناس کی ارزانی کو بھاری توپ خانہ کے طور پر استعمال کیا۔ حالات کی ابتری کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ غیر مہذب ممالک کو مہذب ملک کا غلام بنادیا گیا۔ جہاں پوری دنیا اس آفت زدہ ماحول کی لپیٹ میں آئی وہاں مشرقی اقوام کیسے محفوظ رہ سکتی تھیں۔

اس بات سے ہر صاحب علم آگاہ ہے کہ جب دنیا کے کسی ایک کونے میں انسانی حقوق کی بات کی جائے تو اس کا اثر دوسرے ممالک کی تاریخ پر بھی پڑتا ہے۔ مارکسی نقطہ نظر نے یورپ سے باہر کی دنیا کو بھی متاثر کیا۔ مارکس کی آواز 'انسانی حقوق' نے ہندوستانی عوام کی کیڑے مکوڑوں سے بدتر گزرتی زندگی کو انسانیت کے مقام تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس لیے یہاں چند ضروری تاریخی معلومات کا تذکرہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جو ہندوستانی حالات کی تبدیلی کی وجہ بنیں۔

مارکسی منشور اور ہندوستانی انقلاب:

پاکستان اور بھارت کو تاریخی منظر نامے میں دیکھا جائے تو دونوں ممالک کے ثقافتی، سماجی، اقتصادی، تہذیبی اور سیاسی مسائل سدا ایک سے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں زیادہ تر فوجی حکومت رہی اس کے بر عکس بھارت میں نفرت انگیز نام نہاد سیکولر جمہوریت نے اپنا ڈیرہ جمائے رکھا۔

ہندوستان میں محنت کشوں نے استحصالی حالات سے چھٹکارا پانے کے لیے سر عام عظیم انقلاب کی ابتدا ۱۸۵۷ء میں کی جو پورے ہندوستان میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ کچلی ہوئی عوام کی یہ کوشش اسی صورت کارگر ثابت ہو سکتی تھی۔ اگر ان کے پاس غریب کسانوں (جو ان کی حمایت کر رہے تھے) کو دلاسے دینے کے لیے کچھ مراعات ہوتیں۔ ایسی کمزور صورت حال سے ہندوستانی جاگیرداروں نے استفادہ کرتے ہوئے اس کوشش کو کچل دیا۔ عوام کے حقوق برطانوی حکومت تک پہنچانے کی غرض سے ایک سیاسی جماعت تشکیل دی گئی۔ جس کا مقصد غریب عوام کے حالات کو بہتر بنانا تھا۔ مگر کانگریسی لیڈروں نے وہی کیا جو ہر سیاست جماعت کرتی ہے۔ انھوں نے غربا و محنت کشوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا اور حکومت سے مراعات حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ مگر یہاں بھی حالات میں زیادہ بدلاؤ دکھائی نہ دیا اور اس میں بھی سرمایہ دار و جاگیردار طبقہ غالب نظر آنے لگا۔ اس بنا پر آگے چل کر یہ جماعت بھی کوئی خاص مثبت نتائج پیدا نہ کر سکی۔

ہندوستانی سرمایہ دار ہو یا جاگیردار دونوں ہی برطانوی حکومت کے پالک تھے۔ جو ان کے لیے ہر سطح پر محض معاشی مراعات حاصل کرنے کو ترجیح دیتے۔ اسی لیے غربا جہاں کہیں اتفاق رائے سے اپنے حقوق کی بات کرتے وہیں ظالمانہ ہتھکنڈے استعمال کر کے ان کی کوششوں کو کچل دیا جاتا۔ ایسی متعدد مثالیں تاریخی حوالے بن سکتی ہیں۔ جیسے گاندھی کا نظریہ عدم تشدد نے عوامی جوش و خروش کو ٹھنڈا کر کے اسے لفظی و بے معنی احتجاج تک محدود کر دیا۔ کیونکہ گاندھی ازم کا بنیادی مقصد عوام میں تبدیلی کے جوش و خروش کو ٹھنڈا کرنا اور سرمایہ داروں کے مذموم مقاصد کے لیے ان کا استحصال کرنا تھا۔ اسی طرح مقامی سرمایہ داروں کو برطانوی تحفظ دلانے کے لیے غیر ملکی اشیا کا مکمل بائیکاٹ کرا دیا گیا۔ تاکہ مقامی صنعت کو فروغ حاصل ہو جس سے سرمایہ دار کی جیب اور بھاری ہونے لگی۔ مگر غریب عوام سانپ او بچھوؤں کی ان چالوں کو نہ سمجھ پائی اور سودیشی تحریک کا حصہ بن کر اپنے جسموں پر نئے سرے سے ڈنگ مروا لیے۔

آئرلینڈ اور روس کی انقلابی تحریکوں سے متاثر ہو کر ہندوستان کے استحصال زدہ طبقہ کے نوجوانوں نے مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کیا مگر نتیجتاً ان کا بھرپور استحصال کیا گیا۔ ان پر ظلم و بربریت کی انتہا کی گئی۔ متعدد افراد دار و رسن کا نوالہ بن گئے۔ اس کے برعکس لیڈر پس پشت کھڑے تماشا دیکھ کر محظوظ ہوتے رہے اور اپنے مفادات حاصل کر لینے کے بعد آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام تک برطانوی حکومت کی گرفت ہندوستان پر کافی حد تک کمزور ہو چکی تھی۔ اس لیے جب دوسری جنگ عظیم پیش آئی تو ہندوستانی

عوام یکجا ہو گئے۔ جن کی آنکھوں میں غم و غصہ کی آگ شعلہ بر ساتی تھی۔ جسے دیکھ کر برطانوی حکومت خوف کھانے لگی۔ اس لیے مصلحت کی راہ اختیار کرتے ہوئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستانی سر زمین کو دو ممالک میں منقسم کر دینے ہی میں عافیت جانی۔

مختصراً ہندوستان کی تقسیم کے پس منظری مطالعہ کا مقصد غریبوں کے استحصال کا جائزہ لے کر اس بات سے آگاہی حاصل کرنا تھی کہ دنیا کے ایک کونے میں لکھا جانے والا ادب مشرقی دنیا کو کس طرح اپنی لپیٹ میں لے کر ان میں جذبہ حریت پیدا کرتا ہے۔ کوئی بھی انسان پیدائشی غریب اور لاچار نہیں ہوتا بلکہ دولت کے پجاری اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے لیے ان کو استعمال کرتے ہیں اور ان سے انسانیت کا بلند مقام چھین کر انھیں نالی کے گندے کیڑے بنا دیتے ہیں۔

مارکسی نقطہ نظر نے غربا کے حقوق کی بات حکمران طبقہ کے گوش گزاری اور لوگوں کو شعور دے کر انھیں اپنے حق کے لیے بولنا سکھایا۔ یہ ایسا منشور تھا جو جہاں پہنچا مظلوم اور استحصال زدہ طبقہ کے مشترکہ حقوق کا داعی رہا۔ کیمونسٹ پارٹی کے مفادات قومیت کی حد بندی سے بالاتر تھے۔ مارکسی نظریات کے تحت ہندوستان کا ادیب بیدار ہوا اس نے رومانوی رنگ سے نکل کر حقیقت کی جانب قدم بڑھایا۔ ادب کی دنیا میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھا جانے والا کل ادب استحصال زدہ عوام کے حقوق و مسائل کا ترجمان رہا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو بہت سے ادیبوں نے سماجی اصلاحات اور قانونی تبدیلیوں کے مطالبے کو جنم دیا۔ ادب کے ذریعے نہ صرف انسانی تجربات کی عکاسی کی گئی بلکہ معاشرتی ناانصافیوں اور استحصال کو اجاگر کرنے کا ذریعہ بھی بنا۔ ادیبوں نے استحصال کے مختلف پہلوؤں کو بیان کر کے معاشرتی شعور بیدار کیا اور ظلم کے خلاف مزاحمت کا پیغام دیا۔ اس طرح، ادب نے استحصال زدہ افراد کی آواز بن کر ان کی جدوجہد کو عالمی سطح تک پہنچایا۔

iii. اردو ناول میں استحصال کی پیشکش:

ادب کو انسانی جذبات و خیالات کو وسیلہ تصور کیا جاتا ہے۔ ادب انفرادی و اجتماعی تغیرات و حوادثات انسانی سے براہ راست متاثر ہوتا ہے۔ ادب سماج میں تخلیق و تعمیر اور تصادم و حوادث سے عبارت ہے۔ یہ زمان و مکان اور حیات عصر سے ہر گز بلند نہیں ہوتا بلکہ زندگی کے حقائق کا ترجمان ہوتا ہے۔

زمانے کے بدلتے ہوئے ادوار نے متعدد رنگ بدلے۔ ان رنگوں میں کہیں وفا، خلوص، پیار و محبت، امن و آشتی اور دوستی کے ایوان تھے تو کہیں کینہ پروری، منافقت، دھوکہ دہی اور انسان دشمنی کے دھبے بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس تمام تغیر و تبدل کا اثر انسانی قوتوں پر بھی مرتب ہوا۔

انسانی قدریں چاہے ان کا تعلق سماج سے رہا یا تہذیب و اخلاق سے وقت کے ساتھ ساتھ مسلسل ارتقا پذیر رہیں۔ انسانی زندگی جب ترقی کی راہ پر گامزن ہوئی تو ان ترقی کے راستوں کی بناوٹ میں انسانی قدروں کو استعمال کیا جانے لگا۔ اندھیر نگری نے اپنا ڈیرہ جمایا تو انسان دوستی کے چراغ ٹمٹمانے لگے۔ سفاکیت اس قدر بڑھی کہ عفریت کی طرح چھا گئی۔ جلتے بجھتے چراغوں کی لو میں بڑھتی ہوئی عفریت کو اردو ناول نگاروں نے صفحہ قرطاس پر بکھیر کر انسانی لہو کو ہمیشہ کے لیے جاوداں بنا دیا۔ ناول نگاروں نے اس درد کو بیان کیا جس کا تقاضا وقت اور حالات کر رہے تھے۔ ناول ہر دور میں انسانی جذبات و احساسات کا بخوبی ترجمان رہا ہے اور رہے گا۔

ناول ایک ایسی صنف سخن ہے جسے جدید دور کا رزمیہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ کیونکہ اس نے ہر دور میں انسانی زندگی کی تعمیر و تخریب، کشمکش اور شکست و ریخت کی آویزش کو بخوبی بیان کیا۔ بدستور جاری نشیب و فراز کے طویل سلسلے کو بیان کرنے کی صلاحیت جس قدر ناول میں ہے کسی اور صنف ادب میں ممکن نہیں چاہے وہ نثری ہو یا شعری۔ ناول فرد اور ذات کے اندرونی تضادات و تصادم، مخفی و ظاہری ہر ایک کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

تقسیم سے قبل ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد ہندوستان کی سماجی و سیاسی زندگی انتشار و افتراق کا شکار ہو گئی۔ زندگی کے ہر میدان میں تبدیلی کے عوامل خارج و باطن میں انگڑائیاں لینے لگے۔ لڑائی ہندو مسلم دونوں قوموں نے لڑی مگر نشتر صرف مسلمانوں پر چلائے گئے۔ جدید تعلیم اور فنی شعور سے بے بہرہ مسلمان انتقام کی آگ میں جھلسنے لگے۔ بے دست و پا قوم کو جدید اور اہم تقاضوں سے روشناس کرانے کے لیے سر سید احمد خان جیسے عظیم رہنما میدان عمل میں اترے۔ تعلیم و بصیرت اور شعور سے عاری اس قوم کو راہ راست پر لانے کے لیے سر سید احمد خان اور ان کے رفقانے بھرپور مخالفت کے باوجود کوششیں جاری رکھیں۔ قطرہ قطرہ پانی ٹپکتا رہا تو پتھر میں سوراخ کر گیا۔ ان حضرات نے نظم و نثر دونوں اصناف میں گراں بہا تجربات کیے۔ بکھرے ہوؤں کو یکجا کرنے میں جتنی اصناف سخن اپنائی گئیں ان سے یک نہ شد دو شد فائدہ ہوا۔ ایک طرف بھٹکی ہوئی امہ راہ راست پر آئی تو دوسری جانب ادب کئی طرز کی تحریروں سے مالا مال ہو گیا۔ سر سید کے

افکار نے جہاں بکھری ہوئی قوم کو یکجا کیا وہیں اہل قلم بھی روشن خیالی کی جانب مائل ہوئے۔ ان میں حالی، شبلی، مولوی ذکاءاللہ، چراغ حسن حسرت، مولانا محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد خاص قابل ذکر ہیں۔

ناول کے حوالے سے ڈپٹی نذیر احمد کو اردو کا اولین ناول نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مولوی نذیر احمد نے مغربی ادب کا مطالعہ کیا اور ناول کی اظہاری کیفیت اور وسعت کو محسوس کرتے ہوئے مقصدی و اصلاحی ناول لکھنے سے ابتدا کی۔ "مراۃ العروس" سے اردو ناول نگاری کا باب وا ہوا۔ ۱۸۶۹ء سے لکھنے کی ابتدا کی اور بعد ازاں متعدد ناول لکھ ڈالے۔ نذیر احمد نے مقصدی و اصلاحی ناولوں میں اپنے دور کے سیاسی و سماجی مسائل زندگی کو بیان کیا۔ مسلم معاشرے میں خاص عورت کے مقام اور اس کی حالت زار کو بیان کرتے ہوئے مراۃ العروس میں لکھتے ہیں:

> "مرد کتنا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو ممکن نہیں کہ عورت کی مدد کے بدون گھر چلا سکے، یہ وجہ ہے کہ عورت کے مرنے کو خانہ ویرانی سے تعبیر کیا جاتا ہے"۔ (۱۲)

نذیر احمد جہاں عورت کو باعث رحمت قرار دیتے ہیں اور اس کے وجود کو گھر کی ویرانی کے خاتمے کا ذریعہ مانتے ہیں وہیں مرد ہونے کا حق استعمال کرتے ہوئے مرد کے بگاڑ کا باعث عورت کو مانتے ہیں۔ جبکہ یہاں وہ یکسر بھول جاتے ہیں مرد و عورت ایک دوسرے کے امین ہوتے ہیں۔ رشتوں میں کچھ پابندیاں جہاں لگائی جاتی ہیں وہاں اپنانی بھی پڑتی ہیں۔

مگر مرد ہر طرح سے خود کا دامن بچاتے ہیں اور عورت کی جھولی میں تمام قصور ڈال کر اس کا استحصال کرنا اپنا اولین فریضہ سمجھتے ہیں۔ فسانہ مبتلا ایسا ناول ہے جس میں بچوں اور ان کی ماں کو زندہ در گور کرنے کے بعد بھی ہمدردی سمیٹنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ استحصال کی عجب داستان پیش کی جاتی ہے۔ کہ اتنا ظلم کرنے والے کو محض بے وفا قرار دے کر تلخ حقائق کو نصیب و تقدیر کی آڑ میں چھپا دیا جاتا ہے۔ مولوی نذیر احمد کے بعد اردو ادب کی تاریخ میں متعدد نام ہیں۔ جنھوں نے ناول کی صنف میں طبع آزمائی کی مگر یہاں انھی چند ناول نگاروں کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ جن کے ہاں استحصالی رویے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

علامہ راشد الخیری عورتوں کے استحصال اور ان کی سماجی الجھنوں کو بھرپور انداز میں ناولوں کا حصہ بناتے ہیں۔ عورتوں کے استحصال کی داستان رقم کرنے میں ان کا ثانی نہیں۔ زخمی دلوں کی داستان بیان کرنے کی بنا پر انھیں مصور غم کہا گیا ہے۔ علامہ راشد الخیری کے ہاں عورت کا استحصال روایت سے ہٹ کر سامنے آتا

ہے۔ عورت جب اپنے حقوق کا علم بلند کر کے چوراہے پر آ کھڑی ہوتی ہے تو مغرب کی تقلید میں اسے مدر پدر آزاد ہونے کی سند عطا کر کے اس کا استحصال کیا جاتا ہے۔

ناول بنیادی طور پر سماج کا عکاس ہوتا ہے اور استحصالی رویے بھی سماج ہی میں پروان پڑھتے ہیں۔ جنھیں محسوس کرنے اور صفحہ قرطاس پر بکھیرنے کے لیے حقائق سے نگاہیں دو چار کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مرزا محمد ہادی رسوا اردو ناول کا ایک اہم نام ہیں۔ جنھوں نے ایک طرف "امراؤ جان ادا" میں لکھنوی تہذیب کی بھرپور عکاسی کی تو دوسری جانب ایک شریف زادی کو طوائف کے روپ میں استحصال کی چلتی پھرتی تصویر بنا کر پیش کر دیا۔ مرزا ہادی رسوا نے اردو ناول کو تبلیغ کے خشک ماحول سے نکال کر زندگی کی تلخیوں کو بیان کرنے کے قابل بنا دیا۔

"امراؤ جان ادا" ۱۸۹۹ء میں منظر عام پر آیا۔ مرزا ہادی رسوا کے زمانے میں سر سید کی تحریک اپنے زوروں پر تھی۔ اس لیے ہادی رسوا نے تخلیت اور مثالیت پسندی سے باہر حقیقت نگاری کو اپناتے ہوئے اردو زبان و ادب کا ایک مایہ ناز شہکار قاری کے سامنے پیش کیا۔ مرزا ہادی رسوا نے امیرن کی کہانی معاشرے کے گوش گزار کی جس کا مقصد ایک طرف طوائف کو لکھنوی تہذیب کی علامت بنا کر پیش کرنا تھا تو دوسری جانب ان سفاک چہروں پر سے پردہ سرکانا تھا۔ جو گڑیوں پٹولوں سے کھیلنے والی معصوم بچیوں کو سر بازار بیچ کر اپنی جھوٹی انا کی تسکین کرتے ہیں۔ بیچ بازار عصمت فروشی کا دھندا کرنے والی یہ طوائف اتنی بری نہیں جتنا بڑا مجرم معاشرہ ہوتا ہے۔ جہاں دلاور خان جیسے ظالم و جابر لوگ شریف زادیوں سے ان کی چھت چھین لیتے ہیں۔ مرد اپنی ذات کا بدلہ لینے کے لیے عورت پر وار کرتا ہے۔ دلاور خان کی بکی ہوئی امیرن کی قسمت اسے ایک بار اس در پر لے آئی جہاں اب اس کی یادیں تھیں اور یادیں ہی رہیں۔ کیونکہ معاشرے کے ہاتھوں لٹے ہوئے سے اپنے بھی جی چراتے ہیں۔ ماں کی مامتا تو بیٹی کو دیکھ کر پگھل گئی مگر بھائی کی غیرت آڑے آ گئی اور امیرن ایک بار پھر در بدر ہو گئی۔ امیرن کا استحصال جہاں معاشرے نے کیا وہیں رشتوں نے بھی کیا۔ انھیں عزت کی چادر اوڑانی نہ آئی۔

پریم چند اردو ناول نگاری کا ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے اپنے ذہنی سفر کا آغاز انیسویں صدی کی آخری دہائی میں کیا ان کا تحریری سفر کم و بیش نصف صدی پر مشتمل ہے۔ پریم چند کوئی ایک شخصیت نہ تھے بلکہ اپنے خیالات اور تحریروں کی بدولت اردو ناول کا ایک دور کہلائے۔ انھوں نے ۱۹۰۱ء سے لے کر ۱۹۳۶ء تک بیش بہا ناول لکھے۔ ہندوستانی سماج میں طبقاتی فرق کے طویل سلسلے کی بدولت انسانیت کی ہونے والی

تذلیل پر بنا کسی مذہب، رنگ و نسل کے اگر کسی نے بآواز بلند ہمدردانہ صدا لگائی تو وہ پریم چند ہیں۔ بقول ابو بکر عباد:

> "پریم چند مہاتما گاندھی کے نظریے سے کافی متاثر تھے۔ انھوں نے پہلی بار اپنے ناولوں میں کسانوں اور دیہات کے باسیوں کی خستہ حالی کے اسباب متعین کرنے کی کوشش کی اور عوامی جدوجہد اور اجتماعی جذبات کی ترجمانی بھی کی۔"(۱۳)

پریم چند نے ظلم و ستم کرنے والوں کی بجائے مظلوموں کا ساتھ دیا۔ استحصالی قوتوں کی دل شکنی کی اور استحصال کا شکار ہونے والوں کی دلجوئی کی۔ پریم چند نے اپنے ناول "اسرار معابدہ، ہم خرما و ہم ثواب، روٹھی رانی، میں رسم و رواج اور مذہب کے نام پر استحصال کو کھل کر بیان کیا۔ غربت سے بڑی کوئی لعنت نہیں اور بیوگی سے برا کوئی دکھ نہیں۔ ان سب حالات کے باوجود اگر انسانیت کی تذلیل کی جائے تو جبریت کی مثال اس سے بڑھ کر کیا ہوگی۔ کہ اکثر معاشروں میں عورت مرد کے لیے جاگیر بنتی رہی۔ مرد جس طرح چاہتا اسے اپنی وراثت جان کر ظلم و ستم کا نشانہ بناتا چلا جاتا۔ ایک ہی سمے میں ایک سے زائد شادیاں رچا کر بیویوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے والا جاگیر دار، راجہ اپنے آپ کو طاقتور مرد گردانتا۔ پریم چند نے عورتوں کو گائے بھینس کی مانند سمجھنے والے جاگیر داروں کو بے باکانہ تنقید و تضحیک کا نشانہ بنایا۔ پریم چند کے ہاں زیادہ تر غربا پر ہونے والے ظلم و ستم کا بیان ملتا ہے۔ ان کی بے بسی اور کسمپرسی کی کہانی کو انھوں نے اپنے ناولوں کی صورت بیان کر کے اہل شعور کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی۔

۱۹۳۶ء ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی ابتدا کا زمانہ تھا۔ پریم چند کے بعد سجاد ظہیر نے "لندن کی ایک رات" کے نام سے ناولٹ لکھا اس میں انھوں نے مارکسی نظریات کے تناظر میں انسانی حقوق کی بات کی۔ جس میں استحصال زدہ عوام کے زخموں پر غور کرنے کی ترغیب دلائی گئی۔ سجاد ظہیر نے شعور کی انوکھی تکنیک اپناتے ہوئے جن دریچوں کو وا کر کے تازہ ہوا کے جھونکے محسوس کرائے ان دریچوں کو کشادگی عطا کر کے اس موضوع کو مزید وسعت دینے والے ناول نگار کچھ عرصہ کے لیے ناپید ہو گئے۔ پریم چند کے بعد سے لے کر جنگ عظیم دوم اور ملکی تقسیم تک انسانی دکھ کو بیان کرنے والے چیدہ چیدہ ناول نگار استحصال کی تاریخ میں شامل حال نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک انسانی حقوق کی علمبردار رہی۔ اس کے ساتھ وابستہ متعدد ناول نگار اردو کے دامن کو اپنی تحریروں سے تر کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان میں عزیز احمد، عصمت چغتائی، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر اور خدیجہ مستور خاص قابل ذکر ہیں۔

اردو ناول کا یہ المیہ رہا ہے کہ اسے متعدد بار مغربیت کے تناظر میں رکھ کر دیکھا اور پرکھا جاتا رہا۔ اس لیے اس کے معیار کا تعین بہتر انداز میں نہیں کیا گیا۔ لیکن بغور دیکھا جائے تو مغربیت کی مادہ پرست زندگی نے وہاں کے انسان کو جذبات و احساسات سے عاری کر رکھا ہے۔ وہاں کی زندگی میں تلخی، فرد کی مہیب تنہائی اور سناٹے میں معمولی ادبی بصیرت فوری محسوس کر لی جاتی ہے۔ کیونکہ ترقی کی اندھی تقلید اور آسائش کے وسائل کی دوڑ نے اہل مغرب کو انسانی رویوں سے دور کر دیا۔ چنانچہ مغربی ادیب اگر اپنے اظہار کے لیے ذرا سا انسانیت سوز واقعہ کو اپنی تحریر کا حصہ بناتا تو گویا وہ کوئی بڑا ادب تخلیق کرتا۔ اس کے برعکس مشرقی ادیبوں کی کاوشیں کسی طور کم نہیں۔ انھوں نے ہر دور کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ادب کی تخلیق کی۔ مشرقی ادیبوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے انسانی استحصال کی طویل تاریخ کو بیان کیا۔ بر صغیر کے ادیبوں کے موضوعات میں تنوع قابل ستائش ہے۔ عصمت چغتائی کا ناول "ضدی ۱۹۴۰ء" میں رومانی المیہ کے تناظر میں خاندانی روایات کے ذریعے انسانیت کی تذلیل اور استحصال کی داستان رقم کی گئی ہے۔ ضدی میں جاگیر دار طبقہ کی سخت روی، معاشرتی درجہ بندی میں لپٹے ہوئے جھوٹے پندار کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ عزیز احمد نے تقسیم سے قبل بیش بہا ناول تحریر کیے۔ خاص جنس نگاری کے حوالے سے استحصال کی جو تصاویر پیش کیں وہ اردو ناول نگاری کا اہم باب بنا۔ لیکن ناول "آگ" ایک اضافے کے ساتھ ناول کی تاریخ میں سامنے آیا۔ اس ناول کا دورانیہ بیسویں صدی کی ابتدا سے ہوتا ہوا قیام پاکستان تک کے زمانے پر محیط ہے۔ کشمیر کے پس منظر میں لکھے گئے اس ناول میں کشمیری عوام کی غربت کے پس پشت جاگیری و مہاجنی نظام کی جو لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا اور اس سے عوام الناس کا جو استحصال کیا جا رہا تھا اسے وضاحت سے بیان کرنے کی کامیاب کوشش ملتی ہے۔ عزیز احمد نے اس ناول کے ذریعے مارکسی نظریے کے تحت انقلاب روس کے بر صغیر پر پڑنے والے اثرات کو سامنے لایا۔ برطانوی راج میں مقامی باشندوں اور ان کی عورتوں کا سرمایہ داروں اور تاجروں کے ہاتھوں استحصال دکھایا گیا ہے۔

"ایسی بلندی ایسی پستی" استحصال کے حوالے سے عزیز احمد کا ایک اور شاہکار ہے۔ اس میں رؤسا کی بے جا آزادی کی بنا پر پھیلنے والی جنسی بے راہ روی کی بدولت کمزور و محکوم طبقے کا استحصال ملتا ہے۔ یہ ایسے ماحول کو بیان کرتا ہے جس میں گھریلو ملازماؤں و کنیزوں کو نوجوان لڑکوں کی عیش پرستی کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ گھر کی چار دیواری سے باہر بھی غربا کی حالت ناقابل بیان ہوتی ہے۔ حویلیوں میں انھیں عیاشی کے لیے ملازمہ بنا کر رکھا جاتا ہے۔ تو کھیتوں میں مزدوری کرتے ہوئے بھی یہ غریب زادیاں ان امرا کی عیاش جوانی کا سامان

بنتی ہیں۔ یہ نام نہاد شرفا جہاں غربا پر اپنا حق جتلاتے ہیں وہاں ان کی شریف زادیاں آنکھ بچا کر عشق و عاشقی کے قصے رقم کرتی ہیں۔ گویا پورا معاشرہ برائی کی دلدل میں دھنسا ہوا دکھایا گیا ہے۔ اس میں روایتی جاگیر دارانہ سماج میں رائج ذات پات کے نظام میں انسانی اقدار کی شکست و ریخت کو موضوع بنایا گیا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی تقسیم ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے کم و بیش دو سو سال انگریزوں کے تسلط میں رہنے کے بعد آزاد فضا میں سانس لینے کی خوشی دونوں قوموں کی دیدنی تھی۔ اس خوشی کا ایک المناک پہلو قربانیوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کی صورت میں سامنے آیا۔ خطہ کی تقسیم کے ساتھ ہی نسلی منافرت، مذہبی جنون اور فرقہ وارانہ فسادات کا نئے سرے سے دروا ہوا۔ ڈاکٹر سید علی حیدر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "ملک کی تقسیم نے بعض بھیانک حالات سے دوچار کیا۔ ملک دو حصوں میں تقسیم ہوا خون اور آگ کی ہولی کھیلی گئی۔ انسان، انسان کے خون پیاسا ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ انسانیت سوز واقعات اس برصغیر سے انسانیت کا جنازہ نکال دیں گے۔ آزادی کا پرچم کچھ اس طرح لہرایا کہ۔۔۔ تخریبی حالات پہلے آئے اور تعمیری بعد میں۔۔۔ اس ہلچل میں زندگی نئے تقاضوں کے سانچوں میں ڈھلنے لگی۔۔۔ پرانی اور نئی قدروں کے تصادم میں جذبات و محسوسات نئی طرح سے متشکل ہونے لگے۔"(۱۴)

قیام پاکستان کے بعد ہجرت کے حوالے سے ظلم و جبریت کی انتہا دیکھنے کو ملتی ہے۔ ظلم و ستم اور بربریت کی داستانوں سے پورا ادب بھرا پڑا ہے یہاں تک کہ کوئی صنف اس دلدوز واقعہ سے خالی نہیں۔ بدلے کی ایسی آگ بھڑکی کہ ہر انسان اس کی زد میں آیا۔ خاص کر عورت کے حوالے سے تقسیم کے تناظر میں دیکھا جائے تو استحصالی قوتوں کا علم بلند رہا۔ استبدادی قوتوں کی شکار یہ مفلوک الحال ہستی ہمیشہ سے ایسے حالات سہتی آ رہی تھی۔ قراۃ العین حیدر کا ناول "میرے بھی صنم خانے"، کرشن چندر کا ناول "غدار" اور قدرت اللہ شہاب کا "یا خدا" اس حوالے سے اہم ناول مانے جاتے ہیں۔

"یا خدا" کے ذریعے عورت پر ڈھائے جانے والے مظالم کی کہانی ذرا ہٹ کر سامنے آتی ہے۔ یہ ظلم اس وقت اور تلخ ہو کر سامنے آتا ہے جب غیروں کے ہاتھوں لٹنے والی "دلشاد" اپنوں کے ہتھے چڑھتی ہے تو ادھوری چادر کو اپنے ہاتھوں سے کھینچ اسے سر بازار ننگ لا کھڑا کرتے ہیں۔ صدائے غم داستان کس کو سنائے جبکہ سننے والے بھی اس صف میں کھڑے تھے جہاں غیر تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں لٹی پٹی جب

تحفظ کی چار دیواری تک آ پہنچیں تو وہاں کے محافظ ہی ان کے لٹیرے بن گئے۔ عورت کا استحصال کرنے والوں نے اپنی ہوس کی تسکین کی میں حیوانیت کی انتہا کر دی۔ بربریت کی شکار عورت کی دلخراش چیخیں سن کر کسی کو بھی رحم نہ آیا۔ نام نہاد شریف النفس معاشرے کی زبان سن کر انسانیت شرما جاتی ہے کہ لڑکی ہاتھ لگی ہے تب تک نہیں چھوڑنی جب تک مر نہ جائے۔ تقسیم کا وقت تو ایسا تھا کہ جب انسان کو پیٹ بھرنے کی پڑی تھی۔ مگر یہاں ہوس کی آگ کچھ اور ہی رنگ لیے ہوئے تھی۔ بیٹی، بہن کی عصمت دری کے لیے لائنیں بنائی جا رہی تھیں۔ انجان لوگ یہ سمجھنے لگے کہ شاید یہاں کھانے کو راشن بانٹا جا رہا ہے۔ راشن ہی تو تھا ان درندہ صفتوں کے لیے جنھیں نوچنے کے لیے لڑکی مل گئی تھی۔ یہ ایسے گدھ تھے جو اس وقت تک اپنے شکار پر جھپٹتے رہے جب تک اس کی آخری سانس چلتی رہی۔ اور شاید مر جانے کے بعد بھی ہوس ٹھنڈی نہ ہوئی ہو گی۔

آزادی اور ملکی تقسیم کے بعد فرقہ وارانہ فسادات سے سماجی، تہذیبی و اقتصادی سطح پر کئی تبدیلیاں رو نما ہوئیں۔ کئی مسائل آئے روز جنم لینے لگے۔ ان تمام تبدیلیوں اور نئے موضوعات کے ساتھ ادیبوں نے معاشرے کو گلے لگایا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد حالات نو زائیدہ مملکت سمیت ہندوستان میں احسن طریقے سے انجام دیے جانے لگے۔ تاریخ شاہد ہے کہ برصغیر میں جو واقعات رو نما ہوئے کسی اور خطہ ارضی کی عوام ایسے حالات سے دوچار نہیں ہوئی ہو گی۔ مگر ناول نگاروں نے ڈوبتی ناؤ کو سنبھالا دیا اور اس صنف ادب میں نئے تقاضوں اور نئی جہات کو اپنایا۔ ان حوصلہ افزا تحریروں اور گزرتے وقت نے بظاہر زخموں کو مندمل کر دیا مگر بغور دیکھا جائے تو زخم اندر سے ابھی بھی ہرے تھے۔ ان پر تو ایک کھرانڈ کی تہہ جمی تھی جو ذرا سی لَو ملنے پر پھر سے تازہ ہو جاتی تھی۔ انسانی استحصالی تاریخ میں عجیب واقعات رو نما ہو رہے تھے کہ اپنے ہی اپنوں کی عزتیں پامال کرنے میں مصروف عمل تھے۔ انداز اتنا جارحانہ تھا کہ انسانی روح تک کو گھائل کر دیا۔ ڈاکٹر ذاکر اس عفریت زدہ ماحول کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "فرقہ وارانہ تعصب اور کشت و خون کے جو مظہرے ان دنوں دیکھنے میں آئے۔ مہذب دنیا میں اس کی مثال شاید ہی ہو۔ گھر کے گھر اجڑ گئے۔ مکان جلا کر خاک کر دیے گئے۔ بے گناہ مسکین در بدر مارے مارے پھرنے پر مجبور ہو گئے۔ سالہا سال سے فرقہ وارانہ منافرت کا کھولتا ہوا لاوا ابل پڑا، انسانی قدریں خطرے میں پڑ گئیں"۔ (۱۵)

فرقہ وارانہ فسادات کی بدولت استحصال کی تاریخ میں جن واقعات نے اضافہ کیا انھیں کم و بیش ہر ناول نگار نے اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ ہر مصنف کے قلم سے عصری صورتحال کی تلخیوں کے چشمے پھوٹے۔

قرۃالعین حیدر نے فسادات و ہجرت کے واقعات کو مٹتی اور بنتی ہوئی تہذیب کا نام دیا۔ قرۃالعین حیدر نے تقسیم ہند کے حوالے سے ہونے والے انسانیت سوز واقعات کو جس عمدگی سے برتا ان میں تحریک آزادی ایک صدمے کی صورت میں سامنے آئی ہے۔ اندازِ بیان میں جو کمال دکھایا گیا وہ گویا جمی جمائی زندگی کا استعارہ تھا۔ ان کے ناول "میرے بھی صنم خانے" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "پرانے خاندان مٹ گئے، زندگی کی پرانی قدریں خون اور نفرت کی آندھیوں کی بھینٹ چڑھ گئیں، ایک عالم تہہ وبالا ہو گیا"۔ (۱۶)

تقسیم سے قبل انسانوں کے دکھ سکھ کسی حد تک مشترک تھے۔ تقسیم کے ساتھ ہی دکھوں میں وسعت آگئی۔ ایک دوسرے کی جان، مال، عزت و آبرو لٹ گئی۔ انسانیت بے بس ہو گئی۔ نوزائیدہ مملکت میں از سر نو آبادکاری کے مسائل ایک طرف پریشان کن تھے۔ تو دوسری جانب متعدد اور مسائل سر اٹھائے نظر آئے۔ مفلوک الحال مہاجر اپنی جانیں و عزتیں بچتے بچاتے بمشکل منزل تک پہنچے تو اپنے ہی ہم مذہب عزتوں کا کھلواڑ کرنے لگے۔ لوٹ مار اور اغوا کے نتیجے میں قید کی جانے والی عورت جب تک سہہ سکتی تھی اس کے وجود سے ہوس کی آگ ٹھنڈی کی جاتی۔ پھر اسے دہکتی ہوئی آگ کی بھٹی میں جلنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔ طوائف کی صورت عورت پل پل مرتی رہتی۔ عورت کا استحصال ایک ہی زمانے میں مختلف نوعیتوں سے ہوتا رہا ہے۔ ظلم و بربریت کی اتھاہ گہرائیوں تک بھی جائیں تو اس کی پیمائش نہ کر سکیں۔ عورت کے استحصال میں ہوس کی آگ اس قدر بھڑکی کہ باپ کو درخت سے باندھ کر جوان بیٹیوں کی عصمت دری کی گئی۔

ہر طرف برہنہ زندگی استحصال زدہ معاشرے کا عکس دکھا رہی تھی۔ ان تمام حالات کو من و عن ادیبوں نے صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا۔ معاشرے کے شرفا کو گٹر کے ڈھکن سرکا کر سماج میں پھیلی بدبو سنگھانے کی کوشش کی گئی۔ زندگی جتنی تلخ تھی آزادی کے بعد نوزائیدہ مملکت میں واضح دیکھی جاسکتی تھی۔

۱۹۵۰ء کے بعد سے ملک میں ابتری کی کیفیت اور زیادہ بڑھ گئی۔ ناول کے موضوعات میں مزید تنوع آنے لگا۔ یہ ایسا وقت تھا جب لکھاری کسی خوابوں کے شہزادے کو چاہ کر بھی نہ لا سکتے تھے۔ اس دور کا انسان نہ صرف مجبور و محکوم نظر آتا تھا بلکہ حقائق کی ننگی سنگلاخ چٹانوں سے سر پٹختا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایسے انسان تھے جو جھگیوں اور تنگ و تاریک گلیوں میں مارے مارے پھرتے۔ فاقے کرتے، ذلتیں سہتے، مستقل استحصال کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ انھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا کہ اگر زندگی بے لباس ہو کر آئے اور اسے برہنہ آنکھ سے دیکھا جائے تو پتا چلے کہ یہ کس قدر مظلوم، بے بس اور لاچار ہے۔

شوکت صدیقی پاکستانی اردو ناول نگاری میں استحصالی حالات کو بیان کرنے میں مغربی لکھاری بالزاک کا سا مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے جن مظلوموں کو اپنے موضوعات میں جگہ دی نہ تو وہ خیالی تھے اور نہ کتابی بلکہ ان کی ذاتی زندگی کے تجربوں میں جل بھن کر تیار ہونے والے مفلوک الحال لوگ تھے۔ "خدا کی بستی" ۱۹۵۷ء کی تصنیف ہے جس میں اس دور کو بیان کیا گیا جب بر طانوی سامراج کے تیار کردہ کارندے بیو رو کریٹ و جاگیر دار اپنی طاقت کے بل بوتے پر سیاسی تاریکیوں کا راج چلا رہے تھے۔ آزادی کے باوجود بے روزگاری، تشدد اور غربت وخستہ حالی آزاد قوم کو ان لوگوں کا غلام بنائے ہوئے تھی۔ ظلم و جبریت کی چکی میں پسے انسان ایک سسکی کے مماثل قرار دیے گئے۔ اس ناول کی بدولت عصری زندگی کے پُر پیچ حقائق اور خاک میں لتھڑے ہوئے لوگوں کو مصنف نے اپنی عصری بصیرت سے سامنے لانے کی کوشش کی۔ یہ وہ دور تھا جب زر پرست طبقہ پورے معاشرے کو استحصالی قوتوں سے یرغمال بنا رہا تھا۔ "خدا کی بستی" کے بعد "جانگلوس" اور "چار دیواری" میں بھی ٹھوس حقائق کی سنگلاخ زمینوں پر نڈھال ہوتے ہوئے انسانوں کی تصاویر دکھائی دیتی ہیں۔ شوکت صدیقی کا ناول "جانگلوس" عورت اور مرد دونوں کے ایک دوسرے کے ہاتھوں استحصال کو بیان کرتا ہے۔ عورت مرد کے وعدوں کو سچ جان کر اپنا سب کچھ اس پر لٹا دیتی ہے۔ اپنا گھر بار، شوہر، بچے سب کچھ بالے کے نام پر قربان کر کے آنے والی شاداں جب حد سے زیادہ ظلم سہتی ہے تو ایک روز تنگ آ کر بالے کا گلا کاٹ کر اسے نذرِ گور کر دیتی ہے۔ بالا عورت کی کمائی پر پلنے والا مرد اس کی قربانی کی قیمت تو ادا نہ کر سکا البتہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس کے علاوہ ایک اور یہاں کردار لائق بیان ہے۔ رضا کاروں کے ہاتھوں بکنے والی سکینہ کی دردناک کہانی کا نمائندہ ناول ہے۔ وقت کی سوئی بھی کیسے گھومتی ہے کہ اپنے پرائے کا احساس تک باقی نہیں رہتا۔ گردش ایام تجھے کیا کہا جائے کہ مسیحا بن کر آنے والے لوٹ کر لے جاتے ہیں۔

جمیلہ ہاشمی کا ناول "تلاش بہاراں" معاشرتی سطح پر غیر مساوی اور مردانہ برتری کے نرغے میں پھنسے ہوئے مجبو و محکوم لوگوں کی کہانی ہے۔ اس ناول میں عورتوں کا استحصال بیان کیا گیا ہے جہاں وہ دکھوں کی دلدل میں دھنسی دکھائی گئی ہیں۔ بنیادی انسانی حقوق کے لیے ترستی ہیں۔ پرانے، ٹوٹے اور بکھرے ہوئے کھلونوں کی مانند دوسروں کی ٹھوکر پر رہتی ہیں۔ مرد عورت کو کھلونے کی طرح کھیل کر توڑ دیتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے ہاں عورت بادشاہِ وقت کے لیے سامان تعیش بنا کر پیش کی جاتی ہے۔ حکمران اپنی عیاشی میں عورت کا استحصال کرتے ہیں۔

اداس نسلیں، نادار لوگ، باگھ، قید جیسی عمدہ تحریروں کے خالق عبداللہ حسین نے استحصالی قوتوں کو آدم خوری قرار دیا۔ ان کے ناولوں میں تاریخ آدم کسی وحشی و جنگلی درندے کا خواب معلوم ہوتی ہے۔ آدم زاد ہی نے نسل آدم کو اداس کر رکھا ہے۔ بربریت کی انتہا دیکھیں کہ لوگ اپنی ناداری کی وجہ سے ناواقف ہیں۔ سحر کی منتظر زندگی میں رات اپنے اقتدار میں اضافہ ہی کرتی چلی جاتی ہے۔ عبداللہ حسین کے ہاں انسانی دنیا میں جتنی بھی اداسیاں، ناداریاں، پستیاں، تشنگیاں اور بنجر پن پایا جاتا ہے وہ سبھی اس کے ہم جنسوں کی بدولت ہے۔

عاصم بٹ، عبداللہ حسین کے ناول کی بابت لکھتے ہیں۔

> "جیسے علاقہ غیر ہوتا ہے جہاں حکومت کا قانون نہیں چلتا، وہاں کے لوگوں کے اپنے ہی بنائے ہوئے قانون چلتے ہیں، پاکستان بھی ایسا علاقہ معلوم ہوتا ہے جہاں استحصال کرنے والوں کے اپنے ذاتی قانون کی عمل داری ہے"۔[۱۷]

صنعتوں کے فروغ نے جہاں سرمایہ دار کی جیب بھاری کی وہیں مزدور کی زندگی بے برگ و بار کر دی۔ وہ زندگی کی جبلی راحتوں کو تلاش کرتا دکھائی دیا۔ مشینوں کی برتری نے احساس مروت کو کچل ڈالا۔ مزدور کی اجرت خون خشک ہونے کے بعد بھی ان کے وجود کی غذا نہ بن پائی۔

خدیجہ مستور اردو ناول کی تاریخ میں "آنگن" کے حوالے سے ایک بڑا نام ہیں۔ جو ناول کے ذریعے جبر و استبداد کی جکڑ بندیوں سے آزاد ریاست دیکھنے کی متمنیٰ ہیں۔ آنگن کے بعد "زمین" میں غریب قوموں کی نفسیات دکھانے کی کامیاب کوشش ملتی ہے۔ تیسری دنیا کے غریب ملکی باشندے نہ صرف معاشی لحاظ سے مفلوک الحال ہیں بلکہ اخلاقی سطح پر بھی دیوالیہ ہو چکے ہیں۔ لوٹ کھسوٹ کے دلدادہ لوگ کمزوروں کا استحصال کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ درج بالا ناول نگاروں کے علاوہ بانو قدسیہ، انیس ناگی، مستنصر حسین تارڑ، نثار عزیز بٹ، احسن فاروقی وغیرہ ایسے ناول نگار جو بیسویں صدی میں استحصال کی دنیا کو اپنے قلم کے ذریعے بیان کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کا ناول "سنگم" تاریخی ادوار میں سامنے آنے والے عفریت زدہ ماحول کو بیان کرتا ہے محمود غزنوی سے لے کر تقسیم برصغیر تک کم و بیش آٹھ نو صدیوں تک کے حالات کو رقم کر کے انسان کا تاریخی سطح پر استحصال دکھایا گیا ہے۔ تاریخی و تہذیبی عروج و زوال کی داستان میں کئی اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ ایک قوم کا زوال دوسری قوم کا عروج بنتا ہے۔ نئی نسل جب آبرو ریزی، لوٹ مار اور استحصال کا جامہ پہن کر انقلاب لانے کی سعئی کرتی ہے تو بربادی ان کا مقدر بنتی ہے۔ ناول سے اقتباس:

"محمد شاہ اور بھی رنگیلا ہو تا گیا۔ عورتیں، ناچ رنگ ہی میں محو رہتا، ہر عورت پر عاشق ہو جاتا، سونے کے ٹاپے بنوائے تھے۔ ان میں ننگی عورتیں بند ہوتیں، یہ ٹاپوں کے پاس جا کر ان پر جھاڑتا، بانگ لگاتا، ٹاپا اٹھا کر اندر ہو جاتا۔"(۱۸)

ڈاکٹر احسن فاروقی نے تاریخی کردار کے ذریعے استحصال کو جس طرح بیان کیا ہے اس کی دلدوز نگاہیں مسلمانوں کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ ایک لمحے کو پوری قوم بے بسی کی تصویر بنی ماضی کے دریچوں سے اپنے اسلاف کی قربانیوں کو دیکھتی رہ جاتی ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو برصغیر پاک وہند میں ناول کی ابتدا اصلاحی رجحان کے تحت ہوئی۔ ادیب عوام الناس کے لیے نبض شناس بنا اور استحصال کی ایک طویل تاریخ رقم کرنے لگا۔ بدلتے تقاضوں کے مطابق ادبا نے دکھتی رگ کی تکلیف محسوس کر کے قطرہ قطرہ آنکھ سے ٹپکتے لہو کو الفاظ کی صورت صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا۔ پریم چند جہاں غربا کے لیے مسیحا بن کر آئے وہیں دوسرے ناول نگاروں نے بھی ان کچلی اور دبی ہوئی سسکیوں کو قلم کے زور پر بیان کر کے استحصالی قوتوں کے چہروں کو بے نقاب کرنے کی سعئ کی۔ ترقی پسند تحریک کے داعی مارکسی نقطہ نظر کو آگے لے کر چلے اور سماج اور فرد کے باہم تعلق کو بیان کیا۔

حوالہ جات

۱۔ Mum Yard Lewis, "The city in History" New York, Harcourt, Brace of word, Inc,1961,p:15

۲۔ سبط حسن موسیٰ سے مارکس تک، نیشنل پبلشنگ ہاؤس راولپنڈی، ۱۹۷۶ء، ص:۱۷۷

۳۔ اردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز لاہور، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۸۴، ص:۷۶

۴۔ Standford Encyclopedia of Philosophy

۵۔ Exploitation-Definition in the study of sociology

https://www.thoughtco.com/exploitation-defination-3026317

۶۔ محمد تقی امینی، مولانا، زمینداری اور جاگیرداری کا تاریخی پس منظر، (مشمولہ) الاقتصاد، ششماہی، اشاعت:۲ کراچی، ستمبر ۲۰۱۱، ص:۲۵

۷۔ جلالپوری، علی عباس، عام فکری مغالطے، تخلیقات لاہور، ۱۹۹۹ء، ص:۲۹-۳۰

۸۔ مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۴، ص:۳۱۳، ۳۱۲

۹۔ ارتضیٰ کریم، اردو ادب میں احتجاج اور مزاحمت کے رویے، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۴، ص:۱۴

۱۰۔ روسو، ژاں ژاک روسو، معاہدہ عمرانی، مترجم: ڈاکٹر محمود حسین، ادارۂ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۷ء، ص:۵۷

۱۱۔ علی عباس جلال پوری, تاریخ کا نیا موڑ, تخلیقات لاہور، ۲۰۱۳ ص:۱۱۲

۱۲۔ ڈپٹی نذیر احمد، مراۃ العروس، یو پبلشرز لاہور، ۲۰۰۳، ص:۱۴

۱۳۔ ابو بکر عباد، اردو ناول: ابتدا سے ترقی پسند تحریک تک، (مشمولہ) سہ ماہی در بھنگہ ٹائمز بہار، اپریل تا جون ۲۰۱۶، ص:۶۷

۱۴۔ سید علی حیدر، ڈاکٹر، اردو ناول سمت و رفتار، شبستان لکھنؤ، ۱۹۷۹ء، ص:۱۷۸-۱۷۹

۱۵۔ محمد ذاکر، ڈاکٹر، آزادی کے بعد ہندوستان کا ادب، مکتبۂ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، ص:۶۹

۱۶۔ حیدر، قرۃ العین، میرے بھی صنم خانے، مکتبۂ جدید لاہور ۱۹۶۹ء، ص:۴۱۹

۱۷۔ عاصم بٹ، محمد عبد اللہ حسین، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات اسلام آباد، ص:۲۴

۱۸۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، سنگم، س۔ن، ص:۲۰

باب دوم:

پاکستانی اردو ناول میں معاشرتی و سیاسی استحصال کی پیشکش

الف۔ پاکستان کا معاشرتی و سیاسی منظر نامہ:

معاشرہ افراد کے ایسے گروہ کا نام ہے جو فطری ضروریات و احتیاجات اور مطالبات کی تکمیل کے لیے ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہوئے اکٹھا رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ایک معاشرہ کی تشکیل میں بنیادی طور پر دو عوامل کار فرما ہوتے ہیں:۔

ا۔ انسان تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ معاشرتی حیوان ہونے کی بنا پر گروہی زندگی کو انفرادیت پر ترجیح دیتا ہے۔

ب۔ انسان اپنے روزمرہ معاملات میں خود کفیل نہیں ہو پاتا۔ ہر فن مولا ہونے کے باوجود بھی کہیں نہ کہیں دوسرے انسانوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔

بقول ابن خلدون:

> "انسان کی فطرت میں اجتماعیت پنہاں ہے۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے اس کے حوائج و ضروریات کو ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ کر دیا ہے کہ یہ چاہے بھی تو دوسروں سے بے نیاز اور الگ تھلگ رہ کر زندگی نہیں بسر کر سکتا"۔ (۱)

لہذا کہا جا سکتا ہے کہ معاشرہ ایسے افراد کے مجموعے کا نام ہے جو اپنے مشترک مفادات کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ کسی معاشرے کے وجود میں آنے کے لیے ایک خاص مدت درکار ہوتی ہے۔ اس میں مختلف انواع و اقسام کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ انھی مختلف نوعیت کے لوگوں میں آپسی تعاون کی بنا پر معاشرے کے قیام کا دار و مدار ہوتا ہے۔ انسان کو ایک لقمہ تک حلق سے اتارنے کے لیے دوسروں کی مدد درکار رہتی ہے۔ اس کی جبلی ضروریات اسے دوسروں کا محتاج بنا دیتی ہیں۔ یہاں تک تو بات سمجھ آتی ہے کہ انسان قدم قدم پر دوسروں کی مدد کا طلبگار رہتا ہے۔ مگر انحصار کا یہ سلسلہ کب اور کیسے شروع ہوا؟ اس بات کا پتا لگانا ایک ضروری امر قرار پاتا ہے۔

کرہ ارض پر انسانی معاشرے کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود انسان کی۔ انسانی معاشرہ ارتقاء پذیر ہے چونکہ انسانی زندگی خود یکساں کبھی نہیں رہی۔ انسان جس طرح کائنات کی تسخیر کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا

گیا، ان دیکھی دنیا اس پر آشکار ہوتی گئی۔ اسی طرح اس کا تمدن بھی بدلتا رہا۔ ابتدائی ایام میں گروہی زندگی نے معاشرے کو جنم دیا۔

انسانی معاشرے کی ابتدا سے متعلق انیسویں صدی سے قبل تمام مورخین آگہی کا کل اثاثہ مذہبی کتب اور لوک کہانیوں سے حاصل کرتے تھے۔ مذہبی پیشوا جس قسم کی معلومات فراہم کرتے ان پر اکتفا کر لیا جاتا اور ان کی اس کاوش کو باقاعدہ سراہا بھی جاتا۔ کیونکہ انیسویں صدی سے قبل عہد قدیم سے متعلق تمام معلومات زمین کے سینے میں دفن تھیں اور ان دفن شدہ حقائق و معلومات کی تلاش نہایت دقیق تھی۔ مگر انیسویں صدی میں جب علوم کی کئی شاخیں متعارف ہوئیں تو زمینی حقائق سے متعلق آگاہی کی ضرورت بھی پیش آئی۔ ارتقائے انسانی کے متعدد نظریے قائم ہوئے۔ زمین کا سینہ چاک کر کے عہد قدیم سے متعلق معلومات اخذ کی گئیں۔ اس سلسلے میں سبط حسن لکھتے ہیں:

> "۱۸۹۱ء میں پروفیسر دُوبائے کو جاوا کے مقام میں قدیم انسان کی چار لاکھ برس پرانی کھوپڑی ہاتھ آئی۔۔۔ اس کے بعد ۱۹۰۷ء میں ہائیڈل برگ (جرمنی) کے مقام پر آدمی کا ایک جبڑا ملا جو پانچ لاکھ برس پرانا تھا۔ اور ۱۹۰۷ء میں پیکنگ (چین) کے ایک نواحی غار میں انسانوں کے ۴۵ ڈھانچے دستیاب ہوئے۔"(۲)

ماہرین کی دستیاب کردہ معلومات پر اکتفا کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی زمین پر کم و بیش پانچ لاکھ برس پرانی ہے۔ گذشتہ اوراق میں قائم کردہ سوال کا ایک پہلو پھر بھی تشنہ رہ جاتا ہے کہ آیا انسان ابتدا ہی سے معاشرت پسندی کی زندگی بسر کرنے پر قادر تھا؟ یا کہ آہستہ آہستہ اس کی جانب راغب ہوا؟ انسانی زندگی ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔ اس میں وقتاً فوقتاً تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ انسان پر کائنات کے راز جوں جوں آشکار ہوتے ہیں اسی طرح اس کا تمدن بھی تبدیلی کے مراحل سے گزرتا ہے۔ انسانی معاشرہ ارتقاء پذیر ہے۔ ابتدا میں انسان تنہا زندگی بسر کرتا تھا۔ مگر اس کی احتیاجات نے اسے معاشرت پسندی کی جانب راغب کیا۔

انسانی تہذیب و معاشرت کوئی جامد شے نہیں ہے۔ اس میں وقت کے ساتھ ساتھ تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی مختلف مدارج طے کر کے یہاں تک پہنچی ہے۔ اس سلسلے میں سبط حسن انسانی تہذیب کے تین ادوار بتاتے ہیں:۔

"۔ پتھر کا زمانہ جبکہ آلات و اوزار پتھر، لکڑی، ہڈی کے ہوتے تھے۔

۔دھات کا زمانہ جبکہ آلات واوزار کانسے کے ہوتے تھے۔

۔لوہے کا زمانہ جو ایک ہزار قبل مسیح کے قریب شروع ہوا اور ہنوز جاری ہے"۔[۳]

انسانی معاشرتی زندگی کا پتھر سے شروع ہونے والا ابتدائی سفر آج اسے ہر شے پر دسترس دلائے ہوئے ہے۔دو پتھروں کی رگڑ سے روشنی کرنے والا انسان آج ترقی کے بیش بہا زینے طے کر چکا ہے۔پیش نظر باب میں پاکستان کے معاشرتی منظر نامہ کا بیان مقصود ہے۔اس لیے طوالت سے دامن بچاتے ہوئے پاکستان کی جغرافیائی و ثقافتی اور تاریخی حدود سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے کیونکہ معاشرتی و عمرانیاتی منظر نامے سے آگاہی تبھی ممکن ہے جبکہ جغرافیائی و تاریخی معاملات سے واقفیت حاصل ہو جائے گی۔

دنیاوی خطوں کی جداگانہ جغرافیائی حدود کی بنا پر ہر خطے کی اپنی تہذیب و معاشرت ہوتی ہے جو مسلسل ارتقاء پذیر رہتی ہے۔برعظیم ایک ایسا خطہ ہے جس میں انواع واقسام کی اقوام آباد رہیں۔جن کی بنا پر ان کے عقائد و نظریات، رسوم و روایات، فنون لطیفہ اور مذہب وغیرہ کا دائرہ کار بھی مختلف دکھائی دیتا ہے۔مختلف ارتقائی معاشروں کی طرح اس کے بارے میں بھی یہ تصور عام پایا جاتا ہے کی شاید یہاں کا تمدن بھی باقی تمام تمدنوں کی طرح ایک آب و ہوا کی بدولت ایک سا ہو گا۔مگر یہ تصور اس وقت غلط ثابت ہو جاتا ہے جب اس کی تاریخ کے بارے میں پڑھا جاتا ہے۔

برصغیر کی سرزمین پر انسانی آبادی کے آثار قدیم حجری دور کے کم و بیش چار لاکھ برس پرانے ہیں۔پاکستان نئی سرحدوں کے ساتھ ایک نہایت قدیم ملک ہے۔کرہء ارضی کے اولین انسانوں کی آماجگاہ شاید یہ کبھی سرزمین رہی۔کیونکہ جدید عہد میں جن علاقوں سے آثار قدیمہ دستیاب ہوئے ہیں ان کی جغرافیائی حدود وادی سون، کوہستان، آزاد کشمیر اور بلوچستان کے علاقے ہیں۔تمام تحقیقات سے جو نتائج اخذ ہوئے ہیں ان کے مطابق "حوانیت نامہ" کے اولین انسان کا تعلق سرزمین پاکستان ہی سے تھا۔وادی سندھ کی تہذیب تقریباً پانچ ہزار سال پرانی ہے اور ترقی یافتہ تمدنوں میں وادی نیل، وادی فرات اور وادی ہوانگ ہو (چین) سے کہیں قدیم اور وسیع ہے۔

> "قدیم مذہبی کتب سے جو قیاس آرائیاں سامنے آئیں ان کے مطابق سب سے پہلا بڑا شہر ہندوستان ہے۔ہندوستان میں فی الحقیقت پاکستان میں ایک بڑے پیمانے پر غذائی پیداوار دریائے سندھ کی وادی یعنی "مغربی پنجاب اور سندھ میں ممکن ہوئی۔یہ زمانہ تین ہزار سات

سو پچاس ق۔م کا ہے۔"(۴)

تحقیق کے بعد اس بات سے آگہی ملتی ہے کہ سندھ کی تہذیب باقاعدہ شہری منصوبہ بندی لیے ہوئے تھی۔ ان علاقوں کا انتظام و انصرام چلانے کے لیے باقاعدہ ادارے بنائے گئے تھے۔ اور ضروریات سے زائد اشیا کی پیداوار بھی ہوتی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یقیناً ان کے تجارتی تعلقات دوسرے علاقوں کے ساتھ بھی ہوں گے۔ کیونکہ ضرورت سے زیادہ اشیاء کی پیداوار تبھی ممکن ہوتی ہے جب دوسرے علاقوں میں غذائی قلت ہو یا وہاں زمین کی زرخیزی نہ ہو۔ ان سب مسائل کے علاوہ جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ ان سب علاقوں کا اختتام ناگہانی ہوا۔ موہنجو داڑو میں آگ لگا کر لوگوں کا قتل عام کیا گیا۔ جبکہ ہڑپہ شہر کا اختتام بھی تشدد کے ہاتھوں ہوا۔

موہنجو داڑو اور ہڑپہ کے علاوہ تقریباً چالیس ایسے مقامات اور ہیں جہاں سے وادی سندھ کی تہذیب کے آثار ملے ہیں۔ ان تمام آثار کے مطابق یہ دراوڑی تہذیب، زراعت، گلہ بانی، ظروف سازی جیسے شعبہ ہائے زندگی میں خاصی ترقی یافتہ تھی۔ اس کا رقبہ کم و بیش پانچ لاکھ مربع میل تک ناپا گیا ہے۔ دھاتوں کا استعمال عام تھا۔ پہیہ کی ایجاد، نقش و نگار اور مصوری طرز کی تحریریں رواج پا چکی تھیں۔ یہاں کی دراوڑ قوم کے تجارتی و سفارتی تعلقات، ایران، عراق، مصر، انڈونیشیا، تھائی لینڈ، ملائشیا اور ویت نام کے علاقوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ گویا دراوڑ باقاعدہ ایک معاشرتی زندگی کا آغاز کر چکے تھے۔

اسی دوران روس سے آریا آئے۔ انھوں نے دراوڑوں کی تمدنی زندگی کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔ ان میں ساکن زندگی کا کوئی رواج نہ تھا۔ یہ بدوی زندگی گزارنے والے لوگ پدرسری نظام (Patriarchal) رکھتے تھے۔ آریائی نسل روحانی و مذہبی لحاظ سے دراوڑ قوم سے خاصے ترقی یافتہ تھے۔ دنیا کی اولین مذہبی کتاب "رگ وید" مانی جاتی ہے۔ یہ آریائی ثقافت کی رزمیہ شاعری کو بیان کرتی ہے۔ پہلے پہل چونکہ لکھنے کا رواج نہ تھا اس لیے سینہ بہ سینہ چلتی رہی۔ بہت بعد البتہ تحریری صورت میں لائی گئی۔

> "ہندوستان میں کسی بھی اہمیت کے اولین شہر پہلے دو ہزار سال قبل مسیح کے دوران نمودار ہوئے۔۔۔ یہ شہر چوپان خانہ بدوشوں یعنی آریوں کے اسلاف نے بنائے تھے۔ جو کانسی کے زمانے کے حملہ آور قبائیلوں کی حیثیت سے شمال مغرب کی جانب سے ہندوستان میں داخل ہوئے۔"(۵)

ذات پات کا نظام بھی آریاؤں ہی کا پیدا کردہ ہے۔ اسی ذات پات کے نظام کی بدولت خود کو برہمن اور مقامی دراوڑوں کو حقیر اور خدمت گار کا رتبہ دیا۔ دراوڑ آریائی نسلی خون کی مناسبت سے دو اور ذاتیں ، کھشتری اور ویش سامنے آئیں۔ ذات پات کے اس نظام نے نوع انسانی میں تفرقات کو فروغ دیا۔ جس سے معاشرے میں استحصال کی قدر میں اضافہ دیکھا جاسکتا ہے۔ کم و بیش ڈھائی تین ہزار سال گزر جانے کے بعد بھی اس نظام کے اثرات برصغیر میں موجود ہیں۔ قدیم ہندوستانی سماج میں لکھت پڑھت کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ زبانی معاہدوں کا باقاعدہ طور احترام کیا جاتا تھا۔ آریائی قبائل کا ڈھانچہ مرد کی حاکمیت پر قائم تھا۔ کیونکہ مرد ہی قبیلہ کا سردار تھا۔اسی طور ہندوستان میں زیادہ تر دور مردانہ حاکمیت کا سامنے آتا ہے۔ بدھ مذہب بھی آریاؤں کی نسلی درجہ بندی کے خلاف بغاوت کی شکل میں نمودار ہوا۔ پاکستانی باشندے آریائی نسل ہیں لیکن مشرق میں بھارت سے بنگال کی جانب سفر کیا جائے تو آریائی نسلی اوصاف معدوم اور دراوڑی زیادہ نمایاں ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

برصغیر حملہ آوروں کی آماجگاہ رہا ہے۔ آریاؤں کے بعد تقریباً چھٹی صدی قبل مسیح میں ایران سے آتش پرست پارچی اور ۳۲۷ق۔م میں یونانی سکندر اعظم کی سرکردگی میں برصغیر میں داخل ہوئے۔ مگر تعداد میں قلیل ہونے کی بنا پر آریاؤں میں مدغم ہوگئے۔ مدغم ہونے کے باوجود یونانیوں کے دو اوصاف:

۔ مجسمہ سازی

۔ علم نجوم

کو یہاں پنپنے کا بہتر موقع ملا۔

۷۱۱ء میں سندھ کے راجا کی ناعاقبت اندیشی کی بدولت عرب مسلمان دیبل کے راستے سندھ میں داخل ہوئے۔ ملتان تک پہنچے مگر باقاعدہ سلطنت قائم نہ کی۔ البتہ قافلوں کے ساتھ آنے والے صوفیا کرام، عالم دین یہیں آباد ہوگئے۔ مستقل رہائش اختیار کرنے سے یہاں کی مقامی خواتین سے شادیاں کیں۔ آپس کے میل جول سے ہندو مسلم معاشرتی نظام رواج پایا۔ متعدد اسلامی معمولات، اقدار و عقائد مقامی ہندوؤں نے اپنا لیے۔ البتہ ذات پات کے نظام میں تھوڑی نرمی برتی گئی۔ عام انسان کو اسلامی اصولوں کی طرز پر اہمیت دی جانے لگی۔

لاہور کے راجا جے پال نے جب اپنی فوج کے ساتھ چڑھائی کی تو اس کے نتیجے میں سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے اور متعدد بت خانے تباہ کیے۔ اس دور میں بت خانے مذہبی رسوم کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ دفاعی، معاشرتی، ثقافتی اور سیاسی مراکز مانے جاتے تھے۔ راجہ جے پال کی سرکوبی کے بعد محمود غزنوی لوٹ گیا مگر عرب مسلمانوں کے ساتھ ساتھ افغان مسلمانوں کی آمد و رفت بھی اب برصغیر میں شروع ہو گئی۔

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت کا آغاز ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک کے ہاتھوں ہوا۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً خلجی، تغلق، لودھی اور مغلیہ خاندان نے ہندوستان پر حکومت کی۔ ۱۵۲۶ء میں مغلیہ خاندان کے پہلے فرمانروا ظہیر الدین بابر کے ہاتھوں ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی ابتدا ہوئی۔ مغلیہ عہد حکومت کو برصغیر پاک و ہند کے لیے معاشرتی، معاشی، ثقافتی، سیاسی غرض ہر لحاظ سے ترقی کا سنہری دور کہا جا سکتا ہے۔

عہد مغلیہ میں سرکاری مدارس کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اکبر بادشاہ نے اپنے دور میں ہندو شہزادیوں سے شادیاں کر کے ہندو مسلم معاشرتی بُعد کو ختم کرنے کی سعیٔ کی۔ مغلیہ دور میں علما و مشائخ کو بڑا رتبہ دیا جاتا تھا۔ حضرت داتا گنج بخش، بابا فرید الدین گنج شکر اور حضرت مجدد الف ثانی جیسے صوفیائے کرام اس دور میں خاص مقام کی حامل شخصیات تھیں۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کو زوال آنا شروع ہو گیا۔ اسی دوران یورپ سے برصغیر پاک و ہند کے مابین بحری راستے کا آغاز ہوا تو تجارت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تجارت کی غرض سے آنے والی یہ قوم مقامی باشندوں اور امرا کے آپس میں ناقص تعلقات سے استفادہ کرتے ہوئے یہاں براجمان ہو گئی۔

برطانوی عہد حکومت برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا تاریک ترین دور مانا جاتا ہے کیونکہ انگریز سامراج نے یہاں معاشی، معاشرتی ثقافتی غرض ہر طرح کی ترقی پر گویا پہرے لگا دیے۔ سامراجی حکومت نے احساس برتری (Status Complex) جیسے رویے کو معاشرہ میں عام کیا۔ جس سے ذات پات کے نظام کو مزید تقویت ملی۔ معاشرہ کئی اونچی نیچی ذاتوں، طبقات، نسلوں اور گروہوں میں بٹ گیا۔ سامراجی حکومت (Divide & Rule) کے ماٹو کو لیے ہوئے تھی۔ 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کا اصول اپناتے ہوئے انھوں نے مقامی لوگوں کا ہر سطح پر استحصال کیا۔ یہاں تک کہ عوام احساس کمتری میں مبتلا ہونا شروع ہو گئی۔ اگرچہ

استحصال جیسی اذیت انگریزوں کی دین ہے وہیں جدتیں بھی سامنے آتی ہیں مگر ان جدتوں کے مثبت پہلوؤں کے ساتھ ہی منفی پہلو بھی دکھائی دیتے ہیں۔ کیونکہ جدید ٹیکنالوجی کا برصغیر پاک وہند میں متعارف ہونا تجارتی سطح پر معاونت کا باعث تھی۔ اگر دیکھا جائے تو عالمگیر جنگوں کا ظہور برصغیر کے انہی وسائل ہی کی بدولت تھا۔

پاکستانی معاشرت پر قدیم دراوڑ قوم کے اثرات ہیں۔ کیونکہ اس نقطے کو قبل از واضح کیا جا چکا ہے کہ قدیم انسان تاریخ کے لحاظ سے برصغیر پاک وہند کی سرزمین پر ہی ظہور پذیر ہوا۔ اس طویل مدت میں مختلف ادوار گزرے جن میں پتھر، کانسی اور لوہا وغیرہ اور انہی ادوار میں کئی اقوام نے اپنی معاشرت کے اثرات اس سرزمین کے باشندوں پر چھوڑے۔ ان میں آریہ، ایرانی، یونانی، عرب، ترک، افغان، مغل اور انگریز وغیرہ خاص قابل ذکر ہیں۔ کئی علاقے آج بھی ایسے ہیں جو قدیم معاشرت کی عکاسی کرتے ہیں۔ اہل پاکستان کے معاشرتی منظر نامے میں برصغیر پاک وہند میں آنے والی تمام اقوام کے معاشرتی آثار دکھائی دیتے ہیں۔ کیونکہ معاشرت کی تنظیم نو میں مذہب کو بڑا دخل رہا ہے۔

برصغیر پاک وہند میں غدر کے بعد کا دور تاریخ میں منتشر حالات سامنے لاتا ہے اس دور میں پورا مسلم معاشرہ جہالت کی آماجگاہ بنا دکھائی دیتا ہے۔ انیسویں صدی میں سیاسی انتشار نے کئی سطحوں پر مسائل کو جنم دیا۔ لسانی، مذہبی اور ذات پات کے نظام نے انسانی استحصال کی مقدار کو مزید بڑھنے میں مدد دی۔ اردو ہندی تنازع اگرچہ تقسیم کے بعد کسی حد تک حل ہو گیا مگر ایک خاص سطح پر آج بھی اختلافات کی تپش محسوس کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح ذات پات کے نظام اور مذہبی سطح پر کسی ایک طبقہ کا بڑا اور عظیم ہونا اور باقی لوگوں کو کمتر تصور کرنا بھی ظلم و استحصال کی قدر کو بڑھاتے دکھائی دیتے ہیں۔ انیسویں صدی ہی کے اواخر میں توہم پرستی اور ہندووانہ رسم ورواج ایسی بنیادی چیزیں تھیں جن سے معاشرے میں انسان کی حیثیت مزید کم ہو گئی۔

عالمی ادب میں رونما ہونے والی تحریکوں اور رجحانات کے اثرات دنیا کے دیگر زبان و ادب کی طرح اردو پر بھی پڑے۔ دیگر اصناف سخن کی طرح اردو ناول نے بھی مغربی اثرات کو قبول کیا۔ یہاں ایک بات کو واضح کرنا ضروری ہے کہ اگرچہ اردو ادب میں ناول انگریزی ادب کے زیر اثر آیا مگر محض تقلید کی بجائے ناول اپنے ماحول و معاشرت کے مطابق لکھے گئے۔ اردو ناول میں انسانی جذبات و احساسات، مرد و عورت کے مسائل، انسان پر ڈھائے جانے والے مظالم، استحصال، جبر و تشدد، بد سلوکی اور برے رویوں کی بھرپور عکاسی کی گئی۔ نہ صرف عکاسی کی گئی بلکہ ان محرکات کی نشاندہی بھی کی جو اس استبداد کا باعث بنے۔

ب۔ اردو ناول میں معاشرتی و سیاسی استحصال کی مختلف صورتیں:

معاشرتی استحصال (exploitation) سے مراد وہ عمل ہے جس میں کسی فرد، گروہ یا طبقے کو غیر منصفانہ طور پر فائدہ اٹھا کر نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں، جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

معاشرتی طبقاتی استحصال:(Class Exploitation)

- امیر کا غریب طبقے پر استحصال، جہاں غریبوں کو بنیادی وسائل اور مواقع سے محروم رکھا جاتا ہے۔
- طبقاتی فرق کے باعث غریب افراد کو تعلیم، صحت اور دیگر بنیادی سہولیات سے دور رکھنا۔
- غریب اور پسماندہ طبقوں کو قرضوں میں جکڑ کر ان سے سود کی صورت میں فائدہ اٹھانا۔
- ملازمین کو حقوق کے بغیر، نامناسب ماحول میں کام کرنے پر مجبور کرنا۔

جنس کی بنیاد پر استحصال:(Gender Exploitation)

- عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں کم مواقع اور کم اجرت دینا۔
- کام کی جگہ یا معاشرے میں خواتین کو جنسی طور پر ہراساں کرنا۔ خواتین کو حیثیت کے لحاظ سے کم تر سمجھنا۔
- پدرشاہی نظام میں عورتوں کو گھریلو اور معاشرتی ذمہ داریوں میں الجھا کر ان کی صلاحیتوں کو محدود کرنا۔

نسلی استحصال:(Racial Exploitation)

- ایک نسل کو دوسری نسل پر برتر سمجھ کر ان کے ساتھ امتیازی سلوک اختیار کرنا۔
- رنگ، نسل یا قومیت کی بنیاد پر ملازمت یا تعلیم میں مواقع محدود کرنا۔
- نسلی اقلیتوں کو حقوق سے محروم رکھنا اور ان کے وسائل پر قابض ہونا۔

سیاسی استحصال:(Political Exploitation)

- حکومتی یا سیاسی طاقت کا ناجائز استعمال کر کے عوام کے حقوق چھیننا۔
- سیاسی مخالفین کو ظلم و جبر کا نشانہ بنانا، انھیں قید یا ہراساں کرنا۔
- ووٹروں کے جذبات یا معلومات کی کمی کا فائدہ اٹھا کر انہیں غلط فیصلے کرنے پر مجبور کرنا۔

تعلیمی استحصال:(Educational Exploitation)

- تعلیمی مواقع میں عدم مساوات کی بدولت پسماندہ طبقے کے افراد کو مناسب تعلیم تک رسائی نہیں ملتی۔
- مہنگی تعلیم کے ذریعے مخصوص طبقے کو علم تک رسائی سے دور رکھنا۔

مذہبی استحصال:(Religious Exploitation)

- مذہبی عقائد کو استعمال کرتے ہوئے لوگوں کے جذبات کا استحصال کرنا۔
- مذہبی اقلیتوں کے حقوق پامال کرنا، انھیں معاشرتی امتیاز کا شکار بنانا۔
- مذہب کے نام پر مالی استحصال اور غلط فہمیاں پھیلانا۔

سماجی استحصال کی یہ مختلف صورتیں اکثر ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہیں اور معاشرتی سطح پر بڑے بگاڑ کا باعث بنتی ہیں۔

کسی بھی معاشرے کی تاریخ محض واقعات سے عبارت نہیں ہوتی۔ اس میں ملکی سطح پر سماجی و سیاسی تبدیلیوں کی بدولت آنے والے انقلابات کو اپنے اندر سمو لینے کی گنجائش ہر دور میں پائی جاتی رہی ہے۔ ایک زندہ معاشرہ زندہ حقائق کا ترجمان ہوا کرتا ہے۔ اور ادب سے بہتر حقائق کی ترجمانی کسی صورت ممکن نہیں۔ یہاں ایک بات قابل توجہ ہے کہ ادب میں سماجی تبدیلیوں کا فوری اظہار کہیں نہیں ملتا۔ معاشرتی سطح پر سامنے آنے والے انقلابات و رجحانات کو اپنے اندر سمو لینے کے بعد ادب میں اس کا اظہار ہوتا ہے۔ یعنی ایک خاص مدت تک حالات کا جائزہ لینے کے بعد ادب میں اس کی ترجمانی کی جاتی ہے۔

بر صغیر پاک و ہند میں انیسویں صدی کے اواخر میں معاشرتی سطح پر حالات بڑی تیزی سے بدلتے دکھائی دیتے ہیں۔ پورا معاشرہ جاگیر داری نظام کے شکنجے سے نکل کر سرمایہ داری نظام میں ضم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ جس سے انسانی زندگی ایک دائرے میں گھومنے لگی۔ غربت کی عفریت نے اپنا گھیرا مزید بڑھا دیا۔ جس سے معاشرتی سطح پر جہاں انسانی مادی حالات بدلے وہیں اس نظام کی خرابیوں سے معاشرے میں پیدا ہونے والا بگاڑ بھی دکھائی دیا۔ انسانی استحصال ایک نئی اور جدید صورت میں سامنے آیا۔

تحریک علی گڑھ کے تحت لکھے جانے والے ادب میں جن موضوعات کو پرکھا گیا ان میں اصلاحی، سماجی و اخلاقی نوعیت کے موضوعات شامل تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد اس تحریک کے اہم رکن ثابت ہوئے۔ اور

مراۃ العروس، بنات النعش اور توبتہ النصوح جیسے ناول لکھ کر معاشرے کے اذہان و قلوب کو جاہلانہ توہمات سے پاک کر کے راہ راست پر لانے کی بھرپور کوشش کی۔ پردے کی سخت پابندی پر زور دیا۔ برصغیر میں اردو ناول کی تاریخ میں ڈپٹی نذیر احمد کا نام سب سے پہلے لیا جاتا ہے۔ انھوں نے اصلاحی طرز کے ناول لکھے اور اسم با مسمی کردار تخلیق کیے۔ اس لیے ان ناولوں کا کرداری سطح پر جائزہ لیا جائے تو نام ہی پہچان کا موجب بنتا ہے۔ استحصال کے حوالے سے نذیر احمد ہمیں گھریلو زندگی سے متعلق مواد فراہم کرتے ہیں۔ ان کے برعکس مرزا ہادی رسوا کا ناول "امراؤ جان ادا" معاشرتی سطح پر استحصال کی ایک طویل داستان لیے ہوئے ہے۔

رسم و رواج کسی بھی معاشرے کا لازم جزو رہے ہیں۔ مرد و زن دونوں ہی ان کی ابتدا میں شانہ بشانہ چلے تھے مگر اپنے سانس اور خون سے اگر کسی نے ان کی آبیاری کی تو وہ صرف عورت تھی۔ عورت ہی رسم و رواج کی پاسدار و امین رہی۔ شوہر کے مر جانے پر اگر "ستی" کی رسم نبھاتے ہوئے نذر آتش ہوئی تو وہ عورت تھی۔ نثار عزیز بٹ کا ناول "کاروانِ وجود" قبائلی معاشرہ میں عورت کے ساتھ برتے جانے والے ناروا سلوک کی داستان ہے۔ "دریا کے سنگ" نثار عزیز بٹ ہی کا ایسا ناول ہے جس میں مہذب اقوام عورت کے حقوق کی صدا بلند تو کرتی ہیں مگر صدا ہی بلند ہوتی ہے کیونکہ حقوق کی صدا میں درحقیقت استحصال کی دردناک چیخیں سنائی دیتی ہیں۔

بیسویں صدی کی آخری دہائی میں بلقیس ریاض کا ناول "بادبان" ازدواجی زندگی کے مسائل بیان کرتا ہے۔ میاں بیوی ایک ہی ناؤ کے مسافر ہوتے ہیں۔ زندگی کے تمام نشیب و فراز دونوں کو مل کر سہنا ہوتے ہیں۔ مگر ہمارے مشرقی معاشرے میں مصائب و الم کے سبھی بوجھ عورت کی جھولی میں ڈال کر مرد بے فکری کی چادر کندھوں پر سجائے مردانگی کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ اگر کہیں سمجھوتہ کرنا پڑے گا تو عورت خود ہی کر لے گی۔ اسے بتانے کی ضرورت ہرگز نہیں۔ اور بے بس و مجبور عورت اپنی بے بسی پر محض آزادی کو سوچ سکتی ہے۔ قید و بند کی زندگی سے فرار کی کوئی صورت نکلتی ہے تو وہ محض سمجھوتہ، پھڑ پھڑا کر پھر اسی پنجرے میں آ گرتی ہے، جہاں قید تھی۔ "دل کی چوکھٹ پر" سلمیٰ کنول کا ناول وراثت میں دیے جانے والے حصے کے حوالے سے سامنے آتا ہے۔ پڑھے لکھے معاشرے میں جبکہ فطرت کے قانون کو باریک بینی سے سمجھنے والوں کی قلت نہیں وہاں عورت کو آٹھواں حصہ بھی نہیں دیا جاتا۔ جو کہ خدا کی جانب سے اس کے لیے مختص کر دیا گیا ہے۔ خود ساختہ قانون وراثت کے گرد گھومتی ایسی کہانی ہے جہاں قوانین فطرت اپنی مرضی و منشا سے بدل لیے جاتے ہیں۔ ناول سے اقتباس:

یہ دیکھو وراثت کے قوانین۔ باپ کے ترکے میں بیٹا بیٹی دونوں حقدار ہیں۔۔۔ یہ قرآن کی رو سے ہے اور ہمارے قبیلے میں پتا نہیں کب سے، کئی نسلوں سے یہ رائج ہے کہ باپ کے ترکے میں سے بیٹی کو کچھ نہیں دیا جاتا"۔(۶)

جنگ اور قتل و غارت کی دنیا سے ذرا باہر قدم رکھا جائے تو رشتوں کے حوالے سے انسان کا استحصال ازل سے چلا آرہا ہے۔ گھریلو تشدد، ساس بہو کے جھگڑے یہ قریباً ہر انسان کے حصے میں آتے ہیں۔

i. :ذات پات کا نظام اور انسانی استحصال:

ذات پات کے نظام نے انسان کا جس قدر استحصال کیا اور کر رہا ہے اس کی تاریخ بڑی طویل اور الم ناک ہے۔ غریب انسان کی خود داری اور محنت کبھی گنتی میں شمار نہیں کی جاتی۔ اس کی ذات کی نفی اس لیے کی جاتی ہے کیونکہ وہ کمی ہے۔ انسانی معاشرہ ذات پات کے خود ساختہ نظام میں کسی چھوٹی ذات سے تعلق رکھنے والے شخص کو انسان کے درجے پر لا کر پرکھنا ہی نہیں چاہتا۔ گویا جیسے جینے کا حق تو محض امرا اور رؤسا کو ہی ہو۔

قانون انسانی میں چھوٹی ذات کے لوگوں کی مثال ان بے بس و لاچار پرندوں کی سی ہوتی ہے جو تنکا تنکا اکٹھا کر کے اپنے گھونسلے بناتے ہیں اور لمحہ بھر میں گھونسلے نما گر ہستی کو اجاڑ دیا جاتا ہے۔ اس اجاڑ میں تنکے تک کو خبر نہیں ہو پاتی کہ اس کا ساتھی کہاں اُڑا، کہاں آکر کچلا گیا۔ کمی کمین بھی مہذب معاشرے میں وڈیروں کے ہاتھوں اسی طرح رسوائی کے چنگل میں پھنس کر اپنی گر ہستی اجاڑ بیٹھتا ہے۔ اس کے باپ دادا کا آبائی وطن اس کا کل جہاں، ایک چھوٹی سی مگر مکمل دنیا، جسے سفاک اور نام نہاد مکروہ چہرے نذر آتش کر دیتے ہیں۔

ناول "گرد باد" موضوعاتی سطح پر انسانی استحصال کا عکس پیش / کی غمازی کرتا ہے۔ معاشرتی حیثیت سے موج دین عرف موجو کی ذات ہی اس کے بھرپور استحصال کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ذات پات کے نظام نے روز اول ہی سے انسان کی اصل حیثیت اس سے چھین لی تھی۔ کیونکہ پیدا تو وہ انسان ہوا تھا اور ہر انسان کا بچہ پاکیزہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ مگر انسانی معاشرہ خدا کی فطرت پر پیدا ہونے والے انسان کے بچے کی پہچان معاشی و معاشرتی حیثیت سے کراتا ہے۔ اس کی مہارت، ذہانت و ایمانداری کوئی معنی، کوئی قدر نہیں رکھتی۔ موجو اپنے فن کی مہارت میں اس قدر آگے جا چکا تھا کہ اس کے بارے میں یہ کہا جاتا کہ "موجو جوتا بناتا نہیں بلکہ تخلیق کرتا ہے"۔

تخلیق کرتا ہے یا بناتا ہے، وہ کس قدر کارآمد ہے یا ناکارہ۔ اس سب کا پتہ اس وقت چلا جب اس کی محنت و محبت کو پس پشت ڈال کر اسے علاقہ بدر کر دیا گیا۔ موجو غربت کے باوجود خود دار فنکار کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اس کی اسی خود داری کی بدولت اپنی برادری کے لوگ بھی اسے ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کم ذات کا خود دار ہونا بھی ایک سوالیہ نشان بن جاتا ہے خود داری کہاں ذلیل کراتی ہے؟ یہ تو سر اونچا کر کے معاشرے میں چلنا سیکھاتی ہے۔ مگر ذات کا کمی ہو اور جوتے کھا کر کام کروانے کا شوقین نہ ہو بڑی مبالغہ آمیز سی صورتحال بن کر سامنے آتی ہے۔ شاید موجو موچی کی اس خودداری نے آج اسے اس مقام پر لا کھڑا کیا کہ جو نہیں کرنا چاہتا تھا وہ بھی کرنا پڑا۔ ذمہ داری زبردستی اس پر تھوپ دی گئی۔ ایک ایسا احسان جو وہ کبھی لینا ہی نہ چاہتا تھا۔ اس کا بوجھ اس پر ڈال دیا گیا۔ موجو اپنی تنہا زندگی میں مگن اپنے کام سے کام رکھتا اور بیٹے کے لیے جیتا ہے۔ اسی دوران قسمت کی دیوی نجانے اس پر مہربان تھی یا ستاروں کی گردش کہا جائے اسے برستی رات میں چوہدری کے بلاوے پر حویلی کا رخ کرنا پڑا۔

غریب شاید پیدا ہی بدنصیب ہوتا ہے اور یہ بدنصیبی کے بادل کبھی نہیں چھٹتے۔ جب چاہا اڈے اور غریب کا سب کچھ اپنی تیز و تند روش میں بہا لے گئے۔ موج دین عرف موجو برسوں بنا کسی رشتے کے زندگی گزار رہا تھا۔ یک لخت ہی بدنصیبی کے بادل پوری طرح اس پر چھا گئے۔ کہ شمو اس کی زندگی میں شامل ہو گئی۔ قانون فطرت کہیں یا قانون انسان غریب کے استحصال کی ہزار ہا تدابیر نکالی جاتی ہیں۔ وہ جس بل سے منہ نکال کر باہر جھانکنے کی کوشش کرتا ہے وہیں مٹی ڈال کر اس کا استحصال جاری رکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس مقام کو پہنچ جاتا ہے کہ مرنا چاہے تو مر بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ جینے کی اجازت حالات دیتے کب ہیں۔ اقتباس:

> "وہ۔۔۔ ایک ہلاک شدہ وجود تھا۔ وہ بھی بھوسے کی مانند کھایا ہوا اور انگ انگ سے دکھا ہوا تھا۔ اسے اصولاً اس وقت بستر میں یا اگر بستر میں نہیں تو کسی مہربان قبر کی گہرائیوں میں پر سکون نیند میں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن سفر کے صبر میں اس کا پامال وجود بھی جگراتے کی مار سہنے پر مجبور تھا"۔ (۷)

غربت کے بادل جس گھر پر مہربان ہو جائیں وہاں بد حالی کا دور دورہ ہو تا ہے۔ وہاں کوئی سبزہ نہیں اُگا کر تا۔ بلکہ مزید خشک سالی رہ جاتی ہے۔ کیونکہ برسنے والی بارش پانی نہیں لاتی بلکہ آگ برساتی ہے جس کی ہر ایک چنگاری جہاں گرتی ہے وہیں سب کچھ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔

ذات کا کمی ہونا اس معاشرے کی دین ہے۔ کیونکہ انسان پیدائش کے وقت تو خدا کی فطرت لے کر آتا ہے۔ مگر کم ذات کے گھر پیدا ہونے والا اس معاشرے کے سامنے شاید فطرت خداوندی بہت کم اور اپنی پشتوں کی بد بختی زیادہ ساتھ لاتا ہے۔ موج دین عرف موجو چونکہ ذات کے لحاظ سے کم تر تھا اس لیے اس پر لازم تھا کہ وہ چوہدری کا تھوکا ہوا اپنی زبان سے چاٹتا۔ غریب بھی ہو اور کم ذات بھی تو کوئی راہ بچ نکلنے کی سوجھتی نہیں۔ اس لیے چوہدری کا تھوکا چاٹنے پر موج دین آمادہ ہوا مگر شمو کے ساتھ نکاح کر لینے کے بعد اسے کسی قسم کا سکون نصیب نہ ہو سکا، وہ عورت جسے اس نے قربانی دے کر اپنا نام دیا تھا اس نے بھی دھتکار دیا۔ وہ مزید ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں خود کو اس وقت گرتا محسوس کرتا ہے، جب چودھری صاحب شمو کو "سوانی" کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں۔ ذات پات کا نظام بذات خود ایک لفظ ہی ایسا ہے جسے اپنانے کے ساتھ ہی کسی بھی معاشرے میں استحصال کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جو بس چلتا رہتا ہے نہ ذرا دیر کو تھمتا ہے اور نہ ہی ختم ہوتا ہے۔

اگرچہ چھوٹی ذات تھی مگر ساری عمر خود داری میں بسر کی۔ موج دین کی بیوی کی فکر ملک صاحب کریں اور وہ بھی اس انداز میں کہ اسے اتراتے ہوئے اپنی "سوانی" کہہ کر مخاطب کیا جائے۔ موجو کی غیرت کو یہ بات گوارا نہ تھی۔ کئی بار جی میں آیا کہ ملک کو جان سے مار کر قصہ ہی تمام کر ڈالے مگر غریب کے غصے کا ابال بھی جھاگ کی مانند ہوتا ہے فوراً سے ابھر کر بیٹھ جاتا ہے۔ کیا کرے؟ کر بھی کیا سکتا ہے؟ استحصال، جبریت اور ذلت اسے پشتوں سے وراثت میں ملی ہوئی تھی۔ اور پشتوں کی جائیداد کہاں کسی اور کو منتقل کی جا سکتی ہے۔ لہذا سب کچھ سن کر سہہ جانا ہی اس کا مقدر ٹھہرا۔ انسانوں کی دنیا میں معاشرتی سطح پر ذات پات کے نظام کے تحت ایک اور اصول بھی سامنے آتا ہے کہ غربت اور کم ذات ہونے کی بناء پر جتنا ذلیل ہو سکا اتنا کیا گیا۔ مگر صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اگر وڈیرہ اپنے ساتھی کا قتل اقتدار کی وجہ سے کرتا ہے تو اس کا خون غریب

کے سر دھر دیا جاتا ہے۔ غریب ہزار ہا گواہ پیش کرے کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ پنچایت کا اہم رکن ہی قاتل تھا۔

ذات پات کے نظام کے تحت معاشرتی سطح پر کمی کمین کے لیے کسی قسم کی ملکی یا حکومتی سطح پر کوئی عدالت بھی نہیں ہوتی۔ اگر عدالت موجود بھی ہے تو بھی کمی شخص کے لیے اس کا وجود نہیں ہے۔ کیونکہ وڈیرہ فرعون وقت تھا۔ کیس کی ابتداء بھی اسی کے دماغ سے ہوئی اور انتہا بھی۔ اس لیے قاتل بھی وہی تھا مظلوم بھی۔ موج دین اپنی چار جماعتوں سے جو کچھ سیکھ پایا تھا اس کی بنا پر بھرے مجمع میں اس قدر بولنے کی جسارت کر پایا کہ اگر مجرم کا پتا معلوم ہے تو عدالت کا در کھٹکھٹایا جائے نہ کہ پنچایت بلائی جائے۔ جس پر قاتل تڑپ اٹھا کہ بات عدالت اور پولیس تک گئی تو شاید میرا نشانہ خطا نہ ہو جائے۔ کیونکہ اپنے ہی ساتھی کو مارنا موج دین اور شمو کی تذلیل تھی پھر اس مقصد میں تو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ جواباً ملک ڈھمکانا کہتا ہے:

> "۔۔۔ہم اپنے مجرموں کو سزا نہیں دے سکتے؟ کیا آپ جناب چاہتے ہیں کہ پانچ سات سال بعد یہ شیطان بری ہو کر ہمارے سینے پر مونگ دلیں؟ نہیں چودھری، یہ ہمارے مجرم ہیں ان کا فیصلہ بھی ہم کریں گے۔۔۔ہم کمیوں کو یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ ہمارے گریبان پر ہاتھ ڈالیں۔۔۔انگریز نے ایسے ہی تو نہیں ہمیں ان کمیوں کا مالک بنا دیا"۔ (۸)

گویا دیہی زندگی میں عدل کی علامت اگر کوئی تھی تو وہ پنچایت تھی۔ اور اسی کا کیا گیا فیصلہ حرف اول بھی تھا اور حرف آخر بھی۔ کوئی پرندہ پھڑ پھڑاتا تو اس کے پر کاٹ دیے جاتے۔ فیصلہ چودھری فلانے ڈھمکانے کی مرضی و منشا کے مطابق لکھا لکھایا تھا۔ یہ ایسا لمحہ تھا جب لوگوں کے ساتھ ساتھ وقت بھی تماش بین بنا غریب کی غربت اور بے بسی کا مذاق اڑا رہا تھا۔ کل تک جو گلیاں چوبارے موجو کی سنگت کو پکارتے تھے۔ آج استحصالی قوتیں بن کر اس پر حملہ آور تھیں۔ محض چودھری کے جھوٹ اور من گھڑت قصے پر پنچایت کا جو فیصلہ ہوا، اس کے مطابق موجو اور اس کی بیوی کو ننگا کر کے گلیوں میں گھسیٹا جا رہا تھا۔ جلوس کی شکل میں جو لوگ شامل تھے وہ ان کی طرح کم ذات اور غریب طبقہ سے وابستہ تھے۔ غریب نجانے کس مٹی کا بنا ہوتا ہے۔ دوسروں کے حکم پر اپنے ہی جیسوں کے چیتھڑے کرنے سے گریز نہیں کرتا۔

کم ذات چاہے میراثی ہو، دھوبی، نائی یا کمہار و موچی سبھی کے ساتھ معاشرہ جانوروں کا سا برتاؤ کرتا ہے۔ناول گرد باد" میں عاطف علیم جس طرح سے غرباء کا استحصال دکھاتے ہیں وہ ان کے زیرک لکھاری ہونے کی عمدہ دلیل ہے۔ مصنف نے جہاں موجو موچی کے ذریعے پوری موچی قوم کی تذلیل دکھائی ہے وہیں چراغ دین عرف چراغ شاہ کے ذریعے ایک ایسی قوم کی حالت زار کو بیان کیا ہے جو ہمارے سماج کے زرعی نظام کی پرتوں میں نچلی ترین پرت کی نمائندہ تصور کی جاتی ہے۔ میراثی، بھانڈ اور گویے کے نام سے جانے والے یہ لوگ چاپلوسی کر کے اپنے پیٹ کا دوزخ بھرتے ہیں۔ان کی نسلیں وڈیروں کی لاتیں، مکے کھا کر بھی انہیں خوشامدی انداز میں مخاطب کرنا نہیں چھوڑتے۔ چھوڑیں بھی کیسے؟اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ کوئی آسرا ہو تو دوسری جانب دیکھیں اوپر خدا تو نیچے خدائی مخلوق اور اس خدائی مخلوق میں اگر اس مفلوک الحال طبقے کی چارہ جوئی کوئی کرنے کو تیار ہوتا تو وہ یہی وڈیرہ طبقہ، جن کی جھوٹی سچی خوشامد کرتے ہیں۔

امرا اور رؤسا کی فطرت میں کچھ ظالمانہ خون کی گردش ہوتی ہے، تو کچھ ان غربا کی بے چارگی انہیں شیر بنا دیتی ہے۔ غریب کو شعور حاصل کرنے کی ہر گز اجازت نہیں ہوتی۔ اگر دے دی جائے تو امراء کی جو تیاں سیدھی کرنے والا کوئی باقی نہ رہے۔ کوئی غریب وڈیرے کے رعب میں نہ آئے۔البتہ ایک احسان کرتے ہیں چونکہ غربا کو بیوقوف بنا کر اس سے مفاد بھی تو حاصل کرنا ہوتا ہے۔ غرباء کے بچوں کو بھی اپنے بچوں کے ساتھ پڑھائی کی اجازت دے کر ان پر احسان کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ بیچارے اس احسان تلے دبے اپنے کسی اور حق کی بات تک نہیں کر سکتے۔ یہاں تک امیر کی اولاد اپنی امارت کے زعم میں غریب کو بھرے سکول کے سامنے ننگا کر دے۔

چراغ دین میراثیوں کے مظلوم طبقے کا نمائندہ ہے۔ جو سکول میں چودھریوں کی اولاد کا ہدف تھا۔ کم ذات اس کی تذلیل کی بنیادی وجہ تھی۔ مار پیٹ گالی گلوچ تو روز کا معمول تھا۔ مگر ایک دفعہ کا واقعہ جو کم ذات ہونے کی قیمت سے شاید زیادہ بڑا بھی تھا اور برا بھی۔ اقتباس:

> "حویلی زادوں۔۔۔نے چراغ کو گھیرے میں لے لیا وہ اس کے گرد ناچنے اور گانے لگے۔چراغ۔۔۔کا رنگ فق اور گھگھی بندھ گئی۔ تماشا مزے کا ہونے والا تھا یہ سوچ کر۔۔۔ ساری کلاس ناچنے والے طائفے میں شامل ہو گئی۔ تب حویلی زادے بڑھے اور انہوں

نے چراغ کو ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے اٹھالیا اور پکڑ کر زبردستی شلوار اتار دی۔۔۔ چودھریوں کا حوصلہ بڑھا تو انہوں نے اپنی شلواریں اتار کر کندھوں پر ڈال دیں۔۔۔ چراغ بلک رہا تھا اور دونوں ہاتھوں سے شرم کو چھپائے اپنی شلوار واپس پانے کے لیے منتیں کر رہا تھا"۔(۹)

جماعت اول سے پانچویں تک چراغ ان نالائق چودھریوں کی تختیاں بھی لکھتا رہا اور ان کے ہدف کا نشانہ بھی بنتا رہا۔ اس پر ظلم یہ کہ استاد سب جانتے ہوئے بھی ناخدائی قانون میں کسی قسم کی مداخلت کرنے کی جسارت نہیں کرتا تھا۔ الٹا چراغ کی شخصیت کے مذاق اڑانے پر ہنس دیتا۔ اس یقین کے ساتھ کہ میراثی قوم پیدا ہی وڈیروں کی جوتیاں سیدھی کرنے کے لیے ہوتی ہے۔

ناول "حاصل گھاٹ" میں بانو قدسیہ نے انسانی زندگی کے کئی پہلو وا کرنے کی کوشش کی ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی جغرافیائی حدود کا تعین ہو جانے کے بعد اسلامی اصولوں کا نفاذ ہوا تو پاکستان میں مقیم اور باہر سے آنے والوں کے دل و دماغ ذات پات کی تقسیم کو نئی سرزمین پر دیکھنے کے خواہاں نہ تھے۔ ان کے نزدیک ذات پات کی بدولت اونچ نیچ کا نظام اور معیار زندگی تو شاید ہندوؤں سے وابستہ تھا۔ ایک ہی کلمے کی صدا پر ملک خداداد کو حاصل کرنے والی قوم ان تعصبات سے پاک ہو گی۔ کلمہ طیبہ کو بنیاد بنا کر جس زمینی ٹکڑے کو حاصل کیا گیا تھا اس میں انسان کا استحصال نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مگر یہاں کا معاملہ انسان کی جذباتی سوچ کے منافی رہا۔

"دادا سمجھ نہ سکتا تھا کہ وہ ہندوؤں کو تو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ پھر یہ تعصبات کی گٹھڑی کون ساتھ اٹھا کر لے آیا۔ چارورن تو مسلمانوں میں بھی موجود تھے تو پھر دھرتی کو چھوڑنے کا فائدہ کیا ہوا۔۔۔؟ اپنے دل کا میل ہی نہ کٹا تو فائدہ"(۱۰)

دل کے میل زمینی فاصلوں کے کم یا زیادہ ہونے سے کہاں صاف ہوا کرتے ہیں۔ ان کے لیے انسان کو سوچ کا بڑا طویل سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ اور اس سفر میں جب وہ اپنی جڑوں تک پہنچتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ سبھی ایک آدم کی اولاد ہیں۔ اور آدم کی کسی اولاد کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہ تھی۔ کوئی کالا اور کوئی گورا نہ تھا۔ تب انسان کے حقوق اس کی جذباتی سوچ غرضیکہ کوئی بھی چیز دوسرے انسان کے استحصال کا موجب نہ بن سکتی تھی۔ مگر آج کا انسان ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے سے ذہنی مریض نہیں بننا چاہتا۔ اس لیے وہ

زمانے کی دوڑ میں دوڑتا چلا جارہا ہے اور اس دوڑ میں وہ معاشرتی اقدار کو اپنے ہاتھوں پامال کر رہا ہے۔ جس سے نہ صرف دوسروں کے حقوق غصب ہو رہے ہیں بلکہ اس کی اپنی ساکھ بھی سوالیہ نشان بنتی جارہی ہے۔

رنگ و نسل کی قائم کردہ تفریق میں قدیم و جدید سبھی لوگوں کا استحصال ہو رہا ہے۔ ناول "حاصل گھاٹ" میں دادا کا کردار اگرچہ بہت تھوڑا بتایا گیا ہے مگر چند سطور میں مصنفہ نے انسانی سوچ اور استحصال کی ایک طویل تاریخ رقم کر دی ہے۔ "اس گلی کے سفید باسی دادا کے رنگ کے ساتھ سمجھوتہ نہ کر سکے"(۱۱) اور دادا اپنی زمین سے وابستہ ایک کسان تھا جسے دھرتی ماتا سے زیادہ پیاری تھی وہ اپنی زمین کو چھوڑ کر نئی پہچان میں گم ہونے کی بجائے اپنی اصل میں لوٹ گیا۔ وہ کالے رنگ کا انسان لوگوں کو عجوبہ لگتا تھا۔ لوگ اسے سلام محض عمر کے لحاظ کی وجہ سے کرتے تھے۔

گلی کے بیچوں بیچ چارپائی پر دھرا یہ کالے رنگ کا عجوبہ ایک بات کو نجانے کن زاویوں سے سوچا کرتا جسے پڑھنے اور جاننے کی نئی نسل کو ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ ان کے سامنے ترقی کی کئی راہیں موجود تھیں۔ اور ان ترقی کی راہوں کے بننے میں کتنی قوموں کے اقدار کی پامالی ہوئی۔ کتنی قوموں کے افراد نے اپنی زبان، لباس ، رسم و رواج اور رشتوں کو دوسروں کے قائم کردہ معیار زندگی کی بھینٹ چڑھا دیا۔ روایات کو بھلا دینے سے اپنی ہی ساکھ کو اپنے ہاتھوں تباہ کر دیا۔ ان کی جڑوں میں تعصب کا رنگ ڈالنے والے آج انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں تو یہ انھیں ترقی یافتہ ممالک کی صف میں اولین درجہ دیتے ہیں۔ ہر رنگ کی اپنی شان کا نعرہ اپنے ملک میں لگایا جائے تو دہشت گردی کا ٹھپہ لگ جاتا ہے۔ کیونکہ قانون انسانی میں لبرل ہونے کے لیے اپنے بنائے ہوئے راستے کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اور دوسروں کی قائم کردہ راہوں کو درست مانتے ہوئے ان پر چلا جاتا ہے۔ نتیجتاً نہ اپنی اقدار باقی رہتی ہیں اور نہ ہی کسی کی اقدار کی عزت کی جاسکتی ہے۔ کوا جب ہنس کی چال چلنے کی کوشش کرے گا تو اپنی بھی بھول جاتا ہے۔

طاہرہ اقبال کا ناول "نیلی بار" پاکستان کی پچھتر سالہ تاریخ کا بیانیہ ہے۔ اس میں سماج کے بنیادی ادارے مذہب اور سیاست کو موضوع بنا کر لوگوں کی زندگیوں میں ہونے والا جبر استحصال دکھایا گیا ہے۔ کل دس ابواب پر مشتمل اس ناول میں بار کے موسموں، لوگوں اور بار کی روایات کا تذکرہ ملتا ہے۔ پنجاب میں

شادی بیاہ کی روایات، ذیلداروں اور وڈیروں کے ہاتھوں غربا کا استحصال اس قدر بھیانک اور کریہہ صورت حال پڑھ کر جھرجھری آجاتی ہے۔

معمول کی طرح آج پھر ایک اور قافلہ ٹیلوں کے رخ مڑنے پر نیلی بار کی وسیع و عریض حویلی میں لایا گیا تھا۔ بارات دلہن لے کر لوٹی، تو کئی ارمان دل میں سجائے، خوشیوں کے جھومر ڈالتے، ان غریبوں کو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ جھوک لنگڑیالاں کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ جہاں کی دہشت سے خائف ہو کر بھیڑیے بھی فصل خراب کرنے کی جسارت نہ کر سکتے تھے۔ بلند فضاؤں میں اڑتی کوئی چیل اس علاقے کی حدود میں گھونسلا تک نہیں بناتی تھی۔ کہ انڈوں کے اندر سے اس کے بچے اچک لیے جاتے تھے۔ کوئی جانور، انسان، جاندار، بے جان غرض کسی بھی نو عیت کی شے کا اندراج کبھی بھی خروج نہیں پا سکتا تھا۔ پھر انسان کیونکر بچ نکلتے۔

اس علاقے کے پہرہ دار گزرتے قافلوں کے راہزن ٹھہرے تھے۔ کوئی قافلہ اس راستے سے گزرتا تو اسے لوٹ لیا جاتا۔ خاص کر غریب اور کمتر ذات کی عورت لے کر گزرنے والے کو تو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ کیونکہ عورت کا شکار قانون ساز اسمبلی کے ممبر اور وزارت زراعت و دیہی امور کے قلمدان رکھنے والے ملک وڈا کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ان کے اس شغل کی نذر اکثر دلہوں کی دلہنیں ہو جایا کرتی تھیں۔ قافلہ لٹا تو مائیں اس خوف سے بین ڈالنے لگیں کہ ان کے کڑیل جوان پتر بندھی بنا لیے جائیں گے۔ مائیں بیٹوں کے لیے رونے والی تھیں۔ مگر خوف سے بھری قبریں بنیں لڑکیاں جو عصمت دریوں کے کئی واقعات سے بھری تاریخ جانتی تھیں۔ وہ اپنی ذات میں لپٹی خوف زدہ بلیوں کی طرح کمزور مدعا بنی ہوئی تھیں۔ اور قافلے والوں کو انھی کی سب سے کم فکر تھی۔ کیونکہ غریب کے ہاں بیٹی شاید تا وان وصولی کے لیے ہی پالی جاتی ہے۔

حویلی کے اندرونی حصے میں اونٹوں کی رسیاں کھینچ کر بٹھا لیا گیا۔ ملک وڈا طاقت کے زعم میں ہر ایک اونٹ کے قریب جا کر اس کا جائزہ لیتا اور مطلب کا نہ پا کر جانے کی اجازت دیتا جاتا۔ ایک کجاوہ، دوسرا، تیسرا، سبھی ایک ایک کر کے بخشش پاتے گئے۔ یہاں تک کہ جہیز والا گڈا بھی جانے دیا گیا۔ اس گڈے میں موجود غریب کے خون پسینے کی کمائی جبکہ ملک وڈا کے لیے کاٹھ کباڑ سے زیادہ اہمیت کا حامل ہر گز نہ تھا۔ ان سب کے بعد اگر روکا تو بس ایک "جوڑا گھوڑا" اسی کی پیاس تھی۔ کچھ اور نہ چاہیے تھا۔ بس اسے چھوڑو اور جاؤ۔ ملک وڈا بے پرواہ انداز میں بول دیا۔ مگر یہ کیا سب کچھ تو اسی جوڑے گھوڑے میں تھا۔ جوڑے گھوڑے میں لپٹی تازہ مہندی کی مہک لیے اپنی دوستوں کے جھرمٹ میں گھری سب سے جدا دکھائی دے رہی تھی۔ اور یہ جداگانہ وجود ہی ملک وڈا کی ضرورت تھا۔ اقتباس:

"سائیں ترلا ہے منت زاری ہے۔ اساں لسے نیار ہاں ہک لت تے تیری سرکار اچ کھلوتے

ہاں۔ سائیں! تساں بادشاہ ہو اساں غریب ہاسے تساں مائی باپ ہو، دسواں اونٹ وی چھوڑ وہا
تے ڈاھاڈا کرم کر وہا"۔ (۱۲)

ملک فتح شیر کے حکم پر قافلے کے لوگوں نے منت سماجت کرنا شروع کر دی۔ بزرگوں نے دستاریں، عورتوں نے سروں سے چادریں اتار کر ملک کے قدموں میں ڈھیر کر دیں۔ آہ وزاری کا طویل سلسلہ بالآخر ملک صاحب کے دل کو نرم کر گیا۔ انھوں نے دسواں اونٹ بھی چھوڑ دینے کا حکم دیا مگر دیکھنے پر پتا چلا کہ اس کے سوار غائب تھے۔ دلہن سمیت اس کی تین سہیلیاں غائب تھیں۔

اغواشدہ لڑکیاں زنان خانے میں پہنچادی گئیں۔ جہاں ان کا خیر مقدم نوکرانیوں سمیت خود ملک وڈا کی بیوی نے کیا۔ دلہن اپنے ساتھ سے بچھڑی تو موقع پاتے ہی دوہائی دینے لگی۔ مگر وہاں کی نوکرانیوں نے اس کو غربت سے پیچھا چھڑانے پر حوصلہ دیا کہ خوش قسمت تھی وہ جس پر نظر کرم خود ملک صاحب نے ڈالی تھی۔ یہ ناخدائی کا کیسا قانون تھا؟ کہ اپنی ذات برادری کے لوگ اس پسپائی میں اپنے جیسوں کا ساتھ دینے کی بجائے طاقتوروں کا ساتھ دے رہے تھے۔ غریب تھے، پیٹ کے بھوکے اور پیٹ کا بھوکا عقل اور سوچ سے عاری ہوتا ہے۔

ملک فتح شیر کی زندگی کے شب وروز کے معمولات پر عبدالرحمٰن اس وقت سے اعتراض کرتا آرہا تھا جب سے اس نے شعور کے ابتدائی دور میں قدم رکھا تھا۔ اسے باپ کے بااختیار ہونے پر کبھی اعتراض نہ ہوا۔ مگر جو چیز اسے تکلیف دیتی تھی وہ اس کے باپ کا غیر لڑکی کو گھر میں لا کر اس پر ناجائز حق جتلانا تھا۔ اور یہ سب کچھ وہ کئی بار اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ ماں کو اکثر وبیشتر اس سارے عمل میں خاموش دیکھ کر اس پر برہم ہوتا۔ کہ وہ کیوں اس سارے عمل کو برداشت کرتی ہے۔ اگر ایسا ہی تھا تو اس کی غیرت اس بات کو برداشت نہیں کرتی کہ اس کا باپ باقی تمام برائیوں کے ساتھ ساتھ زانی بھی ٹھہرے۔ اقتباس:

"پھر پکڑلایا میمنوں کو بڈھا بھیڑیا" ماں نے آنسو ڈبڈباتی آنکھوں سے لڑکے کو تنبیہ کی "باپ ہے تیرا"۔

"یہی تو دکھ ہے کیوں ہے باپ میرا، کسی چوہڑے مسلی کا جن لیتی مجھے۔۔۔"۔ (۱۳)

غریب اور ذات کا کمی طاقتور کی ہمدردی بھی حاصل کرتا ہے تو انھی کے مفاد میں استعمال ہونے کی غرض سے۔ عبدالرحمن باپ کے چال چلن پر معترض تھا اور خود استحصالی قوتوں کا نمائندہ بن کر ست بھرائی کی وجہ جوگن بنا۔

ii. رشتوں کے حوالے سے انسان کا استحصال:

مرد ہو یا عورت ہر ذی شعور کی شناخت سماج میں اس سے وابستہ رشتوں سے ہوتی ہے۔ مرد سے عورت کا اور عورت سے مرد کا تعلق ہی سماجی سطح پر پہچان کا سبب بنتا ہے۔ عموماً مرد اپنی ذات کے حوالے سے جبکہ عورت مرد کے حوالے سے جانی جاتی ہے۔ اسی حوالے سے معاشرے نے عورت کے کچھ روپ مقرر کر رکھے ہیں۔ اور انھی روپ میں وہ چہرہ چھپائے اپنی ذات کی پہچان کراتی ہے۔ ماں، بہن، بیٹی اور بیوی جیسے مقدس رشتے عورت کے حصے میں آتے ہیں۔ جبکہ مرد، باپ، بھائی، بیٹا اور شوہر جیسے مرتبے پر فائز ہو کر سماج میں اپنی پہچان کراتا ہے۔

اولاد کی بہتر بنیادوں پر تربیت کے لیے ماں اور باپ دونوں کا کردار بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ بچہ کی تربیت اور نشوونما میں والد کا کردار کلیدی ہوتا ہے۔ بچے میں سماجی سطح پر اعتماد پیدا کرنے کے لیے والد کا مثبت اور متحرک کردار بہت ضروری ہوتا ہے۔ اور والدین اپنی سی کوشش کر کے بچوں کو بہتر ماحول و تربیت کے ساتھ ساتھ اپنا قیمتی وقت بھی دینے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ مگر جدید دور میں جہاں والد کا کردار بچے کی تربیت کے لیے اہم ہوتا ہے وہیں کئی افراد اپنے والد کے کردار کو سمجھنے کی بجائے غلط رائے قائم کر کے اسے سخت اور برا انسان گردانے لگتے ہیں۔ خود سے ہونے والے غلط فیصلوں کی بھینٹ وہ اپنے والدین کو چڑھا دیتے ہیں۔ اپنی ناسمجھی اور کم عقلی میں والدین کا استحصال کرنے لگتے ہیں۔

ناول "حاصل گھاٹ" میں بانو قدسیہ نے انسانی زندگی میں ہونے والے اس خسارے کو بھی بیان کیا ہے۔ جب انسان قیامت کی چال چلنے والے زمانے کی چال چلتے ہوئے اپنی اصل کو فراموش کر دیتا ہے۔ جب ایک دیانت دار اور شریفانہ زندگی بسر کرنے والے انسان کو اس کے بیٹے کے سامنے ریٹائرڈ اولڈ فول کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ اور مخاطب کرنے والا کردار کوئی اور نہیں اس اولڈ فول کی اپنی بہو ہوتی ہے۔ جہانگیر، ہمایوں کے بیٹے کا کردار نبھاتا ہوا اپنے ساتھ ساتھ والدین کے استحصال کی وجہ بھی بنتا ہے۔

بیوی کی طعنہ زنی سے اکتا کر جہانگیر ڈاکٹری کی لائن کو خیرباد کہہ کر سی ایس ایس کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو ہمایوں کی سوچیں ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے لگتی ہیں۔ اس کی مرحومہ بیوی اپنے بیٹے کو کامیاب ڈاکٹر بنانے میں کیا کچھ نہ کرتی رہی تھی۔ بیٹے کو ڈاکٹر کے روپ میں دیکھنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلے تھے، اور آج وہی بیٹا اپنی بیوی کی جائز ناجائز خواہشات کی تکمیل کے لیے اپنی پہچان بدل لینے کا خواہاں ہے۔ شاندار تعلیمی

کئیریئر ہونے کے باوجود بیوی کی جانب سے دیے جانے والے احساس کمتری نے آج اسے اس مقام پر لا کھڑا کیا کہ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ والدین کی جانب سے کی گئی تربیت پر انگلی اٹھانے لگا۔ زندگی کو دولت کے ترازو میں تولنے والی شاہدہ نے جہانگیر کی سوچ کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا۔ جہانگیر کو وہ وقت یاد آنے لگا جب اس کے والدین اسے اچھی تربیت دینے کے دوران برے کاموں سے روکا کرتے تھے اور اس کے نزدیک وہی روک اس کی شخصیت کو بہتر بنیادوں پر استوار ہونے میں رکاوٹ کا باعث بنی۔ آج وہ خود کو Organized نہیں سمجھتا۔ اس کے نزدیک اس کی شخصیت کا Focused نہیں ہے۔ وجہ ؟ صرف اور صرف معاشرتی اور معاشی تفریق تھی جو شاہدہ اور اس کے خاندان میں تھی۔ اپنی پسند سے زندگی کا ساتھی منتخب کرنے میں دونوں فریقین نے جذباتی فیصلہ کرتے وقت مستقبل کا اندازہ نہ لگایا اور نتیجہ یہ تھا کہ جہانگیر بیوی کے دباؤ میں آکر والدین کی تربیت کو سوالیہ نشان بنائے ہوئے تھا۔

مذہبی اقدار اور روایات سیکھنا آج اسے وقت کا ضیاں لگ رہا تھا۔ باپ کی قناعت پسندی اس سے ترقی کا خواب چھین رہی تھی۔ ماں باپ کی محبت اسے خود پر قبضہ لگ رہی تھی۔ جسم کے ساتھ ساتھ اس کی روح بھی آزاد نہ تھی۔ وہ والدین کو بڈھے کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ کیونکہ اس کے نزدیک والدین کا نہ کوئی اپنا Exposure تھا اور نہ ہی اس کا بننے دیا گیا تھا۔

> "۔۔۔نہ آپ Status کو سمجھتے ہیں، نہ دولت کو، نہ ماڈرن لائف کو۔۔۔ آپ ابھی ایک اور عہد میں جی رہے ہیں جہاں دولت ہوتی ہے اور معیار زندگی نہیں ہوتا۔ جہاں سب کچھ ٹھہرے پانیوں کی مانند جامد و ساکت رہتا ہے۔۔۔ یہ زندگی ہے، زندگی ہے یہ۔۔۔ چل کر شاہدہ کے گھر دیکھیں۔ ادل بدل، یہ جاوہ آ۔۔۔ مصروفیت، سوشل لائف، رفتار۔۔۔۔"(۱۴)

رفتار زندگی کی شوخی، مستی اور دوڑ نے جہانگیر سے تمام آداب زندگی چھین کر اسے خار دار جھاڑی کا ایسا جھنڈ تھما دیا تھا جس سے اس کے والدین کا دامن تار تار ہو رہا تھا۔ شریفانہ زندگی کا جو معیار دینے میں جہانگیر کے والدین نے اپنی عمر وقف کر دی وہ آج غیر معیاری ہو چکا تھا۔ جہانگیر کے نزدیک والدین نے اسے شریف

بناتے بناتے خصی کر دیا تھا۔ آج اگر وہ اپنی بیوی سے ڈرتا تھا تو وجہ والدین تھے۔ سعادت مندی شاید ترقی یافتہ دور کا معیار زندگی نہ تھا۔

"ناول دائرہ" میں مرکزی کردار راشد کا جہاں نفسیاتی استحصال بنیادی موضوع بن کر سامنے آتا ہے۔ وہیں اس کی ماں کا سماجی استحصال رشتہ داروں کے ہاتھوں ہوتا دکھایا گیا ہے۔ انسان کی شخصیت پر جس ہستی کے اثرات سب سے زیادہ نمایاں دیکھے جاسکتے ہیں وہ ماں ہوتی ہے۔ ماں جن تکلیف دہ مراحل سے گزر کر اولاد کو پیدا کرتی ہے ان کے لیے متفکرانہ جذبات رکھنا قدرتی امر ہے۔ وہ جن مشکلات میں گھر کر خود زندگی بسر کرتی ہے اولاد کے لیے ہمیشہ پُر سکون زندگی کی خواہشمند رہتی ہے۔ نسیم کی ماں دنیا سے رخصت ہوئی تو اس کے حصے کی تمام خوشیاں بھی اپنے کفن میں ساتھ لے گئی۔ سوتیلی ماں نے نشئی بھائی کے ساتھ نسیم کی شادی کر کے جان چھڑالی۔ کوئی خیر خبر رکھنے کا رواج غربت کے باعث نہیں پایا گیا تھا۔ جھٹ پورہ کی مفلوک الحال بستی جو شہر کے پوش علاقہ سے آنے والے گندے پانی کے نالے کے کنارے آباد تھی۔ نسیم اپنے شوہر اور بیٹے راشد کے ساتھ اسی آبادی کا حصہ تھی۔ گھر میں جو کچھ ملتا جیرو اپنے نشے کی لت میں سب کچھ بیچ چکا تھا۔ ماں بیٹا خدا کی آس پر پل رہے تھے۔

انسان کی سماجی سطح پر پہچان میں رشتے شناختی علامت تصور کیے جاتے ہیں۔ خاص کر عورت کے حوالے سے بات کی جائے تو عورت ابتدا سے آج تک مرد کے ساتھ وابستہ تعلق کی بنا پر سماجی سطح پر اپنی پہچان کراتی آئی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "عورت کو رشتوں کے نام پر جو غیر مرئی زنجیریں پہنائی جاتی ہیں وہ اتنی قدیم ہیں کہ اب ہمارے اجتماعی شعور میں جاگزیں ہو چکی ہیں۔ لہذا ہم عورت کا بحیثیت فرد تصور ہی نہیں کر سکتے، وہ بیٹی ہے، بہن ہے، وہ بیوی ہے، وہ ماں ہے، وہ دادی ہے، وہ نانی ہے۔ ہر رشتہ کے ساتھ اس کے کردار کا مخصوص سانچہ اور عمل کا بے لچک لائحہ عمل بھی ہے"۔ (۱۵)

راشد کی ماں ابتدا سے کسمپرسی کی زندگی گزارتی آئی تھی۔ غربت کے جو تھپیڑے میکے میں ملے وہ ہی آج ماں بن کر بھی کھا رہی تھی۔ آج بھی اس کا کوئی پُرسان حال نہیں تھا۔ بیٹے کا تاریک مستقبل اس کے سامنے تھا۔ مگر وہ اس تاریکیت کو زندگی کے ہر خانے سے کھرچ کر نکال دینا چاہتی تھی۔ وہ بیٹے کے لیے کچھ بھی کر گزرتی مگر اسے دوسرا جیرو بنا کر کسی کے استحصال کا موجب نہ بننے دینا چاہتی تھی۔ جیرو کے کردار کا یہ حال کہ اگر نشے کی دیہاڑی نہ لگی تو نیم کے ہرے بھرے درخت کو کاٹ کر بیچنے پر اتر آتا۔ جس کے لیے نسیم اس کے آگے سینہ سپر ہو کر کھڑی ہو جاتی۔ کو

ئی بھی صحت مند شے جیرو کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی چاہے وہ درخت کی ہری بھری ٹہنیاں ہی کیوں نہ ہوتیں۔ شاید وہ بیوی کو بیچ کھاتا۔ مگر اس کے اندر زندگی جینے کی تمنا ختم ہو چکی تھی۔ بدتر حالات کی چکی میں پستی وہ دائمی مریضہ بن گئی۔ غربت اور مرض دونوں نے مل کر اس کا خوب استحصال کیا۔ راشد کو میونسپلٹی کے سکول میں داخل کرا کے اسے کامیاب انسان دیکھنے کی متمنیٰ نسیم جلد ہی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ مرنے سے قبل سوتیلے بھائی کے حوالے بیٹے کو کر دیا۔ جانتی تھی کہ اس کے گزر جانے کے بعد جیرو بیٹے کو بھی نشے کا اڈا بنا دے گا۔ وہ اس بڑی لعنت سے اسے بچانا چاہتی تھی۔ غریب کی عزت اور غیرت غربت کے ہاتھوں راکھ بن جاتی ہے۔ نسیم کے مرنے پر اس کے کفن دفن کا انتظام محلے والوں نے کر دیا۔ جیرو کے راستے کا کانٹا نکل گیا تھا۔ گھر کو اونے پونوں بیچا اور شہر میں دریافت شدہ نشے کے اڈوں کی رونق بڑھانے لگا۔

سماج میں پھیلی نا آسودگی ہر گھر کی چار دیواری پار کر کے اندر داخل ہوتی ہے۔ ہم انسان خاص کر مشرقی دنیا کے باسی جتنے بھی ترقی کر لیں، ایٹمی پاور بن جائیں، چاند تک کو مسخر کر لیں، عورت کو پائلٹ بنا دیں مگر ہمارے مردانہ معاشرے کی سطحی سوچ میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی۔ ابتدائے آفرینش سے ہی عورت خدمت گاری کے لیے وقف تھی اور آج اکیسویں صدی میں بھی یہی صورت حال ہے۔ گھریلو مسائل اس کی زندگی میں پیدائشی اذان کی مانند لازمی طور پر شامل ہو جاتے ہیں۔ گرچہ وہ ان سب سے بنرد آزما ہوتی زندگی گزارتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ مرد ہی کا بوجھ بانٹنے کی خاطر جب کمر کستی ہے تو وہ اپنے ہی مرد کو ایک آنکھ نہیں بھاتی وہ اس کی مدد کو آوارگی کا نام دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ایسے خیالات باپ، بیٹی کے رشتے کی تقدیس کو بھی پامال کرتے ہیں۔ باپ، بیٹی کا ساتھ دینے کی بجائے زمانے کے خیالات کی صف میں کھڑا ہوتا ہے۔ باپ بیشک ہو، ہوتا تو وہ مرد ہی ہے۔

تعلق کے مخصوص سانچے میں ڈھل کر عورت معاشرے میں بحیثیت بیٹی تابعداری کا منبع تصور کی جاتی ہے۔ اچھی بیٹی ہے تو حکم عدولی کرنے کی جرات کبھی نہیں کرے گی۔ کہیں اپنی مرضی یا حق کی بات کرے گی تو نظروں سے گرا دی جائے گی۔ اور یہ اسے گوارا نہیں لہذا اپنی من مانی کی خواہش پس پردہ رکھ کر نیک اور صالح بن کر زندگی بسر کرتی ہے، اس طرح بہن ہے تو گھر میں بھائیوں کے لیے تیسرے درجے کی شہری بن کر زندگی بسر کرے۔ اور اگر بیوی ہے تو ایسی نیک اور سعادت مند کہ آنکھوں دیکھی برائی کو بھی برائی نہ بولے۔ کیونکہ مرد کی عزت اور غیرت عورت کی عزت اور غیرت ہونی چاہیے۔ مرد اگر زانی بھی ہو تو بھی عورت اسے پارسا مان کر اس کے

قدموں میں ڈھیر ہو جائے۔ کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے۔ ہمہ وقت ساس کی باندی، دیور کی بھی خدمت گزاری میں پیش پیش دکھائی دے۔ اور باور چن و دھوبن ہونا تو لڑکی کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کے کان میں ڈال دیا جاتا ہے۔ بیوی سے اگلی معاشرتی پہچان عورت کی ماں کے نام سے ہے۔ ماں جس کے قدموں تلے خداوند تعالیٰ نے جنت رکھ دی۔ اور اس جنت کی زندگی ممتا کے تقاضوں کا بوجھ اٹھاتے گزر جاتی ہے۔ ایسے ہی معاشرتی تقاضے نبھاتے رشتے طاہرہ اقبال اپنے ناول "نیلی بار" میں دکھاتی ہیں۔

طاہرہ اقبال وڈیرہ ازم کی پروردہ ہیں۔ ماحول جس میں پلی بڑھیں، اس کے خلاف لکھنے کی جسارت کرنے والی یہ نڈر کہانی کار بہت تھوڑے عرصے میں اپنی پہچان کرا کے ادب کے اہم لوگوں میں شمار کی جانے لگیں۔ راستہ رو کے حقائق سے واقف کرانے کی جسارت کرتی ہیں۔ عورت و مرد کے وہ تمام حوالے جو سماج میں کسی بھی تعلق کی بنیاد بنتے ہیں۔ سبھی طاہرہ اقبال کے ناول "نیلی بار" میں بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔ بہن کا رشتہ محبت سے عبارت ہوتا ہے۔ پیدائش تا جوانی خاندان پر محبتیں نچھاور کرنے والی بہن اکثر و بیشتر محبت پانے میں ناکام رہتی ہے۔ خاص کر جاگیر داری نظام کے حوالے سے بہن اور بیٹی سدا کی مفلوک الحال ہستیاں بن کر سامنے آتی ہیں۔ بھائی اکثر محبت کے چند بولوں کے عوض زندگی بھر کی خوشیاں اپنے پاس گروی رکھ لیتے ہیں۔ ایسے سلوک سے لڑکی احساس کمتری کا شکار ہو کر زندگی کے ہر میدان میں مستقل بے چارگی و لاچاری کا سمبل بنی دکھائی دیتی ہے۔

رابعہ الرباء کے بقول:

> "۔۔۔۔ امتیازی سلوک سے لڑکیوں کی ذہنی تربیت بہت متاثر ہوتی ہے۔ ان میں احساس کمتری پیدا ہوتا ہے۔ وہ خود کو محکوم و کمزور سمجھنے لگتی ہیں"۔ (۱۶)

ایسی ہی کمزور حالت کے سبب عورت معاشرتی سطح پر بار بار استحصال کا شکار ہوتی آئی ہے۔ خاص کر بہن کی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو بھائی کا حاکمانہ رویہ اور روایتی مردانہ سوچ اس کی ہر جائز خواہش کی تکمیل کے آڑے آجاتی ہے۔ جاگیر داری نظام کے خاص ماحول کی پیداوار سوچ کے مطابق بہنوں کی شادی ہی نہیں کی جاتی۔ تاکہ جائیداد میں حصہ مانگنے نہ کوئی آجائے۔ اور اگر ایسی قربانی دینے کی کوئی بھائی ہمت کرتا بھی ہے تو اپنی ذات کے وٹے میں بیوی کے بھائی کے ساتھ بیاہ دیا جاتا ہے۔ پرانی دشمنیاں ختم کرنی ہوں تو بدلے میں بہن کا رشتہ دے دیا جاتا ہے۔ بھائی کی تمام تر غیرت کا مرکز بہن ہوتی ہے۔ اگر بہن چار دیواری میں مقید ہو کر بالوں میں چاندی اترنے پر بھی جائز حق نہ مانگے تو گویا وہی اصل بہن کہلانے کی حق دار ٹھہرتی ہے۔ زندگی کے ایسے ہی نشیب و فراز میں ہچکولے لیتی

صفورہ(مشمولہ نیلی بار)میں سامنے آتی ہے۔جب اس کی آنکھوں کے سامنے بے نکاحی کم عمر لڑکیاں گھر میں لائی جاتی ہیں۔

"پینگ کے اونچے ہولاروں میں سوار صفورہ نے چودہ پندرہ برس کی ان لڑکیوں کو حسرت سے دیکھا۔ اس چھوٹی سی عمر میں کیسے کیسے تجربات سے گزر گئی تھیں یہ۔۔۔ایک وہ تھی۔۔۔ستائیس برس گزر گئے۔ سانس روکے دم سادھے حبس موسموں میں عمریں منجمد ہو گئیں۔ کوئی آندھی جھکڑ اس کی سمت نہ بدل سکا تھا۔ وہ آٹھ آٹھ پہر جھلنے والی آندھیوں میں گھومتی رہتی چکراتی رہتی۔ منوں ٹنوں دھول لکھ کانے واولونے اسے لپیٹے رکھتے، لیکن مٹھی بھر کھائی میں پڑے اس پتھر کا پاسا کبھی نہ بدل سکے"۔(۱۷)

آزاد دنیا کی باسی اس حویلی کی نوکرانیاں زندگی کو جینے کا ہنر رکھتی تھیں۔ ان کے ماحول کے مطابق انھیں وقت اور حالات سب کچھ دے دیتے تھے۔ اگر کچھ نہ مل پایا تھا تو وہ حویلی زادیاں تھیں جن کے حصے میں سدا کی تنہائی اور بنجر پن حویلی زادوں نے لکھ دیا تھا۔ بنا چیخ وپکار، احتجاج کیے زندگی کے دن پورے کرتیں اور منوں مٹی تلے جا سوتی تھیں کہ اچھی بہن، بیٹی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ انھیں صرف دستاروں کو اونچا رکھنا ہوتا ہے۔ ان دستاروں کے اونچے رکھنے میں وہ گڈے گڑیوں کے کھیل سے تمام معاشرتی تقاضے پورے کر لیا کرتی ہیں۔ اور اس کھیل میں بھی وہ حقیقت کو فراموش نہیں کرتیں۔ جو سنگلاخ چٹانوں کی مانند دل و دماغ میں پیوست کر دی جاتی ہے۔ کہ لڑکی کبھی نہیں بیاہی جاتی، کوئی گڈا بارات لے کر گڑیا کو بیاہنے نہیں آتا۔

یہاں صرف زندگی جینے کا حق بیٹوں کا ہوتا ہے۔ بیٹیاں تو محض زندگی گزارنے آتی ہیں۔ اور اگر دیکھا جائے تو ان کے لیے یہ احسان کیا کم تھا کہ انھیں پیدائش کے وقت زندہ دگور کرنے کی بجائے زندگی کی سانسیں بخش دی جاتی ہیں۔ انسانوں کی اس دنیا میں انھی احسانوں تلے دبی وہ اپنے اکلاپے سے بیاہ دی جاتی ہیں۔ اپنے ہی گمان کو آپ ہی جواب دیتی ہیں۔ جذبوں کے امڈتے سیلاب کو خود ہی بند باندھتی رہتی ہیں۔ مگر جب جذبوں کی طغیانی میں طوفان برپا ہوتا ہے۔ تو سارے بندھے بند ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔ بھائی تین اولادوں اور جوان بیوی کے ہوتے ہوئے دلہوں کی دلہن بیچ برات سے اٹھا کر گھر لے آئے اور یہ سب ایک بار نہیں کئی بار ہوا۔ لڑکپن سے جوانی کے ابتدائی دور میں داخل ہونے والا بھتیجا بھی باپ کے خلاف سینہ سپر ہو کر لڑکی سمیت گھر سے نکل بھاگا۔ تو صفورہ کاہے بچ سکتی تھی۔ نفس کے بہکاوے میں وہ بھی آگئی۔ اور ستو کی جگہ اس نے زندگی کا امرس چکھ لیا۔ کسی ایک کمزور لمحے کے زیر

اثر آنے والی صفورہ اپنی زندگی ایک ہی رات میں مکمل جی چکی تھی۔ تاریکی اور نشے کی حالت میں شناخت کی ضرورت باقی نہ رہی۔

صفورہ جو شناخت لے کر دنیا میں آئی تھی اسے اب بے شناخت ہو جانا تھا۔ کیونکہ ارد گرد پھیلی زندگی جینے کی خبریں سن سن کر اسی زندگی والے ذائقے سے اس کا بدن بھی آشنا ہونا چاہتا تھا۔ اور بے شک بھوک پر خوراک کی اشتہا اور مہک سبقت لے جایا کرتی ہے۔ یہ بھوک کی اشتہا صفورہ کے چاروں طرف بکھری پڑی تھی۔ اس بکھری پڑی بھوک کو مٹانے نکلی تھی۔ بکھاں، ستاں، لکھاں نجانے کون کون اور کتنی کتنی بار زندگی کے امر رس کو چکھ چکی تھیں۔ مگر انھیں امام مہدی پیدا کرنے کا شرف نہ ملا تھا۔ جو صفورہ کے حصے میں آیا۔ صفورہ کوئی عام بہن نہ تھی وہ ملک وڈا کی بہن تھی۔ صفورہ صرف وہی تھی اور بکھاں، ستاں تو ہزاروں تھیں۔ اسی لیے اس کا ڈولا اس شان سے اٹھنے والا تھا۔ کہ سانول دیس سدھار رہی تھی۔ اسے داتا کی نگری جانا تھا۔ جھٹ پٹ بھاگتی، چار قدموں کا ایک بناتی، لال اوڑھن اوڑھے، دلہن کا روپ دھارے صفورہ ڈولی کی جانب بھاگی۔ اقتباس:

> "دیکھ تو بھرجائی رقیہ میں ووہٹی بن کے کیسے لگ رہی ہوں۔ نی لُچیو! لال بوچھن ڈالونی میرے اوپر۔۔۔نی میں ساورے دیس (سسرال) چلی۔۔۔"
>
> "لیکھاں سڑی۔۔۔۔ اس حویلی کی بیٹیاں ایسے ہی سسرال میں جاتی ہیں۔ نی کرم پٹی تو لڑکی کیوں ہوئی تو فرشتہ ہو جاتی تو جوگی بن جاتی۔ ری کملی تجھے عورت بننے کی اجازت کس نے دی تھی۔۔۔۔ ایک بار پوچھ تو لیتی تو بس اس حویلی کی عزت تھی۔ عورت بننے کا حق نہیں ملا تھا، ری تو کیوں عزت کی پنڈ سے عورت کا وجود بن گئی"۔
>
> "نی کرماں سڑی دھیئے نی تو جمی تو ماں کا سر لیا۔ قدم قدم چلی تو باپ کھا گئی۔ بھائی تیرا ڈولا کیوں اٹھاتا۔ بختاں سڑی دھیئے ڈولے کے ساتھ مربع جو اٹھتے تھے"۔ (۱۸)

صفورہ آنے والے وقت کے اسرار سے ناواقف باہر کی فضاؤں کو دیکھنے کے چاہ میں سبھی خواتین کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑاتی باہر بھاگی۔ زندگی کے ستائیس برسوں میں پہلی بار اس کی آواز حویلی سے باہر آزاد فضاؤں میں گونجی تھی۔ سب کو روتا کرلاتا پیچھے چھوڑتی اپنی دھن میں جوڑا گھوڑ اوڑھے صفورہ سانول دیس سدھارنے کو سجے سنورے کجاوے میں جا بیٹھی۔ کتنی آنکھیں پانی برساتی رہیں، کتنی زبانیں بین اگلتی رہیں مگر صفورہ کا ڈولا اسے لیے چل پڑا۔ صحرائی میدان، جلی سڑی جھاڑیاں اور جھلسے ہوئے صحرائی لو کے جھونکے صفورہ کے دل کو لبھا رہے تھے۔ مگر مائی بھاگاں جو ان سب اسراروں سے واقف تھی اسے یہ لو کے تھپیڑے جھلسا رہے تھے۔ وہ دوہائی دے رہی تھی

کہ صفورہ تجھے عزت کی امانت سونپی گئی اور تو امانت میں خیانت کر بیٹھی۔ تو عزت تھی اور عورت بن بیٹھی۔ صفورہ کا انجام سوچ کر اماں بھاگو کا کلیجہ پھٹ رہا تھا۔ جتنی وہ پریشان حال تھی۔ صفورہ اتنی ہی خوشحال۔ اسے آج کھلا کھلا آسمان نیلا دکھنے لگا۔ زمین اتنی بڑی، اتنی چوڑی اور رنگوں بھری دکھائی دے رہی تھی۔ اماں بھاگو جتنے اونچے بین الاپتی صفورہ اتنا ہی آزاد فضا میں اونچے سانس لیتی۔ ملک فتح شیر کی دنیا سے بہت دور اب وہ قہقہے لگانے میں آزاد تھی اور اسے کوئی پو چھنے والا نہیں تھا۔ وہ ہیجانی انداز میں وحشی قہقہے لگانے لگی۔ وہ انجام سے دوچار ہونے جا رہی تھی۔ مگر ایک مکمل زندگی جی کر۔ اماں بھاگو کو زارا اور سارہ کے لیے پیغام دے رہی تھی، ان کو بتانا کہ ان کی پھوپھی صفورہ نے دنیا کی رو نقیں دیکھی تھیں۔ وہ ہنسی، اونچا ہنسی، بولی بھی اور سب سے بڑھ کر دونوں آنکھیں کھول کر جی بھر کے زمین و آسمان کو دیکھا بھی مگر اسے کسی نے روکا ٹوکا نہیں۔ کوئی سنگلاخ چٹان درمیان میں حائل نہیں ہوئی۔ اس نے تمام سفر آزادی کے ساتھ طے کیا۔

صفورہ اپنی ایک لمحے کی جی گئی زندگی میں جو کچھ کر چکی تھی وہ کسی بڑے انعام سے کم نہ تھا۔ وہ شیر کی زندگی جینے کی ہمت کر چکی تھی۔ گیدڑ کی گمشدہ اور بیچارگی والی زندگی تو وہ کب سے جیتی آئی تھی۔ مگر دلیری سے جیا گیا ایک لمحہ ان سالوں پر بھاری نکلا۔ ساتھ جانے والے غمزدہ تھے، تکلیف میں مودبانہ انداز میں۔ ایک وہ تھی کہ اپنے آپ کو بھاگوں والی کہہ رہی تھی۔ اس کا ایک ایک لفظ مائی بھاگو کے دل کو چیر رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس نے جگ دیکھا، اس نے امر رس چکھا اور اسی امر رس کے چکھنے میں ماری گئی۔ اقتباس:

> "اماں! بی بی صاحبہ کو چادر میں لپیٹ کر کجاوے سے اتار لو۔۔۔" صفورہ نے یکبارگی نقاب الٹ دی۔۔۔ چمکیلی دھار والی تلوار ریشم سے نرگٹ پر تیزی سے پھری۔۔۔ لہو اور قیمے کی پھانکیں اڑاتا ہوا سر بھاگو دائی کی گود میں آ گرا، حلق نے خون کا پیالہ غٹ کر کے اگلا۔ بھاگو دائی کی چیخوں سے جنگل کے جانوروں، درندوں میں کھلبلی مچ گئی "۔(۱۹)

مرنے سے قبل بھی صفورہ کو چادر اوڑھے رکھنے کا حکم تھا۔ کہ وڈیروں کی بہن، بیٹیاں یوں ننگے سر کہاں گھوم سکتی ہیں۔ وہ حسین چہرے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اگر کسی کو شرف حاصل ہوتا بھی دیکھنے کا تو وہ مٹی ہی ہوتی ہے۔ ان کی صورت کو گور کی مٹی کا پردہ ہوتا ہے۔ صفورہ کی بوٹی بوٹی کر کے گدھوں کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ جنگل میں درندوں میں بھی کھلبلی مچ چکی تھی۔ اگر کچھ حرکت پذیر نہ تھا تو ملک فتح شیر اور اس کا بنایا ہوا خود ساختہ و اندھا قانون۔ تن سر سے جدا کر کے گھر لانے کا حکم تھا۔ تعمیل ہوئی۔ کٹے سر کے ساتھ، پھٹی آنکھیں گھر کی بچیوں کے لیے عبرت کا

نشان تھیں۔ معصوم ہاتھوں سے اپنے چہرے چھپائے خوف کے مارے مٹی کی قبریں بنی ہوئی تھیں۔شاید مدیحہ رحمٰن نے اتنے سخت الفاظ کا استعمال ایسے ہی واقعات کے زیر اثر آکر کیا وہ کہتی ہیں کہ:

"اگر جنین مادر کو یہ حق دیا جائے کہ آیا وہ روئے زمین پر لڑکا بن کر جنم لینا چاہتا ہے یا لڑکی تو میرا کامل یقین ہے کہ آج کے اس معاشرے میں روئے زمین پر کوئی لڑکی جنم نہ لے گی"۔(۲۰)

تن سے جدا گردن اور جسم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جیسے قربانی کے جانور کے کیے جاتے ہیں۔اس قدر روح فرسا نظارہ اس سے بڑھ کر سفاکی اور درندگی کی اور انتہا کیا ہو گی۔ملک فتح شیر نے بہن کو عورت بننے کی سزا دی جبکہ ذیلدار نے بیٹی کو دیوار سے پار جھانکنے کی پاداش میں زمین میں گاڑھ دیا۔

بیٹی خوبصورت رشتے کا نام ہوتا ہے مگر تقسیم دولت میں اس کا وجود ایک آنکھ نہیں بھاتا۔بیٹی وہ اولاد ہوتی ہے جو کسی بھی معاشرے میں پیدا ہونے پر خوشی کی بجائے سوگواری کی علامت تصور کی جاتی ہے۔بڑی محنت کر کے چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو حاصل کر کے بے پناہ خوشی کا احساس جگا کر گھر کے ماحول کو خوبصورت بنانے والی ہستی بوجھ تصور کی جاتی ہے۔بیٹی کے حوالے سے عمومی اس تصور میں کہیں کسی بھی والدین کا قصور نہیں ہوتا۔یہ سماج کا عمومی رویہ ہوتا ہے۔ جس کی بدولت اس ہستی کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔انسائیکلوپیڈیا آف سائیکالوجی کے مطابق:

Starting at birth, girls and boys are treated differently in many socialization areas. Most are given names and dressed in clothes that culturly sex-appropriate. Adults socialize boys primarily for the occupational instruments role and girls primarily for the expressive motherhood role found in adult sex-role stereotypes".(21)

وہ جو ذیلدار کے نام سے خوف کھاتی،ڈر کے ڈربے میں بند، سزا سے زیادہ سزا کا خوف اسے ہلکان کیے رکھتا تھا۔اسے زندگی کا کچھ پتا نہ تھا۔نوکرانیاں دنیا جہاں کے قصے کرتیں، ہنستیں،ایک دوسرے کو چھیڑتیں مگر بے خبر و بے نیاز تھی تو صرف بختاور۔وہ اگر کسی سے واقف تھی تو ذیلدار جو اس کا باپ تھا۔ جس نے کبھی دست شفقت اس

کے سر پر نہ رکھا تھا۔ اگر کچھ دے پایا تو محض اپنی ذات کا خوف اور ڈر جو بختاور کی ذات کے انگ انگ میں رچ بس چکا تھا۔ اکثر اوقات اس کے جی میں آتا کہ خوف کے بند ڈربے سے نکل کر باپ کو بولے کہ ابا جی مجھے ایک ہی بار مار ڈالو۔ یوں ترسا ترسا کے لمحہ لمحہ موت دینے سے بہتر ہے۔ اور باپ تھا کہ ہر وقت غصے کی لٹھ اٹھائے رکھتا۔ ایک بار خلاف معمول ٹھہرو کے کہنے پر جلسے میں جھانکنے کی جسارت کر بیٹھی۔ وہ موج میلا جسے گاؤں کے سبھی مرد و زن دیکھنے کی اجازت رکھتے تھے۔ اسے دیکھنے کی قطعی اجازت نہ تھی۔ اور وہ شاید دیکھنے کی خواہشمند بھی نہ تھی۔ اگر ٹھروا سے ست بھری کے رانجھن کے آنے کی نوید نہ سناتی تو وہ کبھی نہ دیکھتی۔ وہ تو ست بھری کے جنون کی وجہ کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے ہر گز خبر نہ تھی کہ ست بھری کے رانجھن کا دیدار اسے گور تک پہنچا دے گا۔

الیکشن سے متعلق سجے میلے میں ہیجڑوں اور مراثیوں کا ڈھول کی تھاپ پر تال سن کر دیکھنے کی اشتہا بڑھی تو بے اختیار بختاور بھی اسی سمت کھنچتی چلی گئی۔ ست بھری کے رانجھن کی شناخت کرنا تو وہ بھول گئی تھی۔ اس کی آنکھیں تو باہر سجے نظاروں سے آگے بھی نہ گئی تھیں کہ ذیلدار ملک الموت بنا اس کے سر پر آن کھڑا ہوا۔ اقتباس:

"کڑیے کڑیے اے اے اے
بختاور کپکپاتی ٹانگوں پر مڑی، سامنے لال انگارہ آنکھوں اور کھلے جبڑوں والا شیر جیسے ابا جی کھال اوڑھے اسے دبوچنے کو فضا میں جست بھر چکا تھا۔
"وہ کچے فرش کی سیاہ تلن میں دھنستی چلی گئی۔ کانوں آنکھوں۔۔۔ ہر ہر مسام جیسے خون کی الٹیاں اگلنے لگا ہو"۔(۲۲)

ذیلدار اسے اپنی ذات کا خوف دے کر واپس چلتا بنا۔ مغرب کی اذانوں تک کھانا برتا گیا۔ خراماں خراماں مہمان رخصت ہونا شروع ہوئے۔ بچا کھانا ٹھکانے لگایا جانے لگا۔ اسی دوران نوکرانیوں کی آہ وزاری نے پوری حویلی کی خوشگوار فضا کو اپنے بینوں سے سوگوار کر دیا۔ بختاں بی بی مر گئی۔ ہائے اور باچپ کی مٹھی میں گھٹ گھٹ کر مر جانے والی معصوم بختاں بی بی۔ ایسے غیر انسانی سلوک کی روادار ہر گز نہ تھی۔ ایسا بے پرواہ انداز کسی باپ کا ہر گز نہیں ہو سکتا۔ وہ باپ نہیں تھا، تھا بھی اگر تو بس ایک جاگیر دار جسے بیٹی سے زیادہ جاگیر کے بٹوارے کی فکر تھی۔

"میری بچی میں تیرا بڑا شکر گزار ہوں تو نے مجھے کسی کمینے کے سامنے سر جھکانے پر مجبور نہیں کیا۔ تو نے مر کر مجھ پر بڑا احسان کیا، اب میں ماندہ زندگی سر اٹھا کر چلنے کے قابل رہوں گا۔ شکریہ میری بچی۔۔۔۔ شکریہ"(۲۳)

شکریہ اور پھر کلمہ شہادت کی صدا لگاتے بختاور کا ڈولا اٹھالیا گیا۔ ڈولا اس لیے کیونکہ ان محل ماڑیوں کی بیٹیوں کے ڈولے نہیں اٹھتے جنازے ہی ان کے ڈولے کہلاتے ہیں۔ ان کے قتل کی صورت نکلنے والا خون مہندی کہلا تا ہے۔ دیے جانے والے زخم گہنے ہیں۔ ڈر کی سیج پر پھانسی چڑھتی رہتی ہیں اور بالآخر اسی ڈر اور چپ کی چادر اوڑھے، اپنے کالے نصیبوں پر بین کرتی اس جہان سے رخصت ہو جایا کرتی ہیں۔ امر اور ؤسا کی بیٹیاں زندگی الگ تھلگ جیتی ہیں تو ان کا بناؤ سنگھار بھی انوکھا ہو تا ہے۔ ماتمی شام کے ٹھنڈے سائے جب تاریکی سے گلے مل چکے تو اسے لحد میں اتار دیا گیا۔ جی کے نہ سہی مر کے معتبر ٹھہری۔ مٹی بڑا پردہ، اور اسی پردے میں لاج اور شرم کی چادر اوڑھے، نیک اور جنتی بختاور جیسی بیٹیاں دھرتی کی کوکھ میں چھپ جایا کرتی ہیں۔

ہر فرد مرد ہو یا عورت دونوں کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ ان کے جذبات و احساسات اور سوچ کو اہمیت دی جائے۔ سماجی ناہمواریوں اور غلط فہمیوں کا شکار ہونے کی بدولت مرد اور عورت میں انفرادیت کے حوالے سے عدم مساوات دکھائی دیتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قدیم کی نسبت جدید دور میں مرد اور عورت کے مابین امتیازی سلوک کی شرح کم ملتی ہے۔ بہت سے معمولات میں عورت مرد کے ساتھ کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ مگر قدیم سوچ اور نظام کے حامی افراد آج بھی عورت کو خود ساختہ قوانین کی جکڑ بندیوں سے آزاد کرنا اپنی تذلیل تصور کرتے ہیں۔

ثمینہ (مشمولہ: دائرہ) بڑے جوکھم سے باپ اور بھائی کی مخالفت سہتی بمشکل مڈل کر پائی تھی۔ کہ باپ کی جانب سے مزید نہ پڑھنے کا حکم جاری ہوا۔ سکول سے اٹھوا کر گاؤں کے ایک بڑے زمیندار سے اس کی شادی کر دی گئی۔ اس زمیندار کی پہلے سے دو بیویاں اور بیٹیاں موجود تھیں۔ محض بیٹے کی خواہش میں کم عمر لڑکی کو اس کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ مگر تقدیر کی جانب سے کیا جانے والا فیصلہ اب کی بار مرد کے حق میں نہ تھا۔ بیٹا تو درکنار سوکھی سڑی لڑکی پیدا ہونے کی امید بھی دکھائی نہ دی۔ بمشکل ڈیڑھ سال کی مدت کے بعد طلاق کا طوق گلے میں سجائے ثمینہ باپ کے در پر آ بیٹھی۔ اقتباس:

> "باپ اور بھائیوں نے تو اس باعث کہ ان کی برادری میں ناک کٹ گئی تھی، اس سے کلام ہی موقوف کر دیا۔۔۔ گاؤں کا ہر فرد اسے ایسی نظروں سے تکتا جیسے بچہ نہ جن کے اس نے سارے گاؤں والوں کے سر میں خاک ڈال دی ہو"۔(۲۴)

ہوا کے دوش پہ تنکا تنکا بکھرا آشیانہ اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے۔ ثمینہ کی ناقدری گھر کی چار دیواری سے باہر بھی ہو نے لگی۔ تو رہائش گاہ جہنم کے الاؤ کی سی تپش دینے لگی۔ ایسی جھلسا دینے والی لو سے دور بھاگ جانا بہتر تھا۔ کوئی در اور

نہ ہوتا تو شاید یہیں جھلس جھلس کے اپنی جان دے دیتی۔ مگر شہر میں تعلیم کے سلسلے میں پہلے سے عاق ہو جانے والے بھائی کے پاس جانے کا موقع اسے تقدیر کی جانب سے عطا کیا گیا تھا۔ اس لیے بھائی کی آغوش میں پناہ لی۔ اور وہاں شادی کر کے دو بچوں کی ماں بھی بنی۔ وہ جو گاؤں بھر میں لڑکا پیدا کرنے والی سے زیادہ منحوس سمجھی گئی تھی۔ وہ بانجھ بنا کر طلاق کی مستحق ٹھہری تھی۔ آج دو بچوں کی ماں بنی تو معتبر کہلائی گئی۔ کہیں لوگوں نے استحصال کیا اور کہیں حالات و تقدیر نے سنبھالا دیا۔

اس میں شک نہیں کہ عورت سدا سے زیادتی کی مستحق قرار دی جاتی رہی ہے۔ مگر کہیں کہیں مرد بھی استحصال کا شکار ہو جاتا ہے۔ ثمینہ کا بھائی جو پڑھ لکھ کر شعور و آگہی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اپنی زندگی کو خاندانی مٹی دھول سے نکال کر آزاد فضاؤں میں سانس لینے کا متمنیٰ تھا۔ شعور حاصل کرنے کی پاداش میں اسے علاقہ بدر کر دیا گیا۔ آئندہ اس سے کسی قسم کا کوئی تعلق روا نہ رکھا گیا۔ ثمینہ اور نورین یکے بعد دیگرے اسی بھائی کے پاس پناہ گزین ہوئیں تو وہ بھی خاندانی سلسلے سے منقطع کر دی گئیں۔ باپ بھائی ان کو ہر قسم کے تعلق سے نکال کر اپنی زندگیوں میں مگن ، سرشار و مطمئن دکھائی دینے لگے۔ گو کہ فوراً سے حالات طبیعت و سوچ کے مطابق نہ ہوئے۔ ابتدائی ایام میں ابال و بھونچال کی ملی جلی کیفیات نے حالات کو کافی غیر معتدل کیے رکھا۔ دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کے گھر سے چلے جانے کے بعد غیظ و غضب کا بے پناہ اظہار کیا گیا۔ بندوق تھام کر شہر کا رخ کیا کہ کہیں دستیاب ہوں تو مار کر انا کی تسکین حاصل کی جائے۔ مگر کچھ بن نہ سکا تو زبان بند کر کے ہر قسم کا تعلق توڑ لیا۔ یہاں تک کہ ماں کے مرنے پر بھی اولاد کو اطلاع دینا مناسب نہ سمجھا۔

سماجی و ثقافتی لحاظ سے بیٹا اور بیٹی دونوں میں امتیاز کا تناسب ان پڑھ اور پڑھے لکھے دونوں گھرانوں میں ایک مخصوص سطح پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ تمام تر شعور و آگہی کے باوجود بیٹی کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھ کر ایک سطح پر اس کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس بحیثیت انسان وہ ارد گرد کے گھٹن زدہ ماحول میں اپنے احساسات و جذبات کے ساتھ ساتھ اپنی سوچ و فکر پر پڑے بھاری پردوں سے فرار کی خواہشمند دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنے تشخص اور اثبات ذات کے حوالے سے مثبت تبدیلی کی آرزو رکھتی ہے۔ وہ ایک مکمل ہستی اور زندہ وجود کے طور پر اپنی ذات کی پہچان کرانا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ سوچ اور فکر کی جو آزادی مرد کو ملی ہے وہی اسے بھی دی جائے۔ اسے محض جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر باہر کی حقیقت سے دور نہ رکھا جائے۔ وہ انسان پیدا ہوئی ہے تو اس کے ساتھ برتاؤ بھی انسانوں والا کیا جائے۔ نسرین انجم بھٹی معاشرے اور ادب میں کارفرما مردانہ سوچ کے حوالے سے لکھتی ہیں:

"جو مراعات مرد کے لیے ہیں۔ وہ عورت کے لیے نہیں ہیں۔ بس جب عورت Human

نہیں رہی تو اس کا کردار بھی کم انسانی ہوا"۔ (۲۵)

تلخ مگر حقیقت ایسی ہی ہے۔ اور ایسے حقائق کی ترجمان پاکیزہ (مشمولہ: نیلی بار) ہے۔ اس کارگہ حیات میں عورت مرد کے ساتھ مساوی شراکت کی اہل تھی۔ مگر قوانین انسان نے اسے کیا سے کیا بنا دیا۔ اس کا تشخص اور ذات خطرے میں پڑ گئے۔ اسے حقائق سے دور رکھنے کے جتن کیے جانے لگے۔ وہ حقائق سے واقف نہ ہو پائے۔ ارد گرد بکھری حقیقتیں ہی تو اسے ادراک ذات کا پیغام سنانے والی تھیں۔ اسے پھوپھی بختاور کے انجام سے ناواقف رکھا جا رہا تھا۔ ست بھرائی سے ست بھری تک کا سفر طے کرنے والی کملی جھلی کا تذکرہ کرنے والی نوکرانی کو چٹیا سے پکڑ کر چولہے میں جھونکا دینے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ کیونکہ اسے صرف کہانیاں سنا کر پاکیزہ بی بی کی طبیعت بہلانے پر معمور کیا گیا تھا۔ وہ ایسے حقائق کی گٹھڑیاں کیوں کھول بیٹھی تھی جس سے اسے منع کیا گیا تھا۔ نیا دور، نیا نظام کی بدولت تبدیلی کی ہوا باہر چلی تو نوکرانیوں کی کہانیوں کے ذریعے جھونکے اندر بھی آنے لگے۔ پاکیزہ ادھوری کہانیاں سن سن کر اپنے خیالات کی الگ دنیا بسائے رکھتی۔ اسے لگتا باہر تبدیلی کے نعرے گھر کی چار دیواری میں بھی تبدیلی لے آئیں گے۔ پاکیزہ ارد گرد کی باتیں سن کر یہی نتیجہ نکال پاتی کہ اگر ان مجبور و محصور لوگوں کے زنگ آلود دماغوں کے تالے کوئی کھول سکتا ہے تو وہ آنے والا نیا حکمران ہی ہو گا۔ جو جمہوری نظام لیے ہوئے آئے گا۔ نئے نظام کی آمد پر جتنا وہ خوش ہوتی ساتھ ہی یہ سوچ اسے فکر میں مبتلا کر دیتی کہ آنے والا نیا نظام جتنا بھی تبدیلی لانے والا ہو گا اس سے اس گھر کے مکینوں کی سوچ اور مقام کبھی تبدیل نہیں ہو پائے گا۔ کسی کی ذات کو اتنی اہمیت نہیں دی جائے گی جتنی کا وہ مستحق ہے۔

> "وہ جانتی تھی کہ بھٹو کتنا بڑا ہو جائے وہ امی جان سے بڑا نہیں ہو سکتا ہے، جو اس وقت ایک نوکرانی کو چٹیا سے پکڑ کر تابڑ توڑ جوتے برسا رہی تھیں اور باقی بیسیوں ملازمائیں تھر تھر کانپتی تھیں۔ پاکیزہ کی کپ کپاہٹ اس کے منے سے وجود کی کمزور ہڈیوں کو تڑخا رہی تھی"۔(۲۶)

پاکیزہ انسان تھی۔ انسانوں کی طرح زندگی جینا چاہتی تھی۔ وہ باہر کی دنیا سے ناواقف تھی۔ نر اور مادہ کیڑوں کو ساتھ اکٹھے دیکھنے کی اجازت تک نہ تھی۔ اسے لگتا کہ دنیا کے قوانین میں اگر کہیں بالادستی ہے تو مرد کی یا پھر طاقتور کی۔ طاقت کے زعم میں انسان جتنا ظلم کر سکتا ہے کرتا چلا جاتا ہے۔ اسے کسی قسم کی کوئی روک ٹوک نہیں۔ اکثر و بیشتر ایک ہی سوچ پاکیزہ کو فکر مند کیے رکھتی کہ اس کی زندگی محض دو سرگرمیوں کا محور بنے گزر جائے گی۔ اسے چاروں اور بند حویلی کی اونچی دیواروں کے پار ہنستی بستی دنیا بھاتی تھی۔ دماغ کے پردے پر

ان دیکھی تصاویر کے ہزاروں رنگ نقش ہو جاتے تھے۔ تخیل کی دنیا میں یہ سب بہت اعلیٰ تھا۔ مگر حقائق اس کے برعکس تھے۔

وہ ان دیکھے نگروں کی ادھوری کہانیاں سنتی شباب کے دور میں داخل ہو گئی۔ اور یہ دور بھی بچپن سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ آج بھی اسے کسی سے بات کرنے پر ممانعت تھی۔ خاص کر مرد ذات چاہے وہ عمر کے کسی بھی حصے میں ہو۔ بچہ ہی کیوں نہ ہو وہ کسی سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ اس قدر لگائی جانے والی پابندیوں نے اس کی فطری خود اعتمادی بھی چھین لی۔ اس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ اس قدر قلیل تھا۔ کہ چاہتے ہوئے بھی کوئی بات روانی کے ساتھ نہ کہہ پاتی۔ اس کے سامنے زندگی جینے والے غریب غربا تھے۔ وہ انھیں دیکھتی اور اکثر سوچا کرتی کہ کاش! وہ کوئی کمی کمین، چوڑی، مسلن ہوتی وہ چوڑیاں بیچنے والی فاطمہ ہوتی، جس کی معاشرے میں اپنی کوئی پہچان کوئی نام تو تھا۔ وہ یوں بے نام نہیں مرے گی جس طرح پاکیزہ نے مرنا تھا۔ وہ انسان تھی۔ مگر اس کی بد بختی کہ وڈیروں کے گھر میں پیدا ہوئی۔ اس لیے اعلیٰ و ارفع مقام کی قیمت تو چکانا تھی۔ چنانچہ چکاتی آرہی تھی۔

نظام کائنات تبدیلی کے عمل سے گزرتا ہے تو سبھی کچھ تبدیل ہوتا ہے۔ انسانوں کی دنیا بھی تبدیل ہوتی ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول میں دیکھ چکی تھی۔ کہ کمی کمین ذات کی عورتیں کتنی بھاری قیمت پر بیاہی جاتی تھیں۔ وہ غریب، لولی لنگڑی اور بد ہیت ہو کر بھی امید واروں کے معاملے میں بڑی دولتمند اور خوبصورت تھیں۔ جو ان کا امید وار ہوتا، ٹکے جوڑ کر بیاہنے آتا۔ ان کے سارے ناز نخرے اٹھواتا۔ کبھی اونچ نیچ ہو جاتی تو اسے بڑے مان سے چھوڑ کر میکے آجایا کرتیں۔ مگر ان کے مقابلے میں پاکیزہ کا حال سدا قابل رحم۔ اقتباس:

> "کاش وہ مسلن ہوتی میراثن ہوتی۔ اس کے ٹکوں کے لیے کوئی پیسہ جوڑتا اور بھاری قیمت یعنی ٹکے بھر کر اسے عزت سے لے جاتا۔ اسے تو ٹکوں کا اعتبار بھی حاصل نہ ہوا"۔(۲۷)

اس کے دونوں بھائی اپنی اپنی بیویاں بیاہ کر گھر لے آئے۔ مگر پاکیزہ بڑی حویلی کے زندان سے روزن ہی تلاش کرتی رہی۔ اور اسی معمول میں اس کی زندگی کا بیشتر حصہ بیت چکا تھا۔

مرد و عورت کائنات کے دو متوازی مگر ہم معنی اجزا ہیں۔ قوانین قدرت کی انجام دہی میں دونوں کا ملاپ ضروری قرار پاتا ہے دونوں کے آپسی تعلقات میں سماجی ضابطوں کی کار فرمائی بھی پائی جاتی ہے۔ راہ چلتے کئی الجھاؤ آتے ہیں۔ جنھیں سلجھانے کے لیے دونوں کو مل کر ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے رہنا پڑتا ہے۔ کوئی ایک بھی اگر لڑکھڑا جائے تو مسائل اور الجھنیں کم ہونے کی بجائے شدت اختیار کر لیتی ہیں۔

انسانی زندگی میں سماجی ضابطوں کی انجام دہی میں اتار چڑھاؤ کے دوران جو نتائج دیکھنے کو ملتے ہیں ان میں زیادہ تر لڑکھڑاتا مرد ہی دکھایا گیا ہے۔ تڑپ اور اذیت کا شکار اگر کوئی کردار سامنے آتا ہے تو وہ عورت ہی ہوتی ہے۔ استحصال اور عورت کا رشتہ بڑا قدیم ہے۔ یا شاید یہ کہا جائے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں، تو غلط نہ ہو گا۔ معاشرے میں عورت کے لڑنے کا کوئی ایک محاذ نہیں ہے۔ حقیقی زندگی کی استحصال زدہ یہ مجاہدہ نجانے کتنے محاذوں پر اپنی بقا کی جنگ اکیلے لڑتی ہے۔ بے اعتباری اور بے وفائی کے تمام تر نام و مقام اسی کی ذات سے منسوب کر دیے جاتے ہیں۔

گھر ہو یا باہر، نجی زندگی ہو یا سماجی ہر ایک میں عورت سے قربانی مانگنے کا تصور عام ہے اور عورت ان تمام مسائل سے نبرد آزما ہوتی اپنی منزل کی جانب رواں دواں رہتی ہے۔ بشیراں (مشمولہ دیس ہوئے پردیس) ناول کے مرکزی کردار برکت علی کی بیوی ہے۔ دونوں گھر کے سونے آنگن کو پیار و محبت سے سیراب کرتے رہے۔ ان کے گھر میں غربت کا بسیرا تھا۔ مگر خوش تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے۔ مگر ایسا کب تک چلتا۔ پیٹ کا دوزخ یونہی نہیں بھرتا۔ بھوک ننگ کا راج بڑھنے لگا تو بشیراں گھر سے نکل پڑی۔

گزر بسر میں کوئی لمحہ ایسا بھی آیا جب دل سے آرام طلبی کی ننھی کونپل نے جنم لیا۔ کہ کاش مرد کما کر لاتا تو زندگی کے بھلے دن یادگار بن جاتے ہیں۔ سسکیوں اور آہوں میں برکت علی کو رخصت کیا۔ سسکتی رہی مگر روکا نہیں۔ روکتی بھی تو کیوں؟ کیونکہ اب وہ تھک چکی تھی۔ ان آلودہ نگاہوں کی آلودگی سے، ان میں چھپے مفہوم سے۔ عورت ہونے کے ناطے اس کی تحقیر اب برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔ اس نے برکت علی کو اس آس پر رخصت کیا کہ آنے والے دور میں وہ اپلے تھاپنے سے بچ جائے گی اور اس کی عزت کا کھلواڑ کرنے کی نیت رکھنے والے اپنا سا منہ لیے بیٹھے دیکھتے رہ جائیں گے۔ مگر فطرت سے ظالم انسان ٹھہرا۔

> "بشیراں پر کچھ بوجھ ہوا وہ بول نہ سکی اور اس کے نتھنوں میں سبز گھاس تھی۔۔۔ امام دین اپنے آپ کو سنبھالتا کھیت سے باہر آیا، روتے ہوئے بچے کے قریب ہوا تو جھجکا اور پھر جیسے منہ چھپاتا ہوا پرے چلا گیا۔"(۲۸)

اندھیرے میں منہ چھپاتا امام دین روشن دن کے ساتھ کھلے منہ دندناتا پھر رہا تھا۔ کیونکہ وہ مردوں کی دنیا کا باسی تھا۔ جہاں عورت کی ذات ہمیشہ سوالیہ نشان ہی رہتی ہے اور اب کی بار بھی ایسا ہی ہوا۔ بشیراں اور برکت علی کا جائز بچہ بھی اپنی اصل کو ڈھونڈھ رہا تھا۔ اگر کسی کا جائز ہوتا تو کبھی بے یار و مددگار یوں پگڈنڈی پر تنہا نہ چھوڑ جاتے۔ امام دین کی ہوس کا نشانہ بننے والی بشیراں نہ جانے کتنے برسوں سونی گود کے ہرا ہونے کی منتظر رہی۔ خواب کو تعبیر ملی

بھی تو کیا، ہریالی کو اجاڑنے والے پہلے سے منتظر تھے۔ انصاف کا علم بلند کرنے والا یہ معاشرہ بولا بھی تو کیا؟ کہ بشیر اں کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔ بشیر اں بھاگ گئی یا نشانہ بن گئی۔ ان دونوں باتوں کے درمیان فرق تلاش کرنے کی ضرورت محسوس ہی نہ ہوئی۔ بشیر اں کو کسی نے تلاش کرنے کی کوشش ہی نہ کی۔ برکت علی سالہا سال دور رہنے کے بعد لوٹا بھی تو اللہ دتہ افیمی کی باتوں پر یقین کرتے ہوئے اسے بے وفائی کا نام دے گیا۔ اپنی اولاد کو دیکھنا تک گوارا نہ کیا۔ مرد تھا نہ اس لیے غیرت آڑے آگئی۔ بس سنا اور یقین کر لیا۔ پہلے ہی دور تھا مزید دور ہو گیا۔ برکت علی کی خاموشی بشیر اں کے پاک کردار کو داغدار کر گئی۔ بشیر اں کا کردار پر اسرار رہا۔ عورت ہونے کے ناطے دور قدیم سے ہی پر اسرار مخلوق تھی۔ اور اب اس کی خاموش موت اسے مزید پر اسرار بنا گئی۔ "شاید اس کی وجہ اختر جمال کی بتائی ہوئی ہو "مردوں کا علم ظاہر کا ہے اور عورتوں کا علم باطن کا ہے۔"(۲۹)

قدیم دور میں باطنی علم کی واقف اس لیے مانی جاتی تھی کہ وہ تولیدی مسائل سے آشنا تھی اس لیے دیوی بھی بنی رہی۔ آج جبکہ نظام تولیدی پر اسرار معاملہ نہیں رہا تھا۔ تب بھی عورت پر اسرار مانی جاتی ہے۔

بشیر اں نے برکت علی کو شہر اس لیے جانے کی اجازت دی کہ وہ گجروں کے گھروں میں اپلے تھاپنے کا کام آئندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وجہ وہ ادراک تھا جو اس کی چھٹی حس اسے دے رہی تھی کہ آنے والے وقت میں چبھتی نگاہیں کچھ مزید برا کرنے والی ہیں۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں برکت علی کو خود سے دور جانے کی اجازت دی تو ساتھ اشارتاً حالات سے باور بھی کرا دیا۔ مگر ظاہر کا علم رکھنے والا مرد باطن سے کہاں واقف تھا۔ ظاہر سنا اور اسی پر ایمان لاتے ہوئے اپنا قبلہ بدل بیٹھا۔ حالانکہ یہ وہ بشیر اں تھی جس نے کبھی کسی کو آنکھ تک اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔

برکت علی کی غیر موجودگی میں گھریلو مسائل کے نبھانے میں عنایت علی (برکت علی کا چچازاد بھائی) کافی پیش پیش رہا۔ اور آج اس کی لاش پر کھڑے آہ وزاری کرتے ہوئے عنایت علی بھی اس بات کا گواہ تھا کہ بشیر اں اس مسیحا کے رنگ تک سے ناواقف تھی۔ تو کسی آشنا کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا تھا۔ مگر اس بات سے کیا فرق پڑتا تھا۔ برکت علی ان استحصالی قوتوں کے ساتھ مل گیا۔ کوئی اور تو تھا نہیں جو اس کے اعتبار میں اسے گور میں جانے سے بچاتا۔ معاشرے میں بشیر اں کا مقام و مرتبہ برکت علی کی بدولت تھا جب اس نے منہ موڑ لیا تو کوئی اور اس کے تحفظ اور حقوق کی کیا بات کرتا اور کیسے؟ ڈاکٹر سلیم اختر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "۔۔۔ اپنی انفرادیت تسلیم کرانے کے لیے وہ مرد کے سہارے کی محتاج ہے۔ بغیر خاوند کے وہ بالکل صفر بن جاتی ہے۔ غرض یہ کہ ہر لحاظ سے اُسے مقابلتاً مرد کمزور قرار دیا جاتا ہے۔ وہ مرد کے برابر نہیں اور اسے زیادہ سے زیادہ

جو درجہ مل سکتا ہے وہ نصف بہتر کا ہے۔"(۳۰)

شوہر اور بیوی کی حیثیت سے برکت علی اور بشیراں ایک ہی ناؤ کے مسافر تھے۔ دونوں کی راہیں اور منزلیں ایک ہی تھیں مگر حالات کے دھارے نے منزلوں اور راہوں کو جدا کر دیا۔ سماجی ضابطوں کے مطابق سربراہی کے فرائض نبھاتے ہوئے برکت علی نے کسی کا ساتھ بیچ راستے چھوڑا تو وہ بشیراں تھی کسی کے کہے پہ یقین کر بیٹھا حقائق کو جانے بنا۔

برکت علی ناول میں مرکزی کردار بن کر سامنے آتا ہے۔ دیس پردیس دونوں جگہوں برکت علی کے ذریعے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ برکت علی غربت و تنگدستی کے ہاتھوں گھبرا کر شہر کا رخ کرتا ہے۔ شہر جانے کی ضرورت شاید اسے کبھی پیش نہ آتی اگر اس کے بزرگوں کا نام اس کے کام کی نوعیت کے آڑے نہ آتا۔ اس کے بزرگ اپنے وقتوں کے بھلے جاگیر دار تھے۔ جاگیر آنے والی نسلوں میں بٹتی رہی، اس تک آتے آتے وہ نام کے جاگیر دار رہ گئے تھے۔ برکت علی کے ساتھ عنایت علی اور گاما بھی تھے۔ ان دونوں کی نسبت برکت علی کے لیے لمحہ فکریہ تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ اس کی ایک عدد بیوی تھی جس کی سرپرستی کے لیے اسے پیسہ کمانا تھا۔ کیونکہ چاچا دتہ افیمی کے گنے چرا کر کھوئی کے کنارے بیٹھ کر وہ خود تو ان کا رس چوس کر پیٹ بھر سکتا تھا مگر بشیراں ایسا کام نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ سوچ وچار کے طویل سلسلے کے بعد برکت علی اور گاما دونوں نے لاہور جانے کی ٹھانی۔ پانچ روپے دہاڑی کے عوض کسی گھر میں تعمیراتی کام کے لیے مزدوری کرنے لگے۔ دوران مزدوری ان پر انکشاف ہوا کہ چک جوگیاں اور لاہور کے علاوہ دنیا کے دوسرے کونے سے انسانوں کی آمد و رفت کے لیے معقول ذریعہ دنیا میں موجود ہے۔ پاسپورٹ کے علاوہ گیارہ سو روپے لے کر کراچی کا رخ کرنے والوں کی سمندری جہاز کے ذریعے قسمت کو چار چاند لگ جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ غلام علی اس دن سے آگے صرف ولایت کا سوچنے لگا۔ ولایت جانے کی راہ میں حائل تمام رکاوٹیں اسے زہر قاتل لگ رہی تھیں۔ اسے فرق نہیں پڑتا تھا کہ اس کی ذرا سی حرکت سے کئی زندگیاں تباہ ہو سکتی تھیں۔

> "جس روز مزدور ولائتی گھڑی باندھ کر آیا تھا اس سے پورے گیارہ دن بعد ایک صبح پولیس کے دو سپاہی آئے اور برکت کو پکڑ کے لے گئے۔ "تم نے اور تمھارے مفرور ساتھی غلام علی نے کوٹھی کے برآمدے میں۔۔۔ ٹن سریا بیچا ہے۔۔۔"(۳۱)

جس چند سو روپے غلام علی کی ضرورت تھے اور انھی چند سو روپوں نے برکت علی کی زندگی اندھیر کر دی۔ خود غرضی کے اس اندھیر کی نذر صرف برکت علی ہی نہ ہوا بلکہ بشیراں بھی اپنے نومولود بچے کو کھو کے

حوالے کر کے برکت علی کی دنیا سے منہ موڑ گئی۔ دولت کی قدر رشتوں کی قدر پر حاوی ہو گئی۔ غلام علی نے برکت علی کے ارمانوں کا خون کر کے اپنی خواہشات کی عمارت بڑی بلند تعمیر کی تھی۔

مالکوں کا سر یہ بیچنے کی سزا چھ ماہ قید برکت علی نے نہ صرف قبول کی بلکہ کاٹی۔ صرف قید ہی کافی ہوتی کچھ اور نہ ہوتا۔ مگر غلام علی کا اعتراف برکت علی کو مزید دہلا گیا۔ اس کی کل جمع پونجی بھی غلام علی کی خواہشات کی تکمیل کی نذر ہو گئی۔ انسان اپنی خواہشات کی تکمیل میں دوسروں کی حاجات تک کو فراموش کر دیتا ہے۔ غلام علی زندگی کی تمام رعنائیاں بیرون ملک دیکھ رہا تھا اور برکت علی عرف بکو کے حصے میں کچھ دیکھنا آیا بھی تو اجاڑ اور ویران گھر برسوں اولاد کی خواہش پالنے والا یہ انسان اولاد کو دیکھ بھی نہ پایا اور غموں کی گٹھڑی باندھے نئے سفر پر روانہ ہو گیا۔ جس کی منزل گم شدہ تھی۔ کیونکہ منزل کا تعین وقت اور حالات نے کرنا تھا۔ اس لیے ارادہ باندھ کر چلنا بے فائدہ تھا۔

مستنصر حسین تارڑ کا ناول " قربت مرگ میں محبت " اگرچہ نفسیاتی طرز تحریر ہے۔ نفسیات کے ساتھ ساتھ سندھ کی قدیم و جدید تاریخ اور معاشرت بھی اس ناول کا حصہ بنتی ہے۔ خاص کر عورت کے حوالے سے سندھ کا ماحول جو ناول کے ذریعے سامنے آتا ہے کئی سوالات کو جنم دیتا ہے۔ کہ عورت جب مدرسری سے پدر سری نظام کا حصہ بنی اور ملکیت کے تمام تر اختیارات مرد کے حصے آ گئے تو ایسے میں عورت کی فضیلت کمتر ہو کر ایک دایہ اور خادمہ کی سی رہ گئی۔ مردوں نے بچوں کو اپنی ملکیت سمجھا اور عورت کو مکمل طور پر بے دست و پا کر دیا۔ یہ قدیم دور کا رویہ تھا جو عورت کے حوالے سے برتا گیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج کی عورت ان سب جکڑ بندیوں سے آزاد زندگی بسر کر رہی ہے یا کہ وہ قدیم عورت کی طرح مرد کے تسلط میں ہے؟

ناول " قربت مرگ میں محبت " کے تناظر میں سندھی کلچر میں عورت کی حیثیت کے حوالے سے دیکھا جائے تو سندھ جو امن کی دھرتی ہے جہاں عورت اور قرآن دونوں کے حوالے سے ایک ہی طرح کا رویہ برتا جاتا ہے۔ قرآن ایک الہامی کتاب ہونے کے ناطے مقدس ہے سو عورت رحمت ہونے کے ناطے عزت کروانے کا حق رکھتی ہے۔ سننے، سمجھنے اور پڑھنے کی حد تک تاریخی حوالے دل کو مسرور کرتے ہیں۔ مگر حقائق برعکس دکھائی دیتے ہیں۔ عورت دور قدیم میں مرد کی ملکیت تھی اور آج جبکہ اکیسویں صدی کی دوسری دہائی سے نکل کر تیسری دہائی میں قدم رکھا جا چکا ہے تو بھی عورت وہیں کھڑی بے بسی کی صدائیں لگا رہی ہے۔

"۔۔۔ہاں سائیں جو باہر کے لوگ ہوتے ہیں وہ یقین نہیں کرتے کہ ایسا بھی ہوتا ہے لیکن بڑے سومرو صاحب جب ڈرنک ہو جاتے ہیں تو اپنے بیٹے کے سامنے مجھ سے فلرٹ کرنے

لگتے ہیں"۔(۳۲)

یہ کیسے ممکن ہے؟ انسانی ذہن کئی طرح کے سوالات کو جنم دیتا ہے۔ کیا انسانی معاشرہ اتنا سفر طے کرنے کے بعد بھی دور جہالت میں کھڑا ہے؟ جہاں عورت کی حیثیت جانور سے زیادہ کی نہ تھی۔ کیا اتنا مہذب ہو جانے کے بعد بھی رشتوں کا تقدس پامال کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی جاتی؟ کیا باپ بیٹی کا بھروسہ آج بھی پانی کا بلبلہ ہے؟ فیڈرل منسٹر اپنے گھر کی بہو بیٹیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر ان کا جنسی استحصال کرتا ہے۔ ناول میں عابدہ سومرو کا کردار اگرچہ نفسیاتی عارضے میں مبتلا دکھایا گیا ہے مگر اس کے پس پردہ لکھاری نے ایک علاقے کی تہذیب و معاشرت میں عورت کا جو استحصال دکھایا ہے وہ ان کے عمیق مطالعہ و مشاہدہ کو بیان کرتا ہے۔

گھر میں دی جانے والی دعوت طعام میں کئی بڑی سیاسی شخصیات کو مدعو کرنا جہاں فیڈرل منسٹر کی عزت کو چار چاند لگاتا ہے۔ وہیں ایسے ہی ماحول میں عورت اور مرد کے درمیان رشتوں کے تقدس کو پامال کرنا کس قدر زہر ناک بن کر سامنے آتا ہے۔ انسانیت اس طرح کے شرمناک ماحول میں منہ چھپاتی دکھائی دیتی ہے۔ باپ کا بھری محفل میں اپنی بہو کو استعمال کرنا اور بیٹے کا یہ سب کچھ دیکھ کر نہال ہو جانا کہ اس کی بیوی کو باپ نے یہ عزت بخشی ہے۔ وڈیروں کی پڑھی لکھی بیٹیاں اور بہوئیں ان کے لیے object کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ کیونکہ تاریخی حوالے میں وڈیروں کی بہو بیٹیاں آکسفورڈ اور ہارورڈ کی پڑھی ہوئی نہیں ہوتیں وہ تو سات پردوں میں چھپا کر رکھی جاتی ہیں۔ انھیں باہر کی ہوا نہیں لگوائی جاتی۔ ان کی زندگی چار دیواری میں مقید ہوتی ہے اور اس قید کی اوٹ سے باہر جھانکنے کی اجازت ملتی بھی ہے تو کسی شکار میں پھنسے ہوئے پرندے کو آزادی دلوانے کی غرض سے۔

زمانہ قدیم میں کوئی بھی عورت ایسے کام کی مرتکب ہوتی تو اسے مروجہ قوانین کے مطابق سزا دی جاتی تھی۔ اور جدید دور میں ترقی کی خاطر ذلت کی چادر نہ اوڑھنے پر سزا سنائی جاتی ہے۔ دنیا کے انداز بدلے ہیں تو نئے رنگ و ساز کے ساتھ آج کا مرد خود کو نمایاں کرنے کے لیے عورت کو سیڑھی بناتا ہے۔ سیاسی جوڑ توڑ میں دعوت طعام کی صورت اپنی خوبصورت پڑھی لکھی عورت کو پیش کر کے بھرپور مردانگی کا ثبوت دیتا ہے۔

زمین کے مالک اپنی ملکیت کا حق ہر شے پر جتاتے ہیں۔ چاہے وہ کوئی شے جیتا جاگتا انسان ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی قیمت لگاتے ہیں۔ سر بازار بیچ کر مردانگی کا ثبوت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ سماج میں باپ اور بھائی، بیٹی و بہن کا مان سمان ہوتے ہیں۔ اگر انھی کے ہاتھوں اس کی عزت کا بیوپار ہو تو قابل اعتبار بھلا کون رہا؟ اقتباس:

> "۔۔۔۔بیٹی والے تو کبھی رشتے کے لیے نہیں جاتے پر وڈیرے ایسی روایت کو الجھن نہیں بناتے جو انھیں اس سے بھی بڑا اور طاقتور وڈیرہ بنا سکتی ہو"۔(۳۳)

غریب بیٹی کا سودا غربت کے ناگ کو مارنے کے لیے کرتا ہے اور امیر اپنی امارت کا علم بلند کرنے کے لیے۔ سودے عورت کے ہی کیے جاتے ہیں۔ قیمتیں قیمتی چیزوں کی لگائی جاتی ہیں اور اس میں شک نہیں عورت زمین پر ایک قیمتی شے بن کر آئی۔ اس کے بے مول کرنے کی کوششیں کل بھی کی جاتی تھیں اور آج بھی کی جارہی ہیں۔

باپ کی جاگیر میں پورا دن گاڑی چلے اور اس کی دھول سے نجانے کتنے خدا بخش پیدا ہو سکتے تھے۔ اس کے با وجود باپ بیٹی کو فروخت کر دیتا ہے۔ وجہ؟ طاقت کی نشو و نما، طاقت کی بڑھوتری کے عمل میں تمام سماجی ضابطے اور قوانین دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ عورت کا غرور اس کا باپ و بھائی تھا۔ اور جب یہ غرور خاک میں ملا تو اس نے سب کچھ خاک میں ملا دیا۔ احساس کمتری کی مریضہ بن کر مرد کو نشانہ بنا کر اس کا استحصال کرنے لگی۔ کسی مرد نے اس کا استحصال کیا تھا اور اب وہ کسی اور کا کر رہی تھی۔ رابعہ الربا کے بقول:

> "ہمارے ہاں عورت کو عورت کے سانچے میں نہیں مردانگی میں تلاشا جا رہا ہے۔ اس کو اس کی نرمی میں، تعصب کے بناڈھونڈنا مرد کے شاید اختیار میں نہیں رہا"۔ (۳۴)

محبت و اعتبار کی گھنی چھاؤں، اپنی بانہوں کو پھیلائے زمانے کی تمازت سے بچائے رکھنے والی یہ ہستی کبھی سختی کی خواہاں نہیں رہی۔ زمانے کے گرم تھپیڑوں سے گھبرا کر اپنے فرائض سے کبھی ہٹتی نہیں تھی۔ کوئی عورت آج تک خدائی کے دعوے کی مرتکب نہ ہو پائی۔ اس کے باوجود مرد اس کا بیوپار کرتا آیا ہے۔ وجہ؟ شاید مرد عورت کو سمجھنے کا دعویٰ دار بن بیٹھا ہے۔ سمجھنا ہی تو نہیں تھا کیونکہ یہ انمول شے پیار کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ سمجھنے بیٹھا تو خود اس کا شکار ہونے لگا۔

حسن منظر جدید دور کے ایسے ناول نگار ہیں جو ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر نفسیات بھی ہیں۔ نظریاتی اعتبار سے ترقی پسند ہیں۔ اور اسی ترقی پسندی کی سوچ کی بدولت ان کی تحریروں میں زندگی کے تلخ حقائق بڑی تفصیل کے ساتھ بیان ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا ناول "دھنی بخش کے بیٹے" اس حوالے سے کافی اہم گردانا جاتا ہے ۔ اس ناول کے پس منظر میں صوبہ سندھ کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی کی کہانی پائی جاتی ہے۔ پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی اس کی جڑوں میں جاگیر داری نظام پیوست تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ کچھ علاقوں میں اس کا زور ٹوٹا اور اس کی جگہ سرمایہ داری نظام نے لے لی۔ گویا انسانیت کو پیسنے کا ایک نظام اگر ختم ہوا بھی تو دوسرا اس کی جگہ آن موجود ہوا۔ البتہ سندھ اور جنوبی پنجاب کے متعدد اضلاع اس نظام کے شکنجے سے آج بھی نجات پانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ۔ جاگیر داری کلچر ان علاقوں میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے ۔ ابتدا سے آج تک جاگیر داری نظام میں اگر کوئی ہستی مخدوش حالت میں دکھائی دیتی ہے تو وہ کسان، مزارع اور خواتین ہیں۔

ناول "دھنی بخش کے بیٹے" میں خواتین کے ساتھ روا رکھے جانے والے بہیمانہ طرز عمل کی تصویر کشی بڑے عمدہ انداز میں کی گئی ہے۔ دھنی بخش کی تین نرینہ اولادیں جبکہ ایک بیٹی عائشہ ہے جو کہ آٹھ برس کی عمر میں قوت بینائی سے محروم ہو چکی تھی۔ تین بیٹوں میں سے ایک کی وفات پانے پر بڑا بیٹا غمزدہ ہونے کی بجائے جائیداد کے حصہ دار کم ہو جانے پر خوشی کا اظہار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ناول میں جہاں جاگیر دار اپنی جہالت گھر کی عورتوں پر نکالتا دکھائی دیتا ہے۔ وہیں اس کے ہاتھوں مرد بھی کہیں محفوظ دکھائی نہیں دیتے۔ علی بخش اپنی طبیعت میں ان تمام نقائص کے ساتھ ناول میں موجود ہے۔ جو ایک ظالم جاگیر دار کے اندر ہوتی ہیں۔ آمرانہ اور سفاکانا خیالات کا مالک عیاش پسند انسان دوسروں کو کمتر جان کر ان پر ظلم کرنا اپنا حق سمجھتا ہے ۔اس کے نزدیک عورت کی عصمت پامال کر کے بڑا مرد گردانا جاسکتا ہے۔ ناول نگار ایک کردار کے ذریعے پوری جاگیر دار برادری کی خصلتوں کو سامنے لاتا ہے۔ جن کا شوق بیل، کتے لڑانا اور پیسے اڑانا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ریاستی سطح پر اپنی بڑی پہچان رکھتے ہیں۔ سیاسی منظر نامے میں بھی ان کا نام بلند مقام کا حامل ہوتا ہے۔ حکومت سے قرض لے کر عیاشی کرتے ہیں اور واپسی کا مطالبہ کرنے والے کی یا تو سیٹ بدل دی جاتی ہے یا اسے دنیا سے ہی اٹھوا دیا جاتا ہے اندھیر نگری میں اندھا راج چلتا ہے۔

عورت کو اپنے حقوق کے بارے آگاہی فراہم نہیں کی جاتی۔ اگر ایسا کر دیا جائے تو آبروئیں پامال ہونے سے بچ جائیں گی۔ مرد اپنی عیاشی کے لیے بیوی کو حکم دیتا ہے کہ وہ اسی کی پسند کی لڑکی فراہم کرے ۔اور وہ بلا چون وچرا اس حکم کی بجا آوری میں ذرا برابر تاخیر نہیں کرتی۔ لڑکی کا ریپ کر کے اسے ابدی نیند سلانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔

یہاں گناہ کو گناہ نہیں مردانہ فخر کا نام دیا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر اس ناول کے ذریعے ایسے ماحول کو سامنے لانے کی سعئ کی گئی ہے جس میں انسان جذبات اور احساسات سے عاری ایک چلتی پھرتی تصویر کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ عقل وشعور انسان کو جینے کا ایک معیار دیتا ہے۔ اور اس کے بنا اگر انسان جیتا بھی ہو تو کٹھ پتلی بن کر دوسروں کے اشاروں کا غلام، بنا جذبے اور احساس کے کسی مثبت تبدیلی سے ناواقف۔

زندگی بڑی تلخ ہوتی ہے انسان کے سامنے ایسے مناظر حقیقت بن کر سامنے آتے ہیں کہ ایک لمحے کو انسانیت سوالیہ نشان بن جاتی ہے۔ امیر امارت کے زعم میں استحصال کرتا ہے تو غریب کو غربت کا ناگ ڈستا ہے تو وہ رشتوں کے تقدس کو پامال کرنے کی کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتا۔ مریم علی بخش کی جنسی ہوس کا نشانہ بنتی ہے۔ تو اس میں مریم کے والد کی غربت بھی پیش پیش ہوتی ہے۔ غربت انسان کو ذلالت کے اندھے کنویں میں

دھکیل دیتی ہے کہ پیٹ بھرنے کے لیے اولادیں بیچنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔
علی بخش کے ہاتھوں مریم کی ہونے والی حالت کو حسن منظر اس طرح سے بیان کرتے ہیں۔ اقتباس:

"جرم کیا ہے؟
نہیں اپنی گھر والی ہے۔ تیری ملکیت ہے۔ جرم کیسا؟
۔۔۔میرا خیال ہے چند گھنٹوں میں ہوش میں آجائے گی۔
وہ بچ جائے گی؟
وہ پسینے میں ڈوبی ہوئی غشی کی حالت میں تھی۔
لڑکی پیلی پڑتی جارہی ہے ارے یہ مر رہی ہے جلدی کرو۔ کچھ کرو لڑکی کو ہسپتال لے جانا پڑے گا۔
آپریشن تھیٹر میں کرنے کا کام ہے"(۳۵)

خواتین کی کسمپرسی اور بے بضاعتی و بے بسی کے یہ مظاہرے ہر دوسرے جاگیر دار گھرانے میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ انسان نے ترقی کے زینے طے کرنے کے لیے متعدد جگہ عورت کو استعمال کیا۔ جبر و استبداد کا پہلا نشانہ عورت ہی کو بنایا گیا۔ انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے ہر ممکن حد تک کوشش کرتا ہے۔ اور اس کوشش میں بسا اوقات وہ ایسے شرمناک اعمال و افعال کا حصہ دار بنتا ہے کہ جنھیں غیر انسانی افعال قرار دینا بجا ہو گا۔

انسانی تاریخ کے طاقتور ترین جذبوں میں سے جنس بھی ایک ایسا جذبہ ہے جس کی تسکین کے لیے انسان ہر حد پار کر لیتا ہے۔ اور حدود سے تجاوز کرنے یا روکنے کی خاطر سماج میں کئی طرح کے اخلاقی و مذہبی اصول و قوانین قائم کیے جاتے ہیں۔ مگر ان تمام اصولوں اور بندشوں کی قید سے باغی ہو کر انسان نے اپنی تسکین کے لیے اکثر اوقات چور راستے تلاش کیے، جن پر چلتے ہوئے کئی نامناسب ادارے قائم ہوئے۔ اور شاید انھی چور راہوں کا نتیجہ طوائف کا

ادارہ بھی ہے۔ طوائف ایسی پیشہ ور عورت ہوتی ہے جو دام کے عوض اپنا جسم فروخت کرتی ہے۔ انسانی زندگی کے جتنے بھی ادوار تاریخ میں دکھائی دیتے ہیں قریباً سبھی میں طوائف کا وجود دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر وی پی سوری کے بقول:

> "تاریخی اعتبار سے اس انسٹی ٹیوٹ کا آغاز کب ہوا یہ کہنا تو مشکل ہے لیکن دنیا کی قدیم ترین روایتوں، مذہبی فن پاروں اور تاریخی دستاویزوں سے اس بات کی شہادت مل جاتی ہے کہ یہ ادارہ ہر دور اور ہر زمانے میں کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے۔"(۳۶)

جسم فروشی کا باقاعدہ آغاز کب اور کہاں سے ہوا؟ اس کا حتمی جواب تو قدرے ناممکن ہے۔ البتہ قرین قیاس ہے کہ (تاریخ میں درج شدہ واقعات کے مطابق قدیم ترین انسانی تہذیب سومیری تہذیب کہلاتی ہے) طوائف کا کاروبار بھی اس قدیم تہذیب کے ساتھ یونان کی سرزمین پر متعارف ہوا۔ جو بعد میں آنے والی ہر نئی تہذیبوں کے ساتھ اس کا حصہ بنتا چلا گیا۔ ابتدائی تاریخ میں عورت کی عصمت دری کرنے کے بعد احساس جرم سے خود کو بچانے کے لیے مذہب کا سہارا لیا جاتا۔ اور اس طرح مذہب کی آڑ میں عورت کی عصمت کا استحصال باقاعدگی سے کیا گیا۔

خاص طور پر برصغیر کے حوالے سے بات کی جائے تو یہاں طوائف کے لفظ کے ساتھ ہی عیش و نشاط کے ایسے دلکش تصورات دکھائی دیتے ہیں۔ جو امرا اور رؤسا کی بدولت زیادہ پرکشش و پر آسائش ہو گئے تھے۔ برصغیر کی تاریخ میں لکھنوی تہذیب عیش و عشرت کی جس فضا کو سامنے لاتی ہے اس کا محور و مرکز طوائف تھی۔ یہ وہ دور تھا جبکہ طوائف علم و ہنر کی ماہر گردانی جاتی تھی۔ زندگی کے طور طریقے اور ادب و آداب کے سب گُر جانتی تھی۔ مخصوص ادوار میں ادبی ذوق کی حامل اس ہستی کو درباروں کی سرپرستی حاصل رہی۔ مگر گزرتے زمانے کی دھول سے جہاں باقی نشان مٹے وہیں طوائف کو بھی بے مول کرنے میں زیادہ وقت نہ لگا۔ بہت جلد یہ انمول شے بے مول بکنے لگی۔

اسی بنا پر قدیم کی نسبت جدید طوائف نہ تو خوش حال رہی اور نہ ہی باقاعدہ رئیسانہ زندگی اس کے حصے میں آئی۔ آج کی بے مول طوائف ان تلخ حقائق کو سامنے لاتی ہے۔ جس کی حقیقت سامنے آنے پر نام نہاد شریف طبقہ منہ چھپاتا ہے۔ قدیم دور کے اڈے بند ہوئے تو ہر گھر سے ایک طوائف نکلتی دکھائی دی۔ وجہ کچھ بھی ہو، مرد کی بیگانگی، غربت، بیوگی اور ملازمت کی آڑ میں عصمت دری کا شکار ہونے والی عورتیں گھر سے دور طوائف کی صورت میں اپنی دنیا بسانے کی ناکام کوشش کرتی ہیں۔ ایسی ہی کامیاب و ناکام کوشش کو یونس جاوید نے 'کنجری کا پُل' میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ تین خوبصورت جوان زادیوں کی کہانی۔ ظہرہ مشتاق، صبا زادی اور فیروزے کے نام سے

طوائف کی صورت جلوہ گر ہوتی ہے۔ تینوں اپنے دور عروج میں ہر صاحب حیثیت انسان کے دل کا سکوں رہیں۔ اور جو نھی ان کے کام نکل گئے، یہ عبرت کا نشان بنادی گئیں۔

خاص کر ناول "کنجری کا پُل" کے تناظر میں طوائف کی ابتدائی زندگی پر بات کی جائے تو چند بنیادی سوالات جو ہر دور کی طوائف کے حوالے سے ادب کا حصہ بنتے آئے ہیں۔ کہ آیا طوائف کی زندگی اس کی اپنی مرضی سے ایسی ہوتی ہے؟ کیا اس طرز زندگی میں معاشرے کا کوئی حصہ نہیں ہوتا؟ اس میں شک نہیں کہ یہ ایسی دنیا ہے جس میں قدم رکھتے ساتھ ہی ایک ڈھلوان راستہ ایسا سامنے آتا ہے جس پر بنا کسی تگ و دو کے انسان ڈھلکتا چلا جاتا ہے۔ واپسی مشکل ہی نہیں قدرے ناممکن ٹھہرتی ہے۔ کہیں طوائف کی بیٹی طوائف بنتی ہے تو کہیں اغوا شدہ لڑکیاں اس اندھیر نگری کا حصہ بنادی جاتی ہیں۔ دور دراز علاقوں سے عورت کی خرید و فروخت کرنے والے بھی اس پیشے کو فروغ دینے کا موجب بنتے ہیں۔ مگر ان کا نام کبھی سامنے نہیں لایا جاتا۔ کیونکہ وہ معاشرے کا عزت دار طبقہ ہوتا ہے۔ اور عزت داروں کے نام یوں سر راہ نہیں لیے جاتے۔

ظہرہ مشتاق کی بیٹی مہر النساء دیوان عاشق حسین کا خون تھی۔ ماں نے ظہرہ محل میں رکھ کر اسے ان کالے دھندوں سے بچائے رکھا۔ مگر اس گناہ سے نہ بچا سکی۔ جو اس کے حصے میں دنیا کے عزت داروں نے لکھ دیا تھا۔ دیوان عاشق حسین کے بیٹے ہی سے بیاہ رچا کر ساری زندگی ماں کو ماضی کا پچھتاوہ دے گئی۔ انسانی بے بسی کی عجب کہانی کہ ایک موقع پر آکر طوائف کی اپنی اولاد بھی دنیا کے ساتھ مل کر اس کے استحصال کا موجب بنتی ہے۔ ظہرہ، فیروزے اور صبازادی کی کہانی بیان کرتے ہوئے مصنف اپنی زبان سے جو دعائیہ کلمات ادا کرتا ہے وہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں:

> "رب قدیر! اگر سب کے لیے آسانیاں، رزق اور آسودگیاں برابر نہیں کی جا سکتیں تو پھر ان خوبصورت، محروم اور بے بس اور مجھ جیسے افراد کو پیدا کرنا بند کر دے، جبر اور جگراتوں سے لدی پھندی حسین چہروں اور توانا ترشے ہوئے بدنوں والی فیروزاؤں، صبا زادیوں اور زریناؤں کو اس حد سے کالی، بے عزت اور حاویہ دوزخ جیسی جلتی دنیا میں اب نہ بھیجنے کا حکم صادر فرما۔ اے قادر و عادل "کن" کہہ دے۔۔ فیکوں "ہو جانے دے"[۳۷]

کن کہہ دے فیکون ہو جا ۔ گو یا انسانی استحصال کی تاریخ کا سلسلہ مفقود ہو جائے۔ اور ایسا ہو جائے گا تو دنیا واقعی امن و امان کا گہوارہ بن جائے گی۔ پھر عزت دار طبقہ کی جوتیاں سیدھی کرنے والے ناپید ہو جائیں گے۔

قبول صورت ظہرہ مشتاق بھلے وقتوں کی گریجویٹ، مگر غریب ہونے کی بنا پر ایسے انسان سے باندھ دی جاتی ہے جو بھاری جیب تو رکھتا تھا مگر زندگی کے شعور سے ناواقف تھا۔ دنیا کا معیار دولت تھا۔ سو اسی معیاری ترازو میں تول کر ظہرہ مشتاق کی ذات کو قیمتی اور جوانی کو بے مول کر دیا گیا۔ زندگی کے نایاب دو سال مشتاق مالی کی چاکری میں بسر کیے۔ مگر اگلے ہی کچھ عرصے میں اپنی حیات کو بے مول ہوتے دیکھ کر 'ڈیزائن گھر' کے نام سے بوتیک کھول لیا۔ کپڑوں کی کانٹ چھانٹ کی سوجھ بوجھ رکھنے والی ظہرہ انسانوں کی کانٹ چھانٹ کرنے کی ماہر ہو گئی۔ اپنی ذات کو منوانے کا ہنر جان چکی تو خود کو ماڈل کے روپ میں دنیا کے سامنے پیش کر کے چاہنے والوں کی تعداد میں مزید اضافہ کر لیا۔ دنیا قیامت کی چال چل رہی تھی اس سمے ظہرہ نے بھی اپنی چال میں بدلاؤ لایا اور ڈیزائن گھر کے ساتھ ہی باقی لوازمات زندگی کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جانے لگا۔ جس کی بدولت اس پریڈ میں فیشن پرست اور جنس پرست عورتیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔

ظہرہ اب وہ بے زبان اور مجبور عورت نہ رہی تھی۔ تازہ ہوا کے جھونکے نے اس کی زندگی کو خوشگوار احساس عطا کیا۔ اور فیشن کی بھیڑ چال میں دوسرے متوالیوں کی طرح جیت ہر میدان میں اس کا مقدر بنتی چلی گئی۔ قبول صورت ظہرہ مشتاق نے اپنے آپ کو ماڈل کے روپ میں متعارف کروا کر کئی پرستار بنا لیے۔ ڈیزائن گھر کے ساتھ فیشن کی دنیا میں متعارف ہونے والے دیگر کام اپنانے پر ظہرہ مشتاق کے لیے زمین، آسمان بنتی چلی گئی۔ ہر نئے دن کا نکلتا سورج اس کے لیے نئے جہاں کھول رہا تھا۔ زندگی کے کئی اسرار کھل رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے چال بھی وہی چل رہی تھی اور مقدر بھی وہی لکھ رہی تھی۔ فاتحانہ زندگی کی انوکھی دنیا ظہرہ مشتاق کی منتظر تھی۔ پوش علاقے میں سافٹ ڈرنک سے شروع ہونے والا سفر اب ڈرنکس اپنا کر نئی چال چلنا روز کا معمول بن گیا۔ حساب و کتاب کی دنیا میں کئی مہ و سال آنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ محض چند ماہ اور چند ہی روز کے سفر نے ظہرہ مشتاق کو مشتاق مالی سمیت دیگر کئی نو دولتیوں کے برابر لا کھڑا کیا۔

عورت کے وجود کا انکاری مرد اس کی ذات کی نفی کر کے دلی تسکین حاصل کرتا ہے۔ مشتاق مالی اپنی دولت کے زعم میں ایک پڑھی لکھی شریف عورت پر ہر قسم کی دسترس رکھتا تھا۔ گزرتے وقت نے تقدیر کا قلم جس کے ہاتھ میں تھمایا وہ اب کی بار ظہرہ تھی۔ دو سال دو ماہ بعد واپس آنے والے مشتاق مالی کے ہاتھ میں نوٹوں سے بھرا بریف کیس اب کی دفعہ کسی کی نگاہوں کا مرکز نہ بن سکا۔ بدلے حالات و اطوار دیکھ کر مشتاق کے ہوش اڑے۔ اپنی فطرت اور مردانگی کا استعمال کرنے کی جسارت کی تو ناکام ٹھہرا۔ مسترد ہونے پر کڑکا ضرور مگر کچھ بن نہ پڑا۔ خود کو منظر

سے غائب ہوتے دیکھا تو جھک کر رکھوالی کر لینا بہتر جانا۔ زیر دست رکھنے والا مشتاق مالی اب کی بار خود زیر دست ٹھہرا۔

"۔۔۔ کراچی کے کمفرٹس ٹاور کے فلیٹ نمبر ۱۴۴ سے عجیب قسم کی بو پھیلنے کی اطلاع پولیس کو دی گئی۔۔۔ دروازہ توڑ کر دیکھا گیا اندر لاشوں میں کیڑے چل رہے تھے اخبار میں لاشوں کو نوجوان اور خوبرو عورتیں لکھا گیا تھا۔۔۔ دونوں کو سخت اذیت دے کر اور کرنٹ لگا کر ہلاک کیا گیا تھا۔"(۳۸)

رنگوں اور خوشبوؤں کی دنیا کی باسی بہروپیوں کی اصلیت سے واقف نہ ہو پائی قانون فطرت ہے کہ جب کھانے کی قلت ہو اور بقا مفقود ہو رہی ہو تو بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو نگل جایا کرتی ہے۔ جام مصدق فیروزے کے توسط سے نہ جانے کتنے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ دشمنوں کی فہرست میں کمی آئی تو فیروزے کی ذات جام کو کانٹا بن کر چبھنے لگی۔ اس سے قبل کہ یہ کانٹا تکلیف دیتا توڑ کر پھینک دینا بہتر تھا۔ جام کی خواہش کے مطابق وہ لوگوں کو شراب پلا کر مارا کرتی تھی۔ ایک لاچار و بے بس طوائف کی اس معاشرے میں کیا اوقات ہو سکتی ہے۔ وہ لوگوں کے اشاروں پر ناچنے سے انکار کرے تو مار دی جاتی ہے۔ صرف موت ہی نہیں اندوہناک انجام اس کا مقدر بنا دیا جاتا ہے۔ طاقتور طبقہ اپنے انتقام، خوف اور بزدلی کا بدلہ عورت سے لے کر خود کو بہادروں کی صف میں شمار کرتے ہیں۔ یہ کیسے بہادر ہیں؟ جن کے کالے دھندوں کی لپیٹ سے کوئی ادنٰی وارفع محفوظ نہیں رہتا۔

بارہا دوغلی مردانہ قدروں کا ہدف بننے والی فیروزے کا انجام بھی اسی قدر دردناک ٹھہرا جس قدر ابتدا۔ مردانہ بالادستی کے معیار پر قائم کردہ معاشروں میں عورت کی آخری منزل اس کی ہیبت ناک موت ہی ٹھہرتی ہے۔ گھر میں مرد وحشت و بربریت اور باہر ہوس زدہ چہرے لیے ان کا بھرپور استحصال کرتے ہیں۔ فیروزے کی پہلی بار قیمت باپ کے گھر میں تین ہزار روپے کلو کے حساب سے لگی۔ باپ نے لاکھوں روپے لے کر بیٹی کو ایک انجان مرد کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ وہ اسے ساتھ لیے واپسی کے در ہمیشہ کے لیے بند کر آیا۔ اس کا مان سمان باپ تھا۔ باپ کے ہاتھوں بکی تو دنیا نے بھی اپنا حصہ وقتاً فوقتاً ڈالا۔ اور قیمت لگتے لگواتے وہ ظہرہ محل آ پہنچی۔ جہاں آئے دن دولت کے پجاری اپنی دولت لٹاتے اور ہوس کی آگ بجھاتے۔ ایسے زندگی کا سفر چلتا رہا۔ مگر 'ظہرہ محل' کی ظہرہ اب اپنے حال سے تھک کر گمنامی کی زندگی تلاشنے لگی۔ خود کو بابا عطار کی مریدی میں دے کر باقی سب کو بھی اس دھندے سے روکنے لگی۔ مگر وہ فیروزے ہی کیا جو خطروں کی کھلاڑی نہ ہو۔ وہ تو لہو کے ابلنے کا تماشا دیکھنے کی خواہشمند تھی۔ جوگن بن کر دنیا کی رنگینی سے کنارہ کشی اختیار کر لینا اسے گوارا نہ تھا۔ خطروں کی کھلاڑی کی اپنی ذات کھلواڑ بن گئی۔ جام

مصدق کے دشمنوں میں سلمان کا شمار ہوتا تھا۔ اور سلمان کو مارنے کے لیے اس کا دل رضامند نہ ہوا۔ مگر بچایا بھی تو کتنی دیر۔ موت کا فرشتہ دونوں کی تاک میں تھا۔

جوگ اور روگ پالنا طوائف کے لیے نہیں تھا۔ اور یہی وہ ظہرہ کو بولتی آئی تھی۔ مگر آج جب سلمان کے نام کا روگ پالا تو جوگن بن کر موت سے ہمکنار ہوئی۔ مختصراً فیروزے، صبازادی اور ظہرہ کے کردار معاشرتی جبر واستحصال کے کئی پہلو واکرتے ہیں۔

طوائف بری بنتی ہے کیونکہ وہ برے کام کرتی ہے۔ وہ معاشرے کی دھتکاری ہوئی رذیل مخلوق ہے مگر ان چہروں کا کیا جو دکھتے کچھ ہیں، ہوتے کچھ اور ہیں۔ منافقانہ زندگی بسر کرنے والوں کے لیے معاشرہ کوڑوں کی سزا نہیں سناتا۔ انھیں دنیا کی کوئی عدالت سنگساری کا حکم نہیں سناتی۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو طوائف کو بدکاری سے بچنے کا درس دیتے ہیں۔ ان کے مطابق وہ جدوجہد کا محاذ تو جیت سکتی ہیں مگر اخلاق کا ہار جاتی ہیں۔ کوئی وجہ جانے تو اندازہ ہو کہ اخلاق اور جدجہد میں ان عقیدت مندوں نے فرق کیا اور کیسے قائم کرر کھا ہوتا ہے؟

ہمارے معاشرے میں یہ رویہ عام پایا جاتا ہے کہ عورت اپنی مرضی و منشاء سے اس پیشے کو اختیار کرتی ہے۔ یہ بات تو کسی حد تک قابل قبول ہے کہ عورت اس پیشے سے ایک بار وابستہ ہو جانے کے بعد اس سے چھٹکارا کبھی نہیں پاسکتی۔ مگر جہاں تک اس سے وابستگی کی بات ہے تو اس پر کبھی کسی صاحب بصیرت نے غور نہیں کیا کہ عورت اگر عزت دارانہ زندگی کو خیر باد کہتی ہے تو اس کے پیچھے کیا وجوہات ہو سکتی ہیں؟ ادب کی دنیا خاص کر ناول اور افسانہ زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان ہوتے ہیں۔ دونوں اصناف کی تاریخ کھنگال کر دیکھی جائے تو کہیں بھی کسی مصنف کے ہاں ایسی تحریر نہیں ملتی جس میں عورت اپنی مرضی سے اس پیشے کو اختیار کرتی ہوئی دکھائی گئی ہو۔ طوائف کو برا بھلا کہنا، اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھنا عزت دار معاشرے کا ہر فرد اپنا اولین فریضہ سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس کسی صاحب عقل و دانش نے لمحہ بھر کو رک کر اس بات پر توجہ نہیں دی کہ عورت اگر بازار کی زینت بنی تو اس کی وجوہات کیا تھیں؟ وہ اپنی عزت و ناموس کو سربازار لا کر بیچتی ہے تو کیوں؟ طوائف کا بستر اگر شارع عام بنتا ہے تو اس کے پیچھے کون سے مسائل ہیں؟۔

حقائق پس پردہ رہے اور من گھڑت کہانیاں اپنی جگہ بناتی ہوئی حقائق کا روپ دھارنے لگیں۔ حقائق سے منحرف معاشرے میں داستانیں ہی پروان چڑھا کرتی ہیں۔ "تھورو کہتا ہے۔ سچ کے لیے دو آدمیوں کی ضرورت ہے۔ ایک وہ جو سچی بات کہے اور ایک وہ جو اسے سنے۔ اور یہ فضا ہمارے ہاں سرے ہی سے ناپید ہے"۔[۳۹]

سچ جاننے اور سننے کا حوصلہ عزت دار طبقہ کہاں رکھتا ہے۔ معاشرے کے قوانین انہی کی بدولت بنتے اور بگڑتے ہیں۔ عزت دار طبقہ کے لیے طوائف اس وقت اچھی عورت بن جاتی ہے جب وہ رات کے اندھیرے میں اپنی تسکین حاصل کرنے کے لیے ان قمقموں بھری عمارت کا رخ کرتا ہے۔ بھری محفل میں طوائف ایک بری عورت ہے۔ مگر چوری چھپے اس کا جسم خریدنا کوئی برائی نہیں۔ بازار حسن میں جا کر اپنی مردانگی دکھاتے ہیں۔ عصمت کا استحصال کرنے والوں کو یہ سوچ نہیں آتی کہ اسے بازار کی زینت بنانے والے بھی یہی بیوپاری ہیں۔ کبھی کسی دردمند دل نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اعتبار اور عزت کی چادر اوڑھ کر چلنے والی بیٹی اگر آج سر بازار اپنی عزت کا سودا کر رہی ہے تو اس کے محرکات کیا ہیں۔ طائفہ ہمارے معاشرے کی دھتکاری ہوئی عورت ہے۔ جب تک بازار کی زینت بنی رہے ہاتھوں میں گجرے تازے رہتے ہیں۔ گالوں کی لالی کبھی ماند نہیں پڑتی۔ مگر اعتبار کی دہلیز پر قدم بڑھاتے ہوئے بازار کو خیر باد کہہ بیٹھے تو اس کا وجود بوجھ بن جاتا ہے۔ قابل قبول تو وہ پہلے ہی کہاں ہوتی ہے۔ مگر کسی ہٹ دھرم رانجھے کی ونجلی کی تان پر رقص کرتے ہوئے بازار حسن سے عام انسانوں کی دنیا میں قدم رکھ لے تو چبھتی نگاہیں اسے واپسی کا سفر کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

> "ابھی تو وہ طوطی جان کی جگہ لینے والے اپنے نئے نام کے ساتھ ٹھیک سے مانوس بھی نہیں ہو پائی تھی اور ابھی زنان خانے کی دیواروں کے ساتھ پہچان کا عمل پورا نہیں ہوا تھا کہ وہ اچانک سے کھلے میدان میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ اب جو مرضی آندھیوں کی وہی اس کی"۔ (۴۰)

طوطی جان (مشمولہ: گرد باد) چودھری افضل کی محبت میں گرفتار ہوئی تو قول کے سچے اس انسان کا ساتھ طوطی جان کی زندگی میں بہت کم مدت رہا۔ چودھری افضل کے قتل پر آہ وزاری کرنے والوں میں وہ بھی شامل حال تھی۔ سوتنوں کے ساتھ کلائی کی چوڑیاں طوطی جان نے بھی توڑیں۔ بین کی صداؤں میں اگر بلند کوئی ایک صدا تھی تو وہ طوطی جان کی تھی۔ کیونکہ یہ وہ لمحہ تھا جب اس کے سر سے صرف چادر ہی نہیں سر کی تھی بلکہ قدموں تلے سے زمین بھی اچکالی گئی تھی۔ بارہا کوششیں ناکام رہیں۔ عزت دار لوگوں کی چبھتی نگاہیں

اسے ہر پل یہ پیغام دیتیں کہ کلائی کی چوڑیاں توڑ دینے اور بیوگی کا روگ پال لینے سے رقاصہ کا نام اس کی ذات سے ہٹنے والا نہیں۔ ناچ گانے کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد اب استحصال ہی اس کا ساتھی ہے۔

"سنو بی بی سر کے سائیں کے ساتھ ہی تمہارا مان مقام بھی گیا۔ اب رونے دھونے کی رسم پوری کرو اور یہاں سے چلتی بنو"۔ (۴۱)

یہ ہے ہمارے عزت دار معاشرے کی حقیقت کہ طوائف اگر اعتبار کے سہارے شریفانہ زندگی کو خوش آمدید کہتی ہے تو اس کی ہم جنس برادری بھی اسے ایسا کرنے سے روک دیتی ہے۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے بارہا ماضی یاد کرایا جاتا ہے۔ جس کی جانب لوٹ جانے کا فیصلہ کرنا طاقتور کی فتح اور مظلوم کی ناکامی ٹھہرتی ہے۔

یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ معاشرے کے عزت دار لوگوں نے فاتح بن کر جشن منا لیا۔ ایک بے سہارا سے اس کی بیساکھیاں چھین لیں۔ اسے تیز آندھی کے جھونکوں کے حوالے کر کے بھی خاموش نہیں بیٹھے۔ بلکہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں! ہم نہ کہتے تھے ان کوٹھے والیوں کے خون میں وفا شامل ہی نہیں ہوتی۔ یہ اپنے ماں باپ کی نہیں ہوتیں تو کسی اور کی کیا ہوں گی۔ عام سے عام بندہ بھی بڑا ناقد بنا اپنی رائے دینے میں مصروف ہو گا۔ مگر کوئی اس بات پر غور نہیں کرے گا کہ جانے والا سب کچھ ہو سکتا ہے ضروری نہیں کہ وہ بے وفا بھی ہو۔ لیکن عمومی رویہ وہی ہوتا ہے جسے ہم استحصال کہتے ہیں۔ اپنی سوچ مسلط کر کے طوائف کو برا اور بد کردار ثابت کرنا۔

ابتدا سے لے کر انتہا تک طوائف کی تقدیر لکھی لکھائی ہوتی ہے دنیا کہیں کی کہیں پہنچ جائے یہ ذلت آمیز زندگی سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پائے گی۔ جسم فروشی کا مکروہ فعل ترک کر کے فن کا بیوپار کرنا چاہے تو کوئی اسے نکلنے میں مدد نہیں کرتا۔ مگر یہاں ایک اور متضاد صورتحال پیدا ہوتی ہے کہ اگر عورت طوائفیت چھوڑ کر رقاصہ یا گائیکی کی دنیا میں آئے گی تو کیا لازم ہے کہ اس کی تقدیر بدل جائے گی؟ وہ حرافہ اور گشتی جیسے الفاظ سے مخاطب نہیں کی جائے گی۔ لوگ اسے اپنے ساتھ عزت سے بیٹھنے کی اجازت دیں گے؟ کیا کوئی وڈیرہ امیر وقت یا رئیس اسے اپنا نام دے کر فخر محسوس کرے گا؟ ہر گز نہیں کیونکہ:

"فحش کے کاروباری۔۔۔ ہمارے معاشرے کے چہرے پر کوڑھ کے زخم سے کم نہیں۔۔۔ لیکن رقص و موسیقی فنون لطیفہ ہیں۔۔۔ فنون لطیفہ عالیہ رقص موسیقی کے

کمالات نے جسم فروشی کی لعنت سے اب تک کیوں نجات حاصل نہیں کی اور اعلیٰ درجے کی مغنیہ ور قاصہ کے لیے زانیہ ہونا کیوں ضروری ٹھہر گیا"۔ (۴۲)

دنیا میں آج تک جتنے بھی پیشے متعارف کرائے گئے، ان میں سب سے قدیم شاید جسم فروشی ہی ہے۔ کرہ ارضی پر سب سے پہلے جس جنس کی خرید و فروخت ہوئی وہ یہ جنس تھی۔ عصمت فروشی کی تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ طوائف کو ابتدائی ایام میں مذاہب اور بعد میں سلاطین وامرا کی سرپرستی حاصل رہی۔

کہا جاتا ہے کہ برائی افلاس کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ انسان جتنا غریب ہو گا اتنا ہی رذیل اور گھٹیا کام کرنے پر آمادہ ہو گا۔ اس کا نفس ہر سو اسے برائی کی جانب دھکیلتا ہے۔ طوائف کے لیے تو یہ بات کسی حد تک قابل قبول ہے کیونکہ ان کا اس پیشے سے وابستہ ہونے کی کئی وجوہات میں سے ایک وجہ پیٹ کی بھوک بھی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے خریدار کے لیے نہیں۔ کیونکہ اس کا خریدار اگر غریب ہے تو خالی جیب چاؤ نہیں اٹھائے جاتے۔ پیٹ کی بھوک اگر سر چڑھے تو محبت بھرے الفاظ زبان سے ہر گز نہیں پھسلتے۔

پیٹ کی بھوک روٹی مانگتی ہے حور نہیں۔ اس کے برعکس تاریخ کے اوراق کھنگالے جائیں یا طوائف کی تاریخ، ہر طرف حقائق بڑے تلخ مگر دلچسپ سامنے آتے ہیں کہ طوائف کا معاشرتی مقام متعین کرنے والا شریف طبقہ ہی ان کے اضافے کا سبب بھی بنتا ہے۔ ایک طرف ان کے وجود پر لاحول پڑھتے ہیں تو دوسری جانب رات کی سیاہی پھیلتے ہی اپنی گاڑیاں اس بازار کی جانب سرکانے لگتے ہیں۔ اگرچہ بڑی مضحکہ خیز مگر حقیقت یہ ہے کہ عورت اگر طوائف کا روپ دھاری تو اس کے پس پشت کوئی بڑی طاقت ہی تھی۔ امیر شہر متعدد حیلے بہانوں سے غریب و بے سہارا کو لوٹتا اور ان کا استحصال کرتا آیا ہے۔

طوائف کا استحصال جہاں اس کی عصمت کا کھیل رچا کر کیا جاتا ہے وہیں جذبہ شوق کے ذریعے بے اعتباری کی سولی پر بھی چڑھایا جاتا ہے۔ محبت و اعتبار کے نام پر بلی چوہے کا ایسا کھیل کھیلا جاتا ہے جس کا انجام انتہائی بھیانک اور کرب ناک ہوتا ہے۔ نتیجتاً نقصان اور اذیت کے لیے جس جھولی کا انتخاب کیا جاتا ہے وہ صرف طوائف ہوتی ہے۔ اقتباس:

"مجھے جلد ہی معلوم پڑنے ولا تھا کہ کوئی بھی کام تا دیر نہیں کیا جاسکتا۔ کار دیوانگی بھی نہیں۔۔۔(آہ شمو تو نے اپنے ساتھ اچھا نہیں کیا!) میں تو نشے کی ڈول میں لڑکھڑاتی ہریالی

زمینوں کی سیر پر نکلی تھی پھر یہ کیا ہوا اور وہ بھی اتنی جلدی؟ اتنی اچانک؟۔۔۔اور پھر میرا خمار ٹوٹنے لگا۔ اب کچھ کچھ دیکھنے اور سننے لگی تھی۔۔۔ گشتی۔۔۔ کنجری۔۔۔ حرافہ۔۔۔ حرام کی جنی۔۔۔ طوائف۔۔۔۔۔نالی کا کیڑا۔۔۔۔ القابات تھے جو زنان خانے میں میرے تذکرے کے دوران ٹانکے جانا ضروری سمجھے جاتے تھے"۔ (۴۳)

اس میں شک نہیں کہ معاشرہ جب سے طوائف "نام سے واقف ہوا اس کردار کا استحصال کرنے لگا۔ قدما سے لے کر جدید دور تک انسانی زندگی بے پناہ تبدیلیوں سے گزری اس مفلوک الحال ہستی کی زندگی کے مراحل کہیں زمانے کی گرد میں کھو گئے۔ اس کی زندگی کی عمارت آج بھی استحصال کے ستونوں پر قائم ہے۔ آج کی طوائف کے ساتھ بھی وہی ہو رہا ہے جو ابتدائی طوائف کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ جسم فروشی کے دھندے میں ڈالنے والا معاشرہ اس دلدل میں دھنسی عورت کو ہاتھ دے کر نکالتا نہیں بلکہ ہاتھ دکھا کر الٹا دھکا دیتا ہے۔ جس سے اوپر آنے کی بجائے وہ پاتال میں جا گرتی ہے۔

لگن کسی طرح کی ہو ایک بار لگ جائے تو انسان نتائج کی پرواہ کیے بنا بڑھتا چلا جاتا ہے۔ کسی کے کہے سنے کی پرواہ کب ہوتی ہے۔ وہ ہستیاں بھی قابل اعتبار ٹھہرتی ہیں۔ جو ازل سے بیچ راہ چھوڑ جانے کی عادی ہوں۔ مقصد کو پا لینے کی دھن میں اپنوں کی نصیحتوں پر کون کان دھرتا ہے۔ آنکھوں دیکھی بربادی بھی یاد نہیں رہتی۔

وہ پہلی طوائف نہیں تھی جو اعتبار کی منزل سے ٹھوکر کھا کر گری تھی۔ ہر دور کی طوائف کے ساتھ یہی ہوتا آیا تھا۔ طوائف اس بازار میں لائی جاتی ہے مگر لے جانے کے لیے کوئی نہیں آتا۔ اس حقیقت سے کون واقف نہیں سب کچھ جان لینے کے بعد بھی وہ پھر سے اعتبار کر بیٹھی۔ نتیجہ کیا نکلا وہی بربادی۔ کیونکہ اسے بتایا گیا تھا کہ جس جگہ کی مقیم ہے۔ اس کے لیے باہر ہوا گھٹن زدہ ہے۔ باہر نکلے گی تو دم گھٹتا چلا جائے گا۔ راہ فرار نہیں اس کی قسمت میں۔ کبھی بھولے بسرے کوشش کر بیٹھی فرار کی تو منزل نہیں ملے گی۔ بھٹکتی، لڑکھڑاتی یا تو گورکا رخ کرے گی یا پھر واپس اسی پاتال میں آ گرے گی۔ لہذا جہاں ہے وہیں رہے۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اور پھر ساری عمر گرم ہوا کے تھپیڑے سہنے پڑیں گے۔ اتنا سب کچھ جان لینے کے بعد بھی کتھک کا

ہنر حاصل کرنے کی خواہش اسے ملک فلانے پر اعتبار کے لیے اکسائے جا رہی تھی۔ اور بالآخر اعتبار کی راہ پر چلتے ہوئے کیا ملا؟ وہی جو آج تک طوائف کو ملتا آیا۔ رسوائی، بربادی، سر بازار عزت کی نیلامی اور بھلا کیا دے سکتے تھے؟ دینے والے۔ ان کے پاس ایسی عورت کو دینے کو ہوتا بھی کیا ہے؟ کیونکہ یہ معاشرہ تو عزت داروں کا معاشرہ ہے اور ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے کہ اعتبار کی راہ پر چلاؤ اور پھر گہری کھائی میں دھکا دے دو۔

امراورؤسا کی زندگی کی دوڑ ان کی خاندانی عورت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ جب چاہتی ہے کسی کو بھی اس کی زندگی سے بے دخل کر سکتی ہے۔ تاریخ ایسے حقائق سے بھری پڑی ہے لیکن انسان ہے نا جب تک خود پر نہ بیتے کہاں عقل آتی ہے۔ ملک فلانا اس معصوم کلی کو اعتبار کے جھانسے میں کوٹھے سے اٹھا کر لایا مگر صرف اپنی ہوس کی آگ ٹھنڈی کرنے کو، نہ نام دے سکا، نہ ہی خواہش پوری کرنے میں ساتھ دیا۔ جب دل کیا اسے حویلی سے باہر جانے کا بول دیا۔

شمو اس کا چہرہ تکے جا رہی تھی کہ یہ وہی ملک فلانا ہے جو اس کی خاطر جان سے کھیل جانے والا تھا۔ بہر حال جو بھی تھا۔ وہ ایک طوائف تھی اور طوائف اپنا جسم پیش کر کے اس معاشرے کے عزت دار طبقہ کی ہوس کی آگ بجھانے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ ایک نے زور زبردستی سے اٹھوالیا تو دوسرے نے اپنی ناکامی کا بدلا لینے کے لیے اسی شمو کو ہی گلیوں میں ننگے بدن پھروایا۔ یہ عزت داری بھی کیا شے ہے اپنے برابری کے لوگوں سے بے عزتی کا بدلا لینا ہو تو بھی نشانہ طوائف ہی بنتی ہے۔

iii. نائن الیون اور انسانی استحصال:

ادب سدا سے انسانی زندگی اور سماج کے حقائق کا ترجمان رہا ہے۔ ادب نے جہاں محبت جیسے لطیف جذبات کی عکاسی کی وہیں عصری مسائل اور سانحات کو بھی اپنے اندر سمویا۔ عصر حاضر میں ناول کے حوالے سے متنوع موضوعات سامنے آتے ہیں۔

اکیسویں صدی میں دیگر آفات کی مانند نائن الیون کا واقعہ درد انگیزی کی اتھاہ گہرائیاں لیے ہوئے تھا۔ یہ ایسا سانحہ تھا جس نے انسانی زندگی کے امن کو تہہ وبالا کر دیا۔ پوری دنیا کو ایک لمحے کے لیے ہلا کر رکھ دیا۔ دیگر ممالک کے ساتھ ساتھ اسلامی دنیا پر اس کے منفی اثرات زیادہ دکھائی دیئے۔ سانحے کے نتیجے میں شائع ہو

نے والی بے شمار کتب کا موضوع مغرب اور اسلام رہا۔ حقائق کو غلط رنگ دے کر بیان بازی کی وجہ سے اسلام اور مغربی ممالک میں تصادم پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ دہشت گردی، بنیاد پرستی خاص کر شدت پسندی جیسے جذبات کو مسلمانوں کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا گیا جس کا نقصان یہ ہوا کہ مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کے لیے صورتحال بحران کی شکل اختیار کر گئی۔ کامران کاظمی کے بقول:

"۹/۱۱ کے بعد یک قطبی ہو جانے والی دنیا مزید امریکی سامراج کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ اس صورت حال میں پاکستانی سماج بالخصوص عالمی اور علاقائی حالات سے شدید متاثر ہو رہا ہے۔ پاکستان کی سرحدوں پر عسکریت پسندوں کا دباؤ، فرقہ واریت، نسلی و لسانی تنازعات، قبائلی جھگڑے جدید ناول کا موضوع ہیں"۔ (۴۴)

۱۱ ستمبر کے واقعہ کو بنیاد بنا کر فرقہ واریت اور تعصب کی بے بنیاد جنگوں کا آغاز کیا گیا۔ ایسی جنگیں جن میں نشانہ تہذیبیں بنی۔ تہذیبی بنیادوں پر لڑی جانے والی جنگوں سے محض چند ممالک محفوظ رہ پائے۔ یہ ایسے ممالک تھے جو قدرے بڑی تہذیبوں کے نمائندے شمار کیے جاتے تھے۔ نائن الیون نے انسانی تاریخ کا رخ ایک نئے دھارے کی جانب موڑ دیا۔ ڈاکٹر مجاہد کامران:

"عوامی ذہنوں کی طنابیں کھینچنا ہی اشرافیہ کی حکمت عملی کا ضروری جزو ہے۔ جس کی بنا پر وہ نئے عالمی نظام کا قیام عمل میں لانا چاہتے ہیں۔۔۔ محض عوام کو دھوکا دے کر ہی یہ اشرافیہ (The Elite) اس کرہ ارض پر قبضہ جمانے اور یہاں حکومت کرنے کے لیے اپنی کاروائیاں سرانجام دیتا ہے"۔ (۴۵)

نائن الیون کے سانحے نے اسلامی ممالک خاص کر پاکستان کی سیاسی اور معاشی طرز فکر کو غیر یقینی حد تک متاثر کیا۔ بم دھماکوں کا ایک نہ ختم ہونے والا طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ خاص کر مدارس اور مساجد کو نشانہ بنا کر مذہبی ساکھ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ تعلیمی اداروں میں نوجوان نسل کو نشانہ بنایا گیا۔ یہ وہ دور تھا جب کئی صدیوں پر مشتمل زندگی کی بساط الٹا کر مشرق و مغرب کے مابین ایک نیا رشتہ استوار کیا گیا۔ گیارہ ستمبر کے دن کو عہد جدید کی تاریخ کا اہم ترین مانا جانے لگا۔ کیونکہ اس دن دنیا میں دو بلند و بالا عمارتوں کا گرنا

ایسی تخریب، جس کی بنیاد پر نئی تعمیر کے درواہونے تھے۔یہ واقعہ جہاں ایک عہد کی فصیل بناوہیں دوسرے عہد کا دروازہ بنایا گیا۔

"ہم سب انسان ہیں" کے آئیڈیل بیانیے پر قائم ہونے والی عالمگیریت میں فاصلے اس وقت دکھائی دینے لگے جب دو مختلف ثقافتوں کے مابین تعلق تشکیل پانے لگا تو رنگ و نسل اور مذہب کے سوالات نے سر اٹھایا۔ شیراز دستی کا ناول "ساسا" نائن الیون کے بعد پاکستانی عوام کے بارے میں دنیا کی تنقیدی نگاہ کو واضح طور پر بیان کرتا ہے۔ پرندے کی موت کو پس منظر بنا کر مصنف نے پنچر کے کلیے کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ فطرت جو کہ دنیا کے تمام انسانوں کو برابری کا درجہ دیتی ہے مگر قانون انسانی قانون فطرت سے متضاد صورت اختیار کر کے جلوہ گر ہوتا ہے۔ حادثاتی طور پر یا معجزاتی طور کچھ گروہ یا قومیں جب وسائل پر قابو پالیں تو زمین پر اپنے طرز کی نئی قانون سازی کیے بنا نہیں رہ سکتے۔ اگرچہ یہ عمل فطرت کے خلاف ہوتا ہے۔ شعوری طور پر یا طاقت کے زور پر اسے اپنایا جاتا ہے اور اس کی بدولت زمینی حدود و قیود قائم کر لی جاتی ہیں۔ اور یوں دنیا بھر کے انسان اپنے معاشروں، رنگ و نسل اور مذہب کی بنا پر ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں۔ فرخ ندیم کے بقول:

> "۔۔۔ساسا دو ثقافتوں کے درمیان ایک مکالمے کا سبب بنتا ہے۔۔۔ساسا اور سادہ کی جو معنی خیز ثنویت قائم ہوتی ہے وہ۔۔۔عالمگیریت کے سیاسی کلچر کو واضح کرتی ہے"۔ (۴۶)

ساسا ایک بڑی تہذیب و معاشرت کے ماحول میں پلنے والا پرندہ تھا۔ اس لیے اس کی بد ہضمی کا علاج کرانے کو صاف ستھرا ہسپتال موجود تھا۔ ہاسٹل سے ہسپتال تک ایمبولینس بلائی گئی۔ پرندے کو بھرپور توجہ دے کر اسے بچا لیا گیا، مگر ان انسانوں کا کیا؟ جو محض خبر کی زینت بن کر اس دنیا کے لیے ماضی کا حصہ بنے رہ گئے۔ تھر میں قحط سالی سے دو سو بچے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ماؤں کے رحموں سے لے کر گودوں اور پنگھوڑوں تک کا کٹھن سفر طے کر کے یہ ابدی نیند سلا دیئے جاتے ہیں۔ ان کے لیے کوئی سہولت زندگی میسر نہیں کیونکہ یہ ترقی یافتہ معاشرت کے نمائندے نہیں ہیں۔ یہ اس معاشرت کے نمائندے ہیں جن کی اصل کی قیمتیں دوسری قومیں لگاتی ہیں جہاں لاکھوں ڈالر لگا کر پھول سے چہروں والے بچے مار دیے جاتے ہیں۔ وہ پھول سے

چہرے جنھیں نیچر کے قاعدے کے مطابق مسکراہٹوں کے تحفے بھیجنے تھے انھیں موت کے پروانے بھیجے جا رہے تھے۔

"ان افغان بچوں کے نام جو بارودی سرنگوں کا شکار ہو کر اپاہج ہو گئے اور جو کسی فٹ بال میچ میں کھلاڑی نہیں ہو سکتے صرف گول کیپر ہو سکتے ہیں"۔ (۴۷)

۲۵ نومبر تا یکم دسمبر، سات دنوں کی کہانی پر مشتمل ناول "قلعہ جنگی" میں نجانے کتنی گذشتہ اور آنے والی نسلوں کا احوال رقم ہوا۔ مصنف کے ناول کی باقاعدہ ابتدا سے قبل انتساب کی صورت میں چند قلمبند شدہ سطور پورے ناول کا احوال بیان کرتی ہیں۔ ان سطور کے الفاظ میں اس قدر گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے کہ گو یا پورا ناول ہی ان چند الفاظ میں سمو کر رکھ دیا گیا ہو۔ سات دنوں پر مشتمل ایک واقعہ کی بدولت انسانی زمین پر نجانے خون کی کتنی ندیاں بہہ گئیں۔ کتنی نسلوں کے استحصال کی تاریخ رقم ہوئی۔

نائن الیون کے بعد انسانی تاریخ میں جو ایک منفی تبدیلی دیکھنے میں آئی، وہ تھا شک۔ محض شک و شبہات نے کتنی قوموں کی نسلوں کو اس بھڑکتی ہوئی آگ میں جھلسا دیا۔ ایک ہی قوم کے لوگ محض بھڑکاؤ میں آکر ایک دوسرے کے مدمقابل آ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ بنو امیہ اور بنو عباس ایک ہی خدا کے پیروکار تھے۔ اقتدار کی ہوس نے انھیں راہ انسانی سے ہٹا دیا۔ ظلم و بربریت کی ایسی ہوا چلی کہ انسانی جسموں پر ضیافتوں کے مزے لیے گئے۔ آج اکیسویں صدی میں بھی حالات میں بدلاؤ کچھ زیادہ دیکھنے میں نہیں آ رہا تھا۔ استحصال کا وہی انداز اپنایا جا رہا تھا۔ بس تبدیلی آئی تو محض اتنی کہ اس وقت تلوار چلتی تھی اور آج ڈیزی کٹر بم گرایا جا رہا تھا۔ تب ایک وقت میں جسم کا ایک حصہ کٹ کر الگ ہو جاتا تھا جبکہ آج دور جدید میں انسانی جسم کے چیتھڑے اڑائے جا رہے ہیں۔ ایک بم سے متعدد انسانی جسموں کے اعضا جا بجا بکھرے دکھائی دے رہے تھے۔

مزار شریف، صوبہ بلخ (افغانستان) کا دارالحکومت، اور فوجی رسد کا واحد زمینی راستہ ہونے کی بنا پر افغانستان کا کلیدی شہر مانا جاتا ہے۔ قلعہ جنگی کے میدان میں کھڑے ہو کر شہر مزار شریف کی تمام رونقیں دکھائی دیتی تھیں۔ سوویت یونین قبضہ کے دوران افغانی کمانڈر عبدالرشید دوستم، مزار شریف میں کافی اثر و

رسوخ کا مالک تھا۔ قندوز میں دوستم کے مخالف طالبان نے لڑائی کے دوران ہتھیار ڈالے تو ان میں شامل مجاہدین کا تعلق کئی دوسرے ممالک سے تھا۔ پشت پر ہاتھ باندھے بعض قیدیوں کے کپڑوں میں اسلحہ چھپا ہو اتھا۔ تلاشی کی ذلت سے بچنے اور خوف کے مارے ان کے ہاتھوں سے گولیاں چل گئیں جس کے نتیجے میں ہولناک بمباری کا آغاز ہوا۔ کئی بے گناہ لوگ مارے گئے۔ عفریت کے اس ماحول نے انسانیت کو عصر کربلا میں لا کھڑا کیا۔ اس بے رونق اور خون کی ندیوں میں بہتے شہر سے کل سات لوگ قلعہ میں پناہ لے کر بھوک کے منہ کھولے ناگ سے اپنے آپ کو بچانے کے جتن کرنے لگے۔ اسی اثنا میں زخموں سے چور اور نقاہت کے شکار ان سات لوگوں کے کانوں میں گھوڑے کی آواز پڑنے پر زندگی جی اٹھنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ دوران روپوشی قلعہ میں موجود افراد پر باہر سے کئی طرح کے تجربات کیے جاتے ہیں۔ انھیں ختم کرنے کی تمام ٹیکنالوجی آزمانے کے بعد ان کے مرنے کا یقین ہوا، تبھی چند لوگوں کے قلعہ میں داخلے پر اندر سے احتجاجی فائرنگ کے نتیجے میں اندر اور باہر سبھی افراد کی لاشیں قلعہ کے تعفن زدہ پانی میں تیرنے لگیں۔ ڈاکٹر محمد شعیب خان اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "جب ناول کے مرکزی کردار آہستہ آہستہ ایک ایک کرکے موت کی آغوش میں اترنا شروع کر دیتے ہیں تو۔۔۔ منظر نامہ۔۔۔ صحیفہ الم بننے لگتا ہے۔۔۔ شاید کوئی کردار زندہ رہ جائے اور دنیا کی رونقوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔۔۔ امریکی عبدالحمید جانی واکر، بھی موت سے ہمکنار ہوتا ہے، تو المیاتی فضا منظر کو لہو لہو کر دیتی ہے"۔ (۴۸)

سات دن پر محیط انسانیت سوز اس واقعے نے تاریخ و ادب پر ان مٹ نقوش مرتب کیے۔ ناول "قلعہ جنگی" میں جہاں فسادات اور بربریت کی طویل تاریخ کا تذکرہ ہے وہیں افغانستان میں صدیوں سفر کرتا معاشرتی جبر بھی دکھایا گیا ہے۔ جس کا شکار صرف عورت ہی نہیں مرد بھی ہوتا ہے۔

> "تمام عورتوں کو برقعوں میں دفن کر دیا گیا ہے اور بچیاں سکول نہیں جا سکتیں۔۔۔ ہسپتالوں میں لیڈی ڈاکٹروں کو جواب دے دیا گیا اور وہ برقعہ اوڑھے کابل کی گلیوں میں بھیک مانگتی ہیں۔۔۔ مردوں کی داڑھیاں مٹھیوں میں بھینچ کر ناپی جاتی ہیں۔۔۔" (۴۹)

افغانستان کی عوام جہاں دوسرے ممالک کے ہاتھوں اذیت پا کر استحصال کا شکار ہوئی وہیں اس ملک کی تہذیبی و معاشرتی تاریخ بھی اپنی عوام کا استحصال کرنے میں پیش پیش رہی۔ ملا ازم کے بنائے ہوئے خود ساختہ قوانین نے جہاں مذہب کی جڑیں کھوکھلی کیں وہیں معاشرتی و معاشی سطح پر عوام کو بھیک کی زندگی بھی انعام کے طور پر سونپ دی۔ آج کا افغانستان پتھر کے اس دور میں جا پہنچا ہے جب انسان جاہل ہونے کی بنا پر اپنے استحصال کا موجب بنا۔

اس وقت جہالت پیش پیش تھی۔ مگر آج ان نام نہاد قوانین نے مرواڈالا جو خود ساختہ تھے۔ جہالت اور وحشت کی پوری تاریخ چند سطروں میں بیان کر کے ناول نگار اپنے زیرک ہونے کا ثبوت دے گیا۔ مذہب کے نام پر جہالت کا جو کھیل افغانستان کی سرزمین پر کھیلا جا رہا تھا۔ اس کی بدولت وہاں صنعت، تجارت اور تعلیم کا نام و نشان تک نہ تھا۔ قندھار سے ہرات تک سفر نہ کرنے والا انسان پورے افغانستان پر اندھا راج کر رہا تھا۔ مٹھی سے باہر نہ نکلنے والی داڑھی کی سزا بید کھانا تھی۔ بیوائیں بچوں سمیت بھوکی مرنے لگیں، نہ کھانا دینا اور نہ کمانے کی اجازت۔ استحصال اور جبریت کی ایسی تاریخ شاید کہیں نہ ملے۔

"۔۔۔اور اس نے کہا چلو اس دنیا کو دوبارہ آباد کرتے ہیں"۔(۵۰)

چلو دنیا کو پھر سے آباد کرتے ہیں۔ ایک ایسا جہان، جہاں امن و آشتی ہو، تعصب و فرقہ واریت نہ ہو، بم و بارود جیسی جدید ٹیکنالوجی نہ ہو جو انسان کو امید کی کرن دکھا کر زندگی بھر کے اندھیروں میں دھکیل دے۔ جو انسان سے اس کے فطری اعضا چھین لے۔ انسانی نفرتوں کی نذر فطرت کی عطا کردہ ساری نعمتیں نہ ہوں۔ چلو ایک ایسا جہان آباد کرتے ہیں۔ انعام اللہ اور شباہت کی خواہش تھی۔ شباہت جس کا تعلق معاشرے کے گرے پڑے اور مردار کھانے والے لوگوں کی نسل سے تھا۔ شباہت سانسی کی پوتی تھی۔ لومڑ، چنگڑ، نیولے، سانپ، چھپکلیاں اور مردار کھانے والا قبیلہ معاشرتی سطح پر دھتکارا ہوا ہوتا ہے۔ انھیں جتنا کوئی ذلیل کرتا ہے اتنا ہاتھ باندھے اپنی ذلت کو سر تسلیم خم کیے قبول کر لیتے ہیں۔

انعام اللہ جسے پیدا کرنے والے اپنا نام دینا بھول گئے۔ یا نام دینا مناسب نہ سمجھا۔ یا شاید غلطی سے؟ اور اسی بنا پر انعام اللہ سانسی کی گود میں پرورش پا کر ملکی سطح پر بڑا صحافی بن کر اس غلطی کو سدھارنے کی حتی

المقدور کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں جس سلوک کا وہ مستحق ٹھہرتا ہے اس کی مثال تاریخ کا حوالہ قرار پاتی ہے۔

انسانی درماندگی اور بے توقیری کی جو داستان ناول "خس و خاشاک زمانے" میں ملتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انسانی استحصالی تاریخ کے وہ حوالے جو پنجاب کی دیہاتی سرزمینوں سے پیدا ہو کر بین الاقوامی سطح تک پہنچتے ہیں۔ سبھی کو بخوبی بیان کیا گیا ہے۔ تین نسلوں کو پروان چڑھاتے ناول کا بنیادی موضوع وقت اور انسان ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ہر شخص اپنے حصہ کا کردار نبھاتا ہوا رخصت ہو جاتا ہے۔ انسان کہیں وقت کے طے شدہ فیصلوں پر سر تسلیم خم کرتا ہے تو کہیں زمانے کے جبر کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جانے کی صورت میں اس پر نئے جہاں کھلتے ہیں۔ عزت دار معاشرے کا دھتکارہ ہوا مردار کھانے والا سانسی / ساہنسی نومولود بچے کو اپنا کہہ کر سنگسار ہونے سے بچالیتا ہے۔ کم علمی، جہالت اور لاقانونیت کا اندھا راج ہو تو ہر شخص فتویٰ دے کر انسان کا استحصال کرتا ہے۔ مسجد کے باہر معصوم بچے کا ملنا نعت خوان کے نزدیک حرام تھا لہذا اسے سنگسار کر دینے میں ہی عافیت تھی۔ سنگساری کے لیے سارا ساز و سامان تیار کرنے کی کوششیں جاری تھیں کہ دنیا پور کا سرو سانسی مردار کھانے والا اور شاید خود بھی مردار تھا، تبھی تو عزت داروں کے اندھیرے میں ہونے والے گناہوں پر پردہ ڈالتے ہوئے اپنی جھولی میں اس گناہ کو بھرتا وہاں سے چل دیا۔

انعام اللہ کی زندگی کے کورے کاغذ پر سچ کی عبارت لکھنا باقی رہی اور وہ بی اے تک پہنچ گیا۔ بنا کسی عقیدے اور تعصب سے پاک۔ مگر جب اس نے اپنی پہچان کا سوال اٹھایا تو جواب ملنے پر رد عمل کے طور پر "حرامی کی سرگزشت کے نام" سے ناول لکھ ڈالا۔ سماجی حالات موافق قرار نہ پائے اور بادشاہ وقت کے حواریوں نے "آٹو بائیو گرافی آف اے باسٹرڈ" محض نام لکھنے پر انعام اللہ کو عبرت کا نشان بنایا۔ ناول سے اقتباس:

> "۔۔۔ اتنا کرم کیا کہ اس کی شلوار نہ اتاری، صرف قمیص اور بنیان کو نوچ کر اس کی پشت برہنہ کی گئی۔۔۔ انعام اللہ کے بگڑے ہوئے چہرے کے آگے ایک حساس مائیک نصب تھا۔۔۔ میدان کے چاروں اور ایستادہ کھمبوں پر لاؤڈ سپیکر آویزاں کیے گئے تھے

تا کہ۔۔۔اس کی دلدوز چیخوں کی آواز۔۔۔مناسب طور پر شہر لاہور کے ہر گھر کے اندر سنائی دے۔۔۔"(۵۱)

کہا جاتا ہے کہ ظلم کے خلاف صدا بلند نہ کرنے والا بھی ظالم قرار پاتا ہے مگر یہ کیا! انعام اللہ نے صدا بلند کی تو تاریخ کے الفاظ کا مفہوم بدل گیا۔ تاریخ جو بتاتی آئی تھی ویسا کچھ نہ تھا شاید تاریخ پرانی ہو چکی تھی۔ انسانی اقدار و روایات اور اصولوں کی طرح، ایک نیا نظام متعارف ہو چکا تھا۔ ایسا نظام جہاں انعام اللہ سمیت متعدد لوگوں کی جگہ نہ رہی۔ چنانچہ خود کو اس نظام ناانصاف سے دور کرنے کے لیے امریکہ کا رخ کیا۔

امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر ہونے والے حملے کے بعد انتقام کی آگ سے نکلنے والے دھوئیں سے متعدد انسانوں کے دم گھٹتے چلے گئے۔ حملہ کس نے اور کیسے کیا؟ حقائق جانے بنا مذہب کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کو نشانہ بنایا گیا۔ انعام اللہ جس یزیدی قانون سے منہ موڑ کر امریکہ گیا وہ وہاں بھی اس کا پیچھا کرتا ہوا ۱۱/۹ کی شکل میں آن کھڑا ہوا۔

دو عمارتوں کی تباہی نے جہاں مقامی لوگوں کی زندگیوں کو نیست و نابود کیا وہیں دوسرے ممالک کی ساکھ کو بھی زِک پہنچی۔ بنیاد پرستی اور تنگ نظری کی جس دنیا سے بھاگ کر وہ یہاں آیا تھا۔ ۱۱/۹ کے بعد بھرپور شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ وہ آزاد انسان تھا، فرقہ واریت اور تعصب جیسی مالائیں اس کے گلے کا طوق کبھی نہیں بنی تھیں۔ مگر یہ دنیا ایسی ہی مالائیں لٹکائے چین کی بانسریاں بجاتی پھر رہی تھی۔ وہ ایک ہی بے چین تھا کیونکہ اسے یہ مالا گلے کا طوق لگتی تھی۔ غربت، معاشی مجبوری، فرقہ واریت، تنگ نظری اور تعصب جیسی نعمتیں جو اسے دنیا نے انعام کے طور پر دی تھیں اس کی متاع کل تھیں۔ جن کا بوجھ وقت کے ساتھ ساتھ بھاری پڑ رہا تھا۔ ایک بار پھر اس بوجھ سے کندھوں کو آزاد کرنے کے لیے سفر پر روانہ ہو گیا۔ نئی دنیا بسانے کو، نیا جہان آباد کرنے کو۔ شاید کہ اب کی بار جو تاریخ لکھی جائے وہاں خس و خاشاک کی دھول میں انسانی زندگیاں گم نہ ہوں۔

iv. مدارس اور عقائد و نظریات کے تناظر میں انسانی استحصال:

مذہب کو انسان نے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنے کی ٹھانی تو اس کا رنگ اپنی مرضی سے بدل لیا ۔ مذہب انسانیت کو سنوارنے کے لیے آیا تھا مگر انسان نے اس سے اپنی ہوس کی مسند کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ پیری مریدی کا ایک طویل سلسلہ جس میں عقیدت مندی کا عنصر خوف و دہشت کی بدولت غالب دکھائی

دیتا ہے ایک مضبوط جال سے بُنا ہوتا ہے۔ جس میں سادہ طبیعت کے انسان پھنستے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنی سادگی میں لُٹتے پٹتے زندگی بسر کرتے ہیں۔ زمانہ قدیم سے چلنے والا یہ سلسلہ آج بھی جوں کا توں موجود ہے۔ اکیسویں صدی میں جب کہ ہر جانب آگہی کے علم بلند کیے جا رہے ہیں، آج بھی لوگوں کو بے وقوف بنا کر لوٹنے کا عمل اپنی آب و تاب کے ساتھ جاری و ساری ہے۔

"بالوں کا گچھا" ناول ایسے ہی موضوعات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ پیر نور شریف مذہبی لبادہ اوڑھ کر عوام کی خون پسینے کی کمائی کو ہتھیاتے ہیں۔ یہ عبا پوش بہروپیے لوگوں میں ڈر اور خوف کے جذبات پیدا کر کے انھیں اپنا اسیر بنا لیتے ہیں۔ پیر نور شریف نومولود بچوں کو بدروحوں سے بچنے کا روحانی علاج اس طرح مہیا کرتے ہیں۔

> "۔۔۔ بچے کی پیدائش کے ساتھ سے۔۔۔ جتنے سال بچے کی جان کو خطرہ ہوتا ہے اتنے سال کے لیے میگا پیر کی رکھ حفاظت کے لیے رکھوا دیتے ہیں۔ ان بالوں پر میگھا پیر کا دم کیا ہوا پانی قطرہ قطرہ ٹپکایا جاتا ہے۔۔۔ سال پورے ہو جانے پر رکھ کاٹ دی جاتی ہے اور پھر رکھ کے بالوں کو تولا جاتا ہے جتنا وزن ہو اس کے مطابق سونا یا چاندی پیر کے دربار میں ہدیہ کے طور پر دی جاتی ہے۔۔۔ پیر نور محمد شریف بچے کے ماں باپ کی حیثیت دیکھ کر ہی فیصلہ کرتے ہیں کہ ہدیہ سونا ہو گا یا چاندی۔ اگر کوئی غریب ہو تو بالوں کے وزن کے مطابق روپے بھی دے سکتا ہے۔"(۵۲)

پیری مریدی کے اس دھندے سے لوگوں کے چولہے ٹھنڈے رہ جاتے ہیں۔ مگر پیر صاحب کے دربار کو کبھی خسارے کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ انسان جنگلوں اور غاروں سے نکل کر مہذب زندگی گزارنے لگا تو بھی یہ توہمات اس کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہوئیں آج اکیسویں صدی میں بھی اپنے زور کو کم کرنے کی بجائے بڑھاتی چلی جا رہی ہیں۔

> " آہ یہ سب جھوٹ تھا میرے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا ہے۔۔۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یوم جمہوریہ پر حملہ عام جنگ کی بجائے ایٹمی جنگ چھیڑ دے گا۔ میں قاتل ہوں۔ کروڑوں

انسانوں کا قاتل سب جھوٹ تھا۔ خلافت کے کالے جھنڈے، خراسانی کا لقب، غزوہ ہند کی بشارت، آہ یہ سب سراب تھا"(۵۳)

طاقتور کے پیدا کردہ حالات سے تنگ آکر اپنے آبائی مذہب اور جائے پیدائش کو چھوڑ کر بھاگنے والا 'ساون' دنیا میں 'خالد' کے نام سے شہرت پاتا ہے۔ وہ ظلم کے ایک شکنجے سے نکلا تو دوسرے میں پھنس گیا۔ ایک وہ ظالم تھا جو اسے روٹی نہیں دیتا تھا اور ایک یہ ظالم تھا کہ روٹی پیٹ بھر کر دیتا مگر حساب بھی اتنا ہی کڑا لیتا ہے۔ وہ جانوروں کے ساتھ باندھ کر جانور بنانے پر تلا رہا اور یہ ساون کے ہاتھوں انسانی زندگی کا کھلواڑ کرتا رہا۔ بڑی ماہرانہ چابکدستی سے ساون کے دماغ کی چابی اپنے ہاتھ میں رکھ کر اپنی مرضی کا تالا لگاتا تھا اور اپنی مرضی سے کھول دیتا۔

خوفناک ایٹمی تباہی کے نتائج دیکھ کر آج خالد کو حقیقت کا پتہ چلا تو وہ پھر سے ساون بن جانا چاہتا تھا ۔ ضمیر کی ملامت اسے سانس نہیں لینے دے رہی تھی۔ وہ ساون اچھا تھا کہ ماں کا دیا ہوا مذہبی زندگی کا درس اسے انسانوں کو مارنے پر نہیں اُکساتا تھا، وہ اچھوت تھا، بھوک ننگ کے راج میں زندگی کھلتا گلاب لگتی تھی۔ مالک جانوروں کے ریوڑ میں رہنے کا حکم دیتا وہ وہاں بھی خوش رہتا۔ اس کی فطرت بری نہیں تھی، وہ شہر دیکھنے کا متمنی تھا۔ بھاگ کر شہر آیا تو قاری صاحب نے بڑے پیار کے ساتھ بیٹا کہا، اور اپنی آغوش کی پناہ دے دی۔ آغوش کی پناہ، اچھا کھانا، رہائش اور پہننے کو عمدہ لباس، غریب تھا دو وقت کی روٹی پر بک گیا۔ اتنا سب کچھ ملنے کے بعد بدلے میں چھوٹا سا کام کرنا ہوتا، بظائر چھوٹا مگر انسانیت سوز واقعات کی تاریخ میں دل دہلا دینے والا کام۔

"نشانہ تم کو ہم دیں گے۔۔۔ تمہارا کام صرف تاک کر مارنا ہو گا۔۔۔ جتنے کافر مارو گے وہ اتنے ہی محل جنت میں تعمیر کرو گے جو سب کے سب خوبصورت ترین حوروں سے بھرے ہوں گے جو کہ صرف تمہاری ہوں گی"(۵۴)

اندھے کو دو آنکھیں، بھوکے کو دو روٹیاں اور مرتے انسان کو دو گھونٹ پانی تمام عمر کی بھوک پیاس بجھا دیتے ہیں۔ آگہی جہاں انسان کے لیے عذاب بنتی ہے لاعلمی اسے جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں دھکیلتی چلی جاتی ہے۔ خالد کو نشانہ فراہم کرنے والے اپنے مفاد کی قیمت جانتے تھے۔ مگر خالد کو اگر کچھ معلوم تھا تو بس اتنا ہی کہ وہ ایک مجاہد ہے اور مجاہد کے ارادوں کی تکمیل کے راستے میں جو بھی چٹان آتی ہے اس سے ٹکرا جانے کا حکم اس پر صادر تھا سو وہ بجالاتا۔ اب کی بار اس کے ہاتھوں جس شخص کو نشانہ بنوایا گیا وہ ڈاکٹر نقوی تھے جو کہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں امراض گردہ سے خلاصی کے لیے ادارہ قائم کر رہے تھے۔

مذہب کے ٹھیکے داروں نے اس پر کفر کا فتوی لگا کر نانا کے ساتھ معصوم نواسے کو بھی ابدی نیند سلا دیا ۔ ظلم و بربریت کے ایسے کئی واقعات خالد کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں۔ افیم کی سپلائی، لوگوں کا اغوا برائے تاوان اور قتل کے متعدد واقعات یکے بعد دیگرے ناول میں سامنے آتے ہیں۔ اور ان کی تکمیل میں ہر جا خالد پیش پیش رہا۔ اپنے مفاد میں خالد کی لاعلمی سے استفادہ کر کے ضیافتوں کے مزے لینا ان نام نہاد مذہبی ٹھیکیداروں کو راس آ گیا تھا۔ پیار محبت اور امن و آشتی کی بات کرنے والے کی لاتوں اور ٹھڈوں سے تواضع کی جاتی۔ جنگ و جدل کے دور میں پیار کی بات کرنے والا ان مذہبی اجارہ داروں کو ایک آنکھ نہ بھاتا۔ جو جنگ اور خونریزی کی بات کرتا وہی ان کا منظور نظر ہوتا۔ خالد بھی رہا۔

مگر آج جب کہ پورا ہندوستان اسی کے ہاتھوں کیے گئے ایٹمی حملے کی نظر ہو چکا تھا تو کرنل صاحب کے ذریعے جو حقیقت اس پر آشکار ہوئی، وہ یہ کہ اس کی گزشتہ زندگی ایک سراب تھی۔ اسے پیٹ بھر کر روٹی کی بڑی بھاری قیمت دینا پڑی تھی۔ اس کی اولاد عام انسانوں سے ہٹ کر خوفناک پیدا ہوئی تھی۔ وہ بے موت مارا گیا، ایٹمی حملے میں تباہی کے بعد سامنے آنے والے نتائج بہت بھیانک اور خوفناک تھے اور انھی بھیانک اور خوفناک حالات کی بھینٹ خالد کی زندگی چڑھ گئی۔ وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ بھاگ بھری سے ساون کو خالد کی شکل میں دنیا نے چھین لیا۔

"نیلی بار" از طاہرہ اقبال میں انسانی استحصال کی نمائندگی کسی ایک سطح پر نہیں کی گئی۔ بلکہ اس میں انسان کی نجی زندگی سے لے کر ملکی و بین الاقوامی سطح تک پھیلے استحصال کی تاریخ کو رقم کیا گیا ہے۔ پاکستانی تاریخ کے متعدد ادوار اس ناول کا حصہ بنتے ہیں۔ یہ ناول ایک مخصوص عہد کے بیانیے کے ساتھ ساتھ تاریخ کا بیانیہ بھی بن کر سامنے آتا ہے۔ ایوب خان کے دور سے شروع ہونے والی ملکی سیاسی تاریخ سے لے کر ۹/۱۱ کے بعد مذہب کی آڑ میں سیاست کا جو کاروبار چلایا گیا اور اس سے نفسا نفسی کا جو بازار گرم ہوا اس سب کو

ناول کا حصہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ تمام واقعات، حالات، تہذیب و تمدن، روایات، انقلابی نعرے بازیاں، تبدیلی کی آہیں غرض جو مسائل بھی پاکستان کو مختلف اوقات میں درپیش رہے سبھی کو ناول میں بخوبی نبھایا گیا ہے۔

اس ضخیم ناول میں انسان کا ہر سطح زندگی پر ہونے والا استحصال ملتا ہے۔ چاہے وہ سیاسی و اقتصادی نظام ہو، چاہے اس کا تعلق رسم و رواجات سے ہو، چاہے سائنس و ٹیکنالوجی جیسی نئی ایجادات سے، ہر ایک سطح کا تذکرہ مفصل انداز میں کیا گیا ہے۔ مذہبی مدارس، پیری مریدی، گدیوں اور درگاہوں کی رونقوں کے پس پردہ جو استحصالی قوتوں کا جارحانہ رویہ دیکھنے کو ملتا ہے وہ انسان کی طبیعت کو ایک بار جھنجھوڑ کر ضرور رکھ دیتا ہے۔ اس قدر مکروہ اور بھیانک چہرے قاری کو لمحہ بھر کے لیے حیرت کے سمندر میں غرق ہو جانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

ناول "نیلی بار" میں بدلتے حالات اور تقاضوں کے زیر اثر واقعات و کردار ایک خاص تسلسل کے ساتھ آتے ہیں۔ واقعات و کردار کے تسلسل میں کئی نسلیں نئی پرانی روایات و اقدار کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اسی تسلسل کے ساتھ استحصال کی تاریخ بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ انسانی استحصال کی کہانی بھی تبدیلی کے نظاموں کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ استحصال میں غریب امیر دونوں ہی پستے ہیں۔ مگر زیادہ تر زندگی کے کسی بھی شعبے کی بات کی جائے بے موت مرنے کے لیے غریب ہی سامنے آتا ہے۔ غریب جذباتی ہونے کے ساتھ ناہنجار بھی ہوتا ہے۔ زمانہ بدلا، حالات بدلے مگر اس بدلاؤ کا شکار اگر نہ ہو پایا تو غریب تھا۔ مذہب، سیاست، انقلاب، سائنس غرض کوئی تبدیلی کسی بھی نام سے آتی ہے تو غریب کا کچھ نہیں بگڑتا وہ کل بھی جذبات کی رو میں بہتا تھا، وہ آج بھی ایسا ہی ہے۔ مذہب و دین کی فکر کل بھی اسے سب سے زیادہ تھی اور آج بھی اسی کو ہے۔ نئی حکومتوں کے آنے پر لارے بھی انھی کو سب سے زیادہ لگائے جاتے ہیں کیونکہ تعداد میں زیادہ اور عقل میں کم ہونے کی بنا پر استحصالی قوتوں کے کام بآسانی ان کے ذریعے نکل آتے ہیں۔

دنیا کے ایک کونے میں ہونے والے انقلابات نے دوسرے حصے کے مکینوں کو ہمیشہ اپنی زد میں لایا۔ انقلاب کی بدولت آنے والی تبدیلیوں کے نتائج جو بھی ہوں استحصالی قوتوں کا علم سدا بلند رہا ہے۔ کہیں طاقتور کے مدمقابل طاقتور تھا تو کہیں کمزور۔ کہیں اسلحہ ساز کمپنیاں مال تیار کرتی ہیں تو کہیں اس اسلحے کو استعمال کرنے کے لیے بندے تیار کیے جاتے ہیں۔ اور ان بندوں کی تیاری میں اس قدر شاطر دماغ استعمال ہوتے ہیں کہ ایندھن میں جھونکا جانے والا اپنی رضا و رغبت کے ساتھ خود کو پیش کر دیتا ہے۔ طاقتور ممالک اور طبقات

ترسیل زر اور حاکمیت کے لیے ایسے ایسے کاروبار ساخت کرتے ہیں کہ فاقہ زدہ طبقات کی دنیاوی کفالت کر کے ان کے دماغوں کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ یہ نادار انھیں اپنا دیوتا تسلیم کرنے لگتے ہیں۔

9/11 کے بعد عالمگیریت کی چالوں کا ایک نیا جال بچھا تو کئی نادان طبقات اس کی زد میں آئے۔ دو بلند و بالا عمارات کا یک لخت زمیں بوس ہو جانا استحصالی قوتوں کو مزید ہوا دے گیا۔ کئی من گھڑت کہانیاں نادانوں کو سنا کر انھیں اپنے بچھائے ہوئے جال میں پھنسا لیا گیا۔ دین کو دنیا کے مفاد کے لیے استعمال کر کے جذباتی گفتگو کا طویل سلسلہ چلا تو کئی معصوم لوگ اپنے ہاتھوں میں جان کا نذرانہ لیے پہنچ گئے۔ گویا گھروں کو جلا کر چراغاں کرنے کا ایک نیا رواج چل نکلا۔ اقتباس:

> "یہ اپنا مولوی اسی نے تو۔۔۔ بھجوادیے ماؤں کے کلیجے۔۔۔ ادھر کابل۔۔۔ پٹھانوں کے دیس میں۔۔۔۔ ٹھنڈے ملکوں (ملکوں) میں۔۔۔ پر اپنے پانچ کر چھوں میں سے ایک بھی نہ بھجوایا۔۔۔۔ کہتا ہے وہ دین اسلام کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مدرسوں میں۔۔۔"۔(۵۵)

کیا دلائل تھے دین کی تعلیم حاصل کرنے والے کے لیے راہ فرار بڑی آسان تھی سمجھانے والا خود مر گیا تو چال چلنے کے نت نئے طریقے کون سکھائے گا۔ اس لیے عام بندہ ہی اس عزت زدہ مقام تک لے جایا گیا۔ انقلاب اور تبدیلی کا پرچار کرنے والے دماغ لڑا نہیں کرتے۔ یہ جال بننے والے ایسی انقلابی سیاست کے جاگیر دار ہوتے ہیں جو دوسروں کی محنت پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ اور مصنفہ کے نزدیک یہ ایسے بزدل کمانڈر ہوتے ہیں جنھیں مردار خور کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ یہ دوسروں کی لاشوں پر اپنی سیاست کا علم بلند کرتے ہیں اور اقتدار میں آجانے پر منشیوں کا انعام بڑھا دیتے ہیں۔ مگر تمام شیطانی چالبازیوں میں جو مر گیا اس کے بارے کوئی بات نہیں کرتا۔ وہ خود کبھی بھی لڑائی کا حصہ نہیں بنتے۔

علی جواد (مشمولہ نیلی بار) جیسے نوجوان جنھیں تقریر کا ملکہ حاصل ہو، اسی فن سے ناداروں کو اپنی سوچ کے چنگل میں پھنسا لیتے ہیں۔ انھیں اپنا ہونے کا یقین دلاتے ہیں۔ کیکڑے کی مانند لوگوں کی سوچوں کو جکڑ لیتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں تو علی جواد کی آنکھوں سے سوچتے ہیں تو علی جواد کے دماغ سے، غرض ان کا دھرم بھرم سبھی کچھ علی جواد اور اس جیسے لوگ بن جاتے ہیں۔ ماؤں کی گودیں اجاڑنے والے یہ مردار اپنی شناخت سے بھی منحرف ہوتے ہیں۔ محمد علی سے علی جواد اور پھر علامہ محمد علی معاویہ کا روپ دھار کر انسانی زندگی اور جذبات کے بیوپاری انقلاب کے نام پر موت کا کاروبار کرتے ہیں۔ اور مرنے والوں کی بکھری لاشوں پر کھڑے ہو کر آہ و زاری کرنے کی بجائے تمسخرانہ ہنسی ہنستے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے مقاصد کو پا لیتے ہیں۔ ان کا دماغ جو جال بن رہا

تھااس میں کئی شکاری پھنس چکے ہوتے ہیں۔ شہر کے امن کو تہہ و بالا کرنے والے اپنے بنائے ہوئے منصوبوں کا ایندھن عوام کو بناتے ہیں۔

جذباتی گفتگو دل کو لبھاتی ضرور ہے بھوکے کو روٹی نہیں کھلاتی۔ مگر انقلاب کے نام پر جذبات و احساسات کا بیوپار کرنے والے کیا جانیں کہ مزدور جب بنا دیہاڑی لیے اپنے بچوں کے سامنے جاتا ہے تو بھوک سے نڈھال روتے بلکتے بچوں کا کیا حال ہوتا ہے۔ ان کی بھوک کے ساتھ ساتھ امیدوں کے چراغ کس طرح گل ہوتے ہیں۔ انھیں تو بس باتوں سے ہر علم پر دسترس حاصل کر کے غربا کی گردنوں پر پاؤں رکھے آگے بڑھ جانا ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک بھوک کی نفسیات ہی یہ ہے کہ خوراک کی زیادتی کی شکل میں ختم ہو جاتی ہے اور جب خوراک قلیل ہو تو بھوک بڑھ جاتی ہے۔ کتنا خوشگوار ہے نا یہ سب سوچنا اور کہہ دینا محض دوسروں کے لیے۔ کیونکہ اپنے آگے تو کئی انواع و اقسام کے ذائقہ دار کھانوں کی افراط ہوتی ہے۔ ایسی میز جس پر خوراک کی افراط ہو اس کے گرد بیٹھے فلسفے اور نفسیات سمیت دیگر کئی علوم جاننے کا ملکہ بھی حاصل ہو جایا کرتا ہے۔ اقتباس:

"۔۔۔ انقلاب قربانیاں مانگتا ہے۔ آزادی کا لفظ خون سے لکھا جاتا ہے"۔

"جاؤ بجھتی پر تیل چھڑکنے کو جاؤ، آگ لگا دو ان غریبوں کے تنکا تنکا آشیانوں میں۔ تمھیں بھر بھر کنستر پٹرول کے مفت جو مل رہے ہیں۔ بھڑکا دو آگ۔۔۔ آگ لگانے کے اسی فن سے ہی تو تحریک چلتی ہے اسی آگ کی شدت سے ہی تو قیمت لگتی ہے"۔ (۵۶)

انقلاب کے نام پر موت کے دکاندار، روٹی کپڑا اور مکان کا جھانسا دے کر غریبوں کا روزگار لوٹنے والے قزاق اپنی ہوس کی دکان بھرتے ہیں۔ جذباتی عوام کا استحصال کر کے انھیں بیوقوف بناتے ہیں اور اقتدار کے ایوانوں تک پہنچنے کے لیے انھیں سیڑھی بناتے ہیں۔ محنت کش، مفلوک الحال اور عقل سے پیدل اس جذباتی عوام کے باشندوں کی لاشوں کو چوک میں رکھ کر مفاد حاصل کرتے ہیں اور مقام پا لینے کے بعد انھیں گندے تولیے کی طرح کوڑے دان کی نذر کر دیتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسا انقلاب ہے؟ جس میں تمام جملہ املاک پر قابض آج بھی صاحب ثروت ہی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تبدیلی لانے والوں، نئے نظام کی تشکیل کرنے والوں نے اپنے پیغام میں ایسا کوئی نقطہ بیان نہیں کیا تھا۔ جس پر آج قلم کی نوک مرکوز تھی۔ نام نیا نظام تھا جبکہ حاصل اسی پرانے اور غلط نظام کو کیا جا رہا تھا۔ نئی صدی میں نئے انداز سے امیر بنا جا رہا تھا۔ محنت نہیں چھینا جھپٹی سے۔ اقتباس:

"نو عمر شکیل احمد کے حلق سے درد کو سہارنے والی چیخ نکلی۔

"باجی کچھ غلط بھی نہیں کہتیں۔۔۔"

"شدید رخمی ہونے کے بعد میں اندرون شہر کی جڑواں چھتوں پر کود گیا تو میں نے دیکھا۔۔۔" وہ پھر ڈکرایا اور خون اور زرد پانی کی الٹی اپنی بوسیدہ قمیض کی گولیوں سے چھلنی آستین میں سمیٹی۔

"میں نے دیکھا کہ دونوں مخالف گروپوں والے ایک کمرے میں بیٹھے روسٹ پرندوں کے ساتھ بٹیر اڑا رہے تھے اور نیچے سڑک پر عوام گولیاں کھا رہے تھے اور نیچے جھانک جھانک کر قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ دونوں فریق مل کر ہمارا تماشا دیکھ رہے تھے"۔ (۵۷)

استحصال کا شکار ہونے والوں کا ساتھ دینے کا دم بھرنے والے کل بھی انھیں سیڑھی بنا کر اپنا مفاد حاصل کرتے تھے۔ اور آج بھی یہ عمل سست روی کا شکار نہیں ہوا تھا۔ صاحب ثروت کل بھی غربا کا استحصال کر کے ضیافتوں کے مزے لیتے تھے اور آج جبکہ نئے نظام کے ساتھ انقلاب کا عندیہ دیا جا رہا تھا۔ تو بھی حالات میں کچھ زیادہ بدلاؤ دیکھنے کو نہیں مل رہا تھا۔ آج بھی امرا غریبوں کے دماغوں میں اپنی سوچ اوڑیس کر کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتے چلے جا رہے تھے۔ عوام نے جذباتیت کے زور پر نعرہ بازی کر کے حالات کشید تو کر لیے مگر مقصد تک پہنچنے میں ان دماغوں تک رسائی حاصل نہ کر سکے جو انھیں استعمال کر کے اپنے مفادات حاصل کرتے جا رہے تھے۔ غریب عوام کی غربت کا بیان تو کیا جا رہا تھا مگر انھیں حاصل کچھ اگر ہو رہا تھا تو لاشیں کیونکہ حقیقی انقلاب لانے والے ناپید تھے۔ عوام کو ایک دوسرے کے مد مقابل لا کر صاحب ثروت اپنی تجوریاں بھر رہے تھے۔

عجب انقلاب کے طلبگار تھے۔ کافی ذہین۔ دکھتی رگوں پر نمک چھڑکنے کو مرہم لگانا کہتے تھے۔ مرنے والے کو مر جانے دیتے۔ اس کا جینا اب وقتی فائدہ نہ دے پائے گا۔ خون تھوکتے اس نوجوان کے مرنے کا انتظار کیا جانے لگا۔ جی کر کرنا بھی کیا تھا۔ پہلے جیسا جوش تو دکھا نہیں سکتا تھا۔ زخموں کو مندمل ہونے کے لیے کچھ عرصہ اسے انتہائی نگہداشت میں رکھنا پڑتا۔ لہذا اسے دانستہ مرنے دیا گیا۔ تاکہ اس کی لاش کو استعمال کر کے عوام میں اشتعال پیدا کیا جا سکے۔ کیونکہ مشتعل ہونے والی عوام سے نوجوان کی لاش بھاری قیمت وصول کرنے میں مددگار ثابت ہونا تھی۔

مذہبی، سیاسی، معاشی و معاشرتی ناانصافی زوروں پر ہونے کی بنا پر ملکی حالات بے مہار اور بے اعتدال ہو جاتے ہیں۔ انسانیت کی ناقدری و پامالی زندگی کے ہر شعبے میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ مدارس کے مولوی بھی تقدیس کے کئی درجات یکبارگی چڑھ گئے۔ اقتباس:

"جس روز جہاز ٹکرائے اسی روز ملا سے مولوی جی کا احترام پا گیا تھا۔ جیسے جہاز ٹکرانے والوں کی پیشہ وارانہ ہنر مندوں سے لے کر جذبہ شہادت تک تخلیق میں کہیں مولوی جی کا حصہ ضرور رہا ہو۔ اور بس کی نشستوں سے بھی زیادہ تعداد میں جانثاروں کو اکٹھا کرتے۔ اور انھیں بس میں بھرتے ہی وہ مولوی جی سے مولانا صاحب ہو گئے تھے"۔ (۵۸)

مولوی حضرات دین حق کا علم بلند کیے عوام کو جام شہادت نوش فرمانے کی راہ دکھانے میں مصروف عمل دکھائی دیے۔ سجود اور رکوع کے گہرے نشانات، کھجوروں کے پتوں سے بنی بوسیدہ صفوں پر ان عابدوں کی پیشانیوں کی چھاپ دکھائی دینے لگی۔ مدارس کا زہد و تقویٰ پر مبنی ماحول پانچ سے گیارہ برس کی عمر کے زرد رنگتوں والے بچوں کی شکلوں پر دہشت و خوف کا گوندلیپ کیا ہوا دکھائی دینے لگا۔ یہ مصری استاد جو کسی قسم کا ڈنڈا، چابک وغیرہ کوئی ہتھیار استعمال نہ کرتا تھا۔ اس کی سزا کا انداز اس کے مقام کی طرح ہٹ کر تھا۔ اس کی جانب سے دی جانے والی سزا میں بچوں کی خوف سے ٹانگیں تھر تھر کانپنے لگتیں۔ اس کا انداز سزا بچوں کو جنسی طور پر ہراساں کرنا تھا۔ یہ مصری استاد صابر خان اور گل خان کی برداشت سے باہر ہو چلا تو دونوں نے مل کر اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ کیونکہ ان کے لواحقین تو تھے نہیں جو آتے۔ اقتباس:

"سن مردود تجھے پتا ہے کہ تو مر رہا ہے اور تجھے مارنے والا کون ہے۔ دیکھ اب ذرا دیکھ، کاش میں تجھے یوں کاٹتا کہ زندہ کو۔۔۔ سر سے پیر تک ذرا ذرا قیمے کی صورت کتر ڈالتا۔۔ آج وہ اوپر تھا اور یہ کٹا پھٹا حیوانی طاقت بھرا وجود اس کے نیچے، گل خان نے اس کی آہنی کلائی پکڑ لی۔ بس کر مر گیا حرامی"۔ (۵۹)

جبر و بربریت بھرا ماحول سہہ سہہ کر گل خان اور صابر خان کی برداشت ختم ہو چکی تھی۔ بیس تیس بچوں کے ہوتے ہوئے انھی کو ہر بار جنسی ہوس کا نشانہ بنایا جاتا۔ بظاہر مفت تعلیم اور روٹی دینے والا مدرسہ انسان کی ذات اور جذبات کا سودا کس نہج پر جا کر کرتا ہے اس بات کا اندازہ لگانا طاقتور کے سر کا درد نہ بنا تو گل خان اور صابر جان نے اس درد سر سے نجات پانے کا حل ڈھونڈ نکالا۔ آج اس درندہ صفت انسان کو مارتے سمے انھیں شدید خواہش پیدا ہو رہی تھی۔ کہ کاش! وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا کہ اس کے وجود کی پامالی کیسے ہو رہی

ہے۔ ایک قتل کرنے کے بعد اب گل خان اور صابر جان بڑے بہادر بن چکے تھے۔ قتل میں استعمال ہونے والے اوزاروں سے مقتول کے ٹکڑے کرنا کوئی آسان عمل نہ تھا اور اس سے وہ دونوں بآسانی باہر نکل آئے تھے۔ اس لیے اب ان کی مانگ بڑے پیمانے پر ہونے لگی۔ باعزت انداز میں غسل کر کے نیا لباس فراہم کیا گیا۔ اور انھیں بڑے احترام کے ساتھ اعلیٰ علامہ صاحب کے پاس روانہ کر دیا گیا۔ تاکہ وہ انھیں جہاد کی دنیا کا عکس واضح کر کے دکھا سکیں۔

علامہ محمد علی معاویہ بے پناہ مشفقانہ انداز میں ساری روداد سن کر تڑپ اٹھے۔ ان معصوموں کے سب سے بڑے ہمدرد بنے اپنی محبت کا یقین دلانے لگے۔ علامہ محمد علی معاویہ بہروپیا تھا۔ اس کا ہر رنگ نئی کہانی کی غمازی کرتا تھا۔ بھوکوں کی اشتہا بڑھانے کو کھانا سامنے رکھا اور نفسیات جان لی۔ کہ یہ وہ لوگ تھے جن کے گھروں میں روٹی کی وجہ سے لڑائی ہوتی تھی۔ انھیں پیٹ بھر کر دو وقت روٹی مہیا کرو اور پھر اسلام کے محافظ بنا کر مصری استاد جیسی پھیلی بے پناہ برائیوں کو کیف کردار تک پہنچا دو۔ ان کے اذہان کو مغلوب کرو، دودھ کی نہروں، پھلوں کے باغات سے ستر حوروں کے وجود سے جو ان کے استقبال کے لیے جنت میں کھڑی منتظر ہیں۔ کتنی آسانی کے ساتھ جنت کے پروانے جاری کر رہا تھا۔ یہ علی جواد، جو محمد علی تھا۔ پھر علی جواد بنا اور اب علامہ محمد علی معاویہ۔ اپنی شناخت سے منحرف یہ انسان آج کس مقام پر پہنچ چکا تھا۔ اس کا کاروبار کتنی کامیابی اور تیز روی کے ساتھ اپنی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ بڑھوتری کے ان تمام عوامل کو بھلا زار افتح شیر سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ اقتباس:

> "کتنی حوریں، پچھلے حجرے میں منتظر ہیں۔ تعویذ لکھوانے والیاں مشکل کشائی کے لیے حاضر ہونے والیاں"۔
>
> "کتنی حوریں بھگتائی جا چکی ہوں گی۔ ستر سیکنڈ کے نسخے کے مطابق۔۔۔ علامہ معاویہ۔۔۔
>
> "ارے ان کم فہموں کو موت کی شرط پر حوروں کا وعدہ اور خود روز روز۔۔ نت نئی۔۔ تم سے تو یہ ظالم جاگیر دار ہی انصاف پسند ٹھہرے کہ استعمال شُدگان سے جی بھر جاتا تو اپنے رسہ گیروں اور ڈکیتوں میں تقسیم کر دیتے۔ کتنی کڑی شرط رکھی ہے علامہ صاحب آپ نے خود دنیا میں ہی فردوس بریں کے مزے اور انھیں آپ کے حکم پر آپ کی تجویز کردہ موت سے گزرنے کے بعد فقط وعدہ حور"۔ (۶۰)

یہ شہید گر وعدہ حور و قصور اور شراب طہور کے نام پر نجانے کتنے شہیدوں کو اس مٹی کی نذر کر چکے تھے۔ ان کے لیڈر اگر جام شہادت نوش کر جائیں تو ان کی منڈی میں خرید و فروخت کی کھیپ میں کسی قسم کی کمی نہیں آتی۔ کیونکہ انسانی دماغ میں جذبات اور احساسات اہم کاریگروں کی موجودگی میں کسی بھی قالب میں ڈھالے جاسکتے ہیں۔ یہ انسانی دماغوں میں گھس کر اسے اپنی سوچ کے مطابق ڈھال دیتے ہیں۔ پھر جنت کے خریداروں کا نہ ختم ہونے والا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ان کے نزدیک جان ایک معمولی زر مبادلہ ہوتی ہے۔ اور منڈیوں میں تھوک کے حساب سے آرڈر لینے کے لیے انھیں بس ایک کفر کے فتویٰ کی ضرورت ہوتی ہے جس کی سزا انھیں یہ مسند فراہم کر دیتی ہے۔ جس پر ایک قیمتی ریشمی لباس کے ساتھ یہ بر جمان ہوتے ہیں۔ اب اس قیمتی لباس میں موجود شخصیت علامہ محمد علی معاویہ کی ہو یا پیر اسرار احمد شاہ لعلاں والی سرکار کی۔ پیری مریدی کے قدیم و جدید سلسلے میں انسان اصل اور نقل کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔ جہاں ماں باپ اپنی کنواری جوان بیٹیوں کو مزار پر چڑھی گوٹے کناریوں والی چادروں کی مانند پیر خانوں کی نذر کر جاتے ہیں۔ اور ان پیر خانوں میں ہونے والا کام جتنا رذیل ترین نوعیت کا ہو گا گویا جنت کا حصول ان کے نزدیک اتنا ہی آسان ہو جائے گا۔

گنہگار والدین کے لیے جنت کے دروازے پر دربان بن کر کھڑی ایک نوخیز دوشیزہ عذرا (مشمولہ نیلی بار) کا کردار پیر خانوں کی تقدیس کو کھول کر بیان کرتا ہے۔ وہ معصوم پیر خانے میں اس غرض سے آئی کہ پانچ وقت کی نماز کے ساتھ ساتھ تہجد پڑھ کر تمام دنیاوی و گھر داری کے کاموں کے برابر ثواب کما پائے گی۔ مگر یہاں کا نظام اس کی فہم سے بالاتر تھا۔ یہاں وہی زبان بولی جاتی تھی جو عمال بولوانا چاہتے تھے۔ وہی مذہب شرع کہا جاسکتا تھا۔ جو درگاہ کی ضرورت ہوتا۔ اس میں زیر زبر کی ذرا برابر غلطی بھی دوزخ کے تنور کا ایندھن بن کر سامنے آسکتی تھی۔ یہاں پیر صاحب کو (نعوذ باللہ) خدا کا پرتو تصور کیا جاتا تھا۔ جن کی خدمت جنت کا دروازہ اور ان کا تھوکا چاٹنا مریدوں کے لیے افضل ترین عمل تھا۔ جنت کے حصول کا کس قدر سہل اور آزمودہ نسخہ ؟

بیٹیوں کو درگاہوں میں پیروں کی خوشی پر قربان کر کے جنت اپنے قدموں میں ڈھیر کرنے والے والدین کبھی پیچھے مڑ کر خبر تو لیتے کہ جس مقدس ہستی کو اپنا مائی باپ مانتے ہیں جسے اولادیں امانت کے طور پر سونپ آتے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ کتنی عذرا، یوں جان بچاتی چھتوں سے کودجایا کرتی ہیں۔ عصمت دری و پامالی کی تاریک راہوں کا انتخاب کرنے سے قبل احتجاج کرنے کی صورت میں انھیں جانوروں کی طرح

رسیوں سے باندھ کر گھسیٹا جاتا ہے۔ ایک طرف محفل سماع جاری ہوتی ہے اور دوسری جانب یہ راندۂ درگاہ حرام کی موت ماری جارہی ہوتی ہیں۔

افسوس ناک حقیقت تو یہ ہے کہ اتناسب کچھ ہو جانے کے بعد بھی یہ سلسلہ رکتا نہیں۔ عذرا مر گئی تو اس کی بہن درگاہ پاک کی مٹی اپنے نصیبوں میں لکھوانے آنکلی۔ بہن کی دھتکاری ہوئی جنت کو پانے، درگاہ کو راضی کرنے، وہ دین و دنیا میں مردود ہو جانے سے اپنے اہل و عیال کو بچانے کی غرض سے ہاتھ جوڑے معافی کی طلبگار تھی۔

"ہم راندہ درگاہ ہو گئے۔ ہم دھتکارے گئے۔ ہائے اس جھلی نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا ہم جہنمی ہوئے ہم دوزخ کا بالن ہوئے۔ معافی کا در بند ہوا۔ درگاہ معاف نہ کرے تو اللہ سائیں کیونکر معاف کرے۔۔۔ سائیں! ہمارے پاس بس یہ آخری چڑھاوا بچا ہے یہ بھی دھتکاری گئی تو ہم کس چوکھٹ کے پائے کو تھامیں گے جیتے جی مر جائیں گے"۔ (۶۱)

پیرنی جی کے قدموں میں بیٹھی معافی کی طلبگار، مگر یہ کیسی معافی تھی؟ جسے وہ مانگ رہی تھی۔ وہ اپنی بہن کے مر جانے کو گناہ کبیرہ کہہ رہی تھی۔ وہ اپنے والدین کو جہنمی ہونے سے بچانے کی غرض سے ہر ریاضت اور چلے سے گزرنے کا حوصلہ لے کر آئی تھی۔ بالآخر اس کے بلند حوصلوں نے پیرنی جی کو موم کر دیا اور وہ یہ سوچ کر طمانیت محسوس کرنے لگیں کہ اب کی بار جب پیر صاحب دورے سے لوٹیں تو انھیں ایک بہترین تحفہ مہیا کرنے کا اعزاز حاصل کریں۔ ان کا حجلہ عروسی گلاب اور گیندے کے پھولوں کی لڑیوں سے سجا کر اس لمحے کو یادگار بنادیں گی۔ تاکہ عذرا کی بہن جس چلے اور ریاضت کے لیے یہاں لائی گئی ہے۔ اس کا حق ادا ہو سکے۔

انسانی تاریخ میں استحصال کے ایسے کئی سلسلے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جہاں انسان کو لہو کے بیل بنے تیل نکالتے چلے جاتے ہیں اور اسی تیل سے درگاہوں کے دیئے جلتے ہیں۔ آدم زادوں اور زادیوں کے دکھ اور ذلتوں کی تاریخ بڑی قدیم اور طویل ہے۔ اس ناول میں چند علاقے اور سال آئے ہیں۔ حقیقتاً تو ایک کونے سے دوسرے کونے تک بربریت کی تاریخ چلتی ہے اور چلتی چلی جاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر شہناز شورو:

"اے کی لکھیاوے طاہر اں؟ نہ مرن جوگا چھڈیا نہ جیون جوگا۔ مار سٹیا اے ظالما۔ پر توں اک نیلی بار نو پئی رونی اے، میراتے پوار دیس نیلوں نیل نی دھیے!"۔ (۶۲)

انسان اور نسل انسانی کی تخلیق فطرت سلیمہ پر ہوئی۔ ہر پیدا ہونے والا بچہ خدا کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اور فطرت ہمیشہ عمدہ ہوتی ہے۔ اس کی پیروی کرنے والا کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ جبکہ انحراف کی

صورت میں متضاد قوتوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ جس سے ارد گرد منفی اثرات کا حامل ماحول پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ خطہ ارضی پر انسان کی آمد کے ساتھ ہی خیر و شر کی کش مکش جاری ہے۔ اور اس کش مکش میں کبھی وہ اپنی محنت اور یاضت کی بدولت روحانیت کے عہدے پر فائز ہو جاتا ہے اور کبھی اس قدر رذیل حرکت کر بیٹھتا ہے کہ شیطان کو بھی شکست دے دیتا ہے:

> "اگر انسان کی روحانی بلند پروازی کے آگے فرشتوں کے پر جلتے ہیں تو انسان کی اخلاقی پستی پر شیطان بھی انگشت بدنداں ہو جاتا ہے۔ اگر ایک طرف وہ سدرۃ المنتہیٰ سے آگے قاب قوسین و ادنیٰ کی منزل تک جا پہنچتا ہے تو دوسری جانب تحت الثریٰ سے بھی نیچے گر جاتا ہے"۔ (۶۳)

ایسے ہی مفاہیم کی ترجمانی ڈاکٹر یونس جاوید کے ناول میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ سائیں عطار (مشمولہ: کنجری کا پُل) سے زندگی کا درس حاصل کر کے ظہرہ خود کو طوائف والی زندگی کی اندھیر نگری سے باہر لانے کی بھرپور سعئی کرتی ہے اور کسی حد تک کنارہ کشی اختیار کر چکی ہوتی ہے۔Blank چیک مسجد اور مدرسے کی تعمیر کے لیے دے کر اس دلدل میں گزارے دنوں کا حساب دینا چاہتی ہے۔ اگرچہ مکمل طور پر پاک نہ سہی مگر آئندہ موت کو آسان بنانے کی تگ و دو کرتی ہے۔ ظہرہ سائیں عطار سے پاکیزہ زندگی کا شعور حاصل کرنے چلی تھی۔ مگر پاکیزگی لیے ان چہروں پر منافقت کا لیبل سجا تھا۔ اس لیے اس کا چہرہ دھول میں اٹا رہ گیا۔ اس کی کمائی پر تعمیر ہونے والا مدرسہ اور مسجد دونوں ہی ناجائز ٹھہرے۔ کیونکہ جسم فروش عورت کی کمائی حرام تھی۔ اور حرام کی کمائی پر اللہ کے گھر کی تعمیر کیسے ممکن تھی۔ جسم فروشی کے کالے دھندے سے حاصل ہونے والی رقوم پر بننے والے مدرسہ اور مساجد کو سؤر کے گوشت سے روزہ افطار کرنے کے متبادل قرار دے دیا گیا تھا۔ اس لیے ایمان والوں کے لیے یہ بات گوارہ نہ تھی۔ کیونکہ ایسا ہو جاتا تو اللہ کے گھر کی توہین ہوتی۔ یہ جگہ بدی کا چوراہا بن جاتا۔ کیونکہ اس کی بنیادوں میں عورت کے بدن کی قیمت تھی۔ لہذا اسے جہنم کا ایندھن اور غلاظت کا ڈھیر قرار دیتے ہوئے اللہ کے عذاب کو دعوت دینے سے روکنے کے لیے گرا دینا ہی مناسب تھا۔ نتیجتاً مومنوں نے مل کر اس فتنے اور غلاظت کو نوچ پھینکا، دوزخ کے الاؤ کو بجھا دیا۔ اور گندگی کو صاف کر کے جسم فروشی کی یاد کو جڑ سے اکھاڑ دیا گیا۔

اب ایمان والوں کا ایمان مضبوط ہو چکا تھا وہ کامل مومن بن چکے تھے۔ یہ اس وقت بھی کامل ایمان والے تھے جب سائیں عطار کی شکل میں ایک معتبر انسان محفل سجائے لوگوں کو کامل زندگی کا درس دیتا تھا۔ ظہرہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی خاطر اس در پر جھکی تھی۔ دل اور روح کو تسکین چاہیے ہوتی تو سائیں عطار کے دربار پر

حاضری ضروری ہو جاتی۔ شاید یہ سب اس کی آنکھوں کے سامنے نہ ہوتا اگر وہ اپنے اس جواب پر نظر ثانی کرتی جو سائیں عطار کے سوال کے جواب میں ظہرہ نے دیا تھا۔ سائیں عطار نے اسے کئی مثالیں پیش کیں۔ سب سمجھایا بھی مگر اس کی سوئی ایک ہی بات پر اڑی رہی کہ وہ اس دلدل سے خود کو نکال کر دوبارہ اس میں قدم نہیں رکھنا چاہتی۔ ساری زندگی کی بھیڑ چال میں چلتر بھی اسی کے تھے اور مقدر بھی۔ مگر آج نہ اس کے چلتر کام آئے اور نہ مقدر نے ساتھ دیا۔

مسجد اور مدرسہ مسمار کرنے پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تعمیر سے قبل ظہرہ مشتاق کے ہاتھوں سے دستخط شدہ خالی چیک بکس حاصل کرتے وقت سائیں عطار ظہرہ کے ذریعہ کمائی سے ناواقف تھے؟ کیا انھیں معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک طوائف ہے؟ اور طوائف کی زندگی میں اس کی کل جمع پونجی جسمانی دھندا ہوتی ہے۔ اپنے جسم کا سودا کر کے، حرام کاری کے بدلے ملنے والی کمائی کسی صورت حلال نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی تسلسل کے ساتھ رقوم کے چیک لیے جاتے رہے۔ مسجد اور مدرسہ کی تعمیر زور و شور سے جاری رہی۔ دن رات ایک کر دیا گیا اور درکار وقت سے قبل ہی تعمیراتی کام اختتام پذیر ہو گیا۔ انتھک محنت کا ثمر دونوں کا حق تھا۔ ظہرہ کا بھی اور سائیں عطار کا بھی۔ سالہا سال پر محیط خواہش کو زبان دی اور ظہرہ کو اپنے عقد میں لینے کی بات کر ڈالی۔ انکار پر صالحہ طوائف کا تاریخی واقعہ سنایا، دلائل دے کر مثبت جواب پانے کی سعئ کی مگر ظہرہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ شاید ذات کا عرفان چاہتی تھی۔ مگر کائنات کی ذاتوں کا ادراک حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی تب نا۔ وہ جسے مسیحا جان کر ایمان و یقین کی منازل طے کرتی چلی جا رہی تھی۔ اسی نے سر راہ لوٹ لیا۔ وہ محافظ و نگہبان نہ تھا۔ بلکہ راہزن تھا۔ ایمان کے نام پر ایمان فروش، مذہب کی آڑ میں عورت ذات کا بیوپاری، جو ایک جانب شریعت میں جبر و اکراہ کو ممنوع قرار دیتا ہے تو دوسری جانب اپنا موقف یہ اختیار کرتا ہے کہ اگر کوئی طوائف دینی کام کرتے ہوئے کسی دیندار کی ذات کو اپنا لیتی ہے تو اس کا شمار ولیوں میں ہو سکتا ہے۔ معلوم نہیں دنیا کے نزدیک ولی اللہ اور درویش کی اصطلاح کن معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ یہاں ایک طوائف شادی سے انکار کرتی ہے تو اس کا سانس تنگ کر دیا جاتا ہے۔ اور اقرار کرتی تو ولیوں میں چرچے ہو جاتے:

> "حضرت۔۔۔ میری گستاخیوں کو نظر انداز فرما دیں۔۔۔ معاف کر دیں مجھے۔۔۔ کیسے معاف کر دیں۔۔۔ عطار کا لہجہ تند تھا۔ ہم نے بھرم، عزت، انا اور اپنی توقیر تک کو داؤ پر لگا کر خود کو سوالی بنایا۔۔۔ ہم تمھارے بغیر ادھورے نہ ہوتے۔۔۔ تو اس قدر گر کر کبھی سائل نہ بنتے۔۔۔"(۶۴)

کمزور لمحے کا اسیر ہو کر پاتال میں گرنے والا عطار ظہرہ مشتاق کو معاف کرنے کو تیار نہ ہوا۔ بارہا معافی

کی طالب ظہرہ مشتاق اس یقین کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی کہ معافی دینے والا پروردگار اسے ضرور معاف فرما دے گا۔ اس کی معمولی کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے گا۔ کیونکہ وہ نیتوں کا حال جانتا تھا۔ مگر یہاں وہ فراموش کر بیٹھی تھی کہ اب کی بار اس کا معاملہ خدا کی عدالت میں نہیں بلکہ ناخدائی کے سامنے تھا۔ اور ناخدائی کبھی کسی کو یوں بلاوجہ معاف نہیں کرتی۔ تھوڑے گناہ کی بھاری قیمت چکانا پڑتی ہے۔ مرشد اور مرید کے پاکیزہ بندھن کی لاج آخری سانس تک قائم رکھنے کا عہد لے کر چلی تھی۔ کیا خبر تھی کہ یہ عہد وقت کے ساتھ اپنی شرائط کی نوعیت بدل دے گا۔ ظہرہ مشتاق کے ساتھ ناروا سلوک کے دوران احمد خان (ڈرائیور) اپنی نمک حلالی کی قیمت ادا کرتا ہوا جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

"احمد خان کی لاش ہجوم کی بھگدڑ میں کچلی جا چکی تھی اور کوئی بھی آنکھ لاش کی بے حرمتی پر نم نہ تھی۔۔۔نہ انسانی خون کی ارزانی پر۔"(۶۵)

انسانی ذات اور لاش کی حرمت و بے حرمتی کا درس دینے والا اپنی انا کو ٹھیس لگنے پر انتقامی کاروائی میں مشغول تھا۔ دنیا و آخرت سے سرخرو ہونے کے سارے اعمال سمجھانے والا انسان آج شیطان کا روپ دھارے تمام اوچھے ہتھکنڈے اپنائے ہوئے تھا۔ انسانی اجسام سے بہنے والا درندگی کا سرخ لاوا ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لپیٹتا چلا گیا۔ نیتوں کی سیاہی ظاہر ہو گئی۔

اس میں شک نہیں کہ انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا گیا۔ تخلیق کے وقت خدائے بزرگ و برتر نے انسان کے اندر (خیر و شر) کے دونوں مادے رکھے۔ اور اسے عقل کی بنا پر بہترین راہ اختیار کرنے کا شعور بھی دیا۔ اب یہ انسان کا عمل ہے کہ وہ اپنے لیے کونسا راستہ اختیار کرتا ہے۔ انسان چونکہ خیر و شر کا مرقع ہے اس لیے اس کی تہذیبی و معاشرتی زندگی مذہب کے بنا ممکن نہیں۔ اور مذہب کی رو سے ایک مکمل انسان وہی کہلانے کا حقدار ہوتا ہے جو مکمل طور پر انسانیت کے مرتبے پر فائز ہو۔ وہ مذہب کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر اپنی دنیا و دین دونوں کو سنوارنے کا ہنر رکھتا ہو۔

سقراط اس حوالے سے لکھتا ہے:

"۔۔۔اگر ہمیں نیکی کا علم ہو تو نیکی کریں گے اور اگر بدی کا علم ہو تو اس سے بچیں گے۔ یعنی نیکی اور بدی کا محرک صرف علم ہے"۔(۶۶)

نیکی کے ساتھ ساتھ بدی کا وجود بھی ضروری ہے۔ دونوں کی بدولت انسان ایک دوسرے کے وجود اور غلط صحیح کا پتا لگا سکتا ہے۔ وہ اپنے لیے درست راہ کا انتخاب کر سکتا ہے۔ ایسے ہی راستوں کے اتار چڑھاؤ پر چلتے، گرتے، سنبھلتے کچھ واقعات و کردار کا عکاس محمد الیاس کا ناول "کُہر" ہے۔ جس کی ابتدا ہی ناول نگار خدائے بزرگ و برتر کے نام سے کرتا ہے یہ اسی کی حکمت و دانائی ہے کہ جس نے ظالموں کی رسی دراز کر رکھی ہے۔ ناول میں پیش کیے جانے والا دورانیہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۲ء تک کے دور پر محیط ہے مگر حالات و واقعات کو صرف اسی دور تک مختص کر کے انسانی استحصال کی تاریخ کو پابند نہیں کیا جا سکتا۔ بدتر حالات کے وہ مہ و سال جو ناول نگار نے پندرہ سالہ دور پر لا کر بند کر دیے وہ آج بھی جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اکیسویں صدی دنیا بھر کے ممالک کے لیے ترقی کی بتدریج منازل طے کرنے کی صدی ہے۔ مگر بغور مطالعہ کیا جائے تو قیام پاکستان سے لے کر آج تک ملکی ماحول میں امن و سکوں کو تہہ و بالا کرنے والوں نے اپنے مفاد کے لے ہمیشہ مذہب کی آڑ لے کر انسانیت کی پامالی کی۔ زمینی خطہ دو ٹکڑوں میں بٹا تو مذہب کو بنیاد بنا کر ذاتی مفاد حاصل کیا گیا۔ کسی انسان کی حیثیت کو بلند ہوتے دیکھا تو مذہب آڑے لایا گیا۔ اسے غیر مذہب کا جان کر فتویٰ لگا دیا گیا۔ زمین کو غیر مذہب والوں سے پاک کرنے کا ایک ہی طریقہ سوجھا کہ انھیں کاٹ کر لاشوں کو دریابُرد کر دیا جائے۔ دولت بھی ہاتھ آجائے گی اور سماج میں دکھاوے کی دینداری کا علم بھی بلند ہو جائے گا۔ ناول "کہر" میں جابجا انسان بس لڑتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ اور اس لڑائی میں وجہ مذہب کو بنا کر اپنا ذاتی مفاد حاصل کرتا ہے۔ ملک اکبر کے بیٹوں نے ڈیرہ دیوان میں محصور خاندان کا تلواروں کے زور پر زندگی سے رابطہ ختم کر وادیا تو وجہ اس حویلی پر قبضہ کرنا تھا جس میں وہ خاندان مقیم تھا۔ اسلم جب ہجرت کر کے نئی سرزمین پر قدم رکھتا ہے تو کوئی اس کی پہچان نہیں کرتا۔ اسے اپنے چاروں اور خطرات میں گھری زندگی منہ چڑھاتی دکھائی دیتی ہے۔ ایسے میں پاکھڑا اس کے لیے رحمت کا فرشتہ بن جاتا ہے۔ وہ اسے معاشرتی سطح پر ایک مضبوط مقام دلانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اس کی بیٹی مارگریٹ ذوالقرنین کی بڑی بہن بن کر اس کی پرورش کرتی ہے۔ نین اس کی آنکھوں کا تارا بنا۔ اس سے بے پناہ لاڈ اٹھواتا ہوا بڑھوتری کے عمل سے گزرتا رہتا ہے۔ اسلم اپنا مطلب حاصل کرنے کے بعد پاکھڑا سے شدید تنگ ہو جاتا ہے اور پوچھنے پر وجہ غیر مذہب ہونا بتاتا ہے۔ بازغہ قندیل اس حوالے سے لکھتی ہیں کہ:

> "ناول میں مصنف ان لوگوں کا اصل چہرہ سامنے لاتا ہے جو معاشرے کے کرتا دھرتا اور "معتبر" تصور کیے جاتے ہیں۔ جن کی عزت ان کی دولت سے وابستہ ہے۔ حالانکہ یہ لوگ

اس معاشرے کا رستہ ہوا ناسور ہیں"۔(۶۷)

محلے میں لگی آگ سے اسلم کا گھر بھی جھلسا۔ جادو کی گردان لگائے وہ پاکھڑا اور اس کے گھر والوں کو ذہنی اذیت دیتا رہا۔ ایسے میں شہر بھر میں کرامات والی ہستی کے متعلق خبریں بڑے زور و شور سے پھیل رہی تھیں۔ "سائیں بگا" ذہنی طور پر مفلوج انسان پندرہ سال کی عمر میں گھر والوں سے بچھڑ کر حسینہ اور نصیر الاسلام کے ہتھے چڑھ گیا جن کے شاطر ذہن پہلے ہی ایسے کاموں کے منصوبے بنانے میں ماہر تھے۔ تو ہاتھ لگے قارون کے خزانے کو کیوں چھوڑنے والے تھے۔

"بگا شاہ" بننے والا معصوم بگا ان کے لیے دولت کمانے کا ذریعہ بن گیا۔ دونوں میاں بیوی نے نہایت ہی حساس مسئلے کو لوگوں کے اذہان میں منتقل کیا اور دولت کے انبار لگنے شروع ہو گئے۔ بگا شاہ، بگا سائیں بڑی پہنچی ہوئی سرکار تھی۔ ہر بے اولاد جوڑا اس کے در سے فیض حاصل کر رہا تھا۔ کئی خواتین خالی جاتیں اور جھولی بھر کے لوٹتی تھیں۔ شاذ و نادر ہی کوئی عورت ہو جس کی گود ہری نہ ہوئی ہو۔

جو شخص جیسی پریشانی میں مبتلا ہوتا اس کے لیے ویسے ہی حل تجویز کیے جاتے۔ اسلم اور اس کی بیوی بیٹے کی وجہ سے پریشان تھے کہ ان کا بیٹا پاکھڑا اور اس کے گھر والوں سے نفرت کرنے لگے۔ ان کے لیے کہا گیا کہ آپ کے گھر پر سایہ ہے۔ سائے کا نام سنتے ہی زرینہ بیگم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ ویسے ہی توہمات میں مبتلا ہو چکی تھی۔ حسینہ بیگم کے لیے اس سے بہتر موقع اور کوئی نہ تھا۔ علاقے کے با اثر گھرانے کو اپنی چالبازیوں کی لپیٹ میں لا کر بے پناہ دولت حاصل کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ حسینہ برقع اوڑھ گھر گھر جا کر سادہ لوح خواتین کو بیوقوف بناتی اور "بگا سائیں" کو پیر کہہ کر ان کی خاص الخاص مریدن ہونے کا یقین دلاتے ہوئے خواتین کے مسائل کا حل بتاتی۔ اس کے شاطر دماغ اور کردار نے کبھی کسی کو ذرا برابر شک نہ ہونے دیا کہ وہ انسانیت کے ساتھ کس قدر بھیانک کھیل کھیل رہی ہے۔ مذہب کا سہارا لے کر حسینہ بیگم اور نصیر الاسلام بگا سمیت کئی لوگوں کی زندگی اور عزت کا کھلواڑ کرتے ہیں۔ ان کے قول و فعل کے تضاد پر انسانیت ہاتھ باندھے سر جھکائے بے بس کھڑی دیکھتی رہ جاتی ہے۔ اقتباس:

> "شہر بھر میں اندر ہی اندر صرف متمول خواتین کی سطح تک خبر پھیل چکی تھی کہ کوئی پہنچے ہوئے بزرگ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر چکے ہیں۔۔۔ پردہ پوش ہیں اور ان کے دیدار کی تاب بھی نہیں لائی جا سکتی۔۔۔ ان کا ذکر عام کرنے کی اجازت نہیں۔ ورنہ سخت پکڑ ہو گی۔ آسودہ گھرانوں کی سنجیدہ عورتوں کے حلقے میں حضرت صاحب کے بارے میں ایک تجسس، اشتیاق

اور خوف کی ملی جلی کیفیات پائی جاتی تھیں۔ حقیقت کیا ہے یہ ایک ڈر تھا۔ حسینہ بیگم بھی ایک چھلاوہ تھی جو اپنے پروگرام کے مطابق حاضر ہو جاتی اور کوئی پتا ٹھکانا نہ بتاتی۔ اس نے ایک پراسرار فضا قائم کر رکھی تھی"۔ (۶۸)

حسینہ برقع اوڑھے اچانک ظاہر ہو کر غائب ہو جاتی۔ "آستانہ سرکار بگے شاہ" تک انھی خواتین کو لاتی جن کی تجوریاں بھری تھیں۔ اپنی پارسائی اور ہمدردانہ طبیعت میں جو عیاری چھپائی ہوئی تھی اس میں کسی سے ابتدائی ادوار میں پیسے نہ مانگتی مگر آستانے تک آ جانے والوں کو اس وقت اور بعد میں بہت بھاری قیمت چکانا پڑتی۔

حسینہ بیگم اور نصیر الاسلام نے اپنی نیچ ذہنیت کے مطابق جو منصوبہ بنایا اس میں عوام کو استعمال کرنے کے لیے ذہنی طور پر مفلوج بگے کو پیر کے منصب پر فائز کر دیا۔ بیوی بے بس لوگوں کو آستانے تک اپنی باتوں سے بہلا پھسلا کر لے آتی۔ باقی کا تمام کام نصیر الاسلام اپنی گھٹیا ذہنیت میں سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق انجام دیتا۔ اس کی جنسی ہوس کا شکار کئی شہروں کی کئی عورتیں ہوئیں۔ کس قدر قابل اعتراض اور باعث مذمت تھا یہ سب کہ مذہب کے تقدس کو پامال کرنے کے لیے لالچ صرف روپے پیسے تک نہ رکا تھا۔ بلکہ اس سے کہیں آگے نکل چکا تھا۔ عورت سدا کی جذباتی مخلوق، حسینہ کی باتوں میں آکر عصمت دری کے کام میں نصیر الاسلام کے دھندے کو پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کرتی رہیں۔ وہ جو خوش اور مطمئن سبھی کو یہ بتاتیں کہ ان کی مراد بر آچکی ہے۔ اس بات سے بے خبر ہوتیں کہ رحم مادر میں پلنے والی جان غلاظت میں لتھڑے ہوئے کاروبار کا نتیجہ تھی۔ حسینہ خود بانجھ ہونے کی بنا پر لوگوں کو بے اولادی سے نجات پانے اور دولت کمانے میں اپنے مرد کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ اقتباس:

"برفی کی ایک ڈلی پورا اثر دکھا چکی اور مراد پانے کی آس میں آنے والی بے پیرہن مسہری پر چت لیٹی بے ہوش پڑی تھی۔۔۔ نصیر نے دائیں دیوار پر آویزاں پردے سے دونوں سٹینڈ باہر نکالے اور انھیں مخصوص زاویے سے رکھ کر ہدف پر تیز روشنی ڈالی اور کیمرے سے کئی تصاویر بنا ڈالیں۔ پھر بگے کو لگا بندھا اشارہ دیا تو وہ معمول کی طرح مادرزاد حالت میں مسہری پر آ گیا۔۔۔ تو نصیر اپنے اصل شیطانی روپ میں آ گیا اور قبیح کھیل پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں محو ہو گیا"۔ (۶۹)

ہر آنے والی سائلہ بگے کی جھوٹی برفی تبرک کے طور پر کھاتی اور بے ہوش کر نصیر الاسلام کی ہوس کا نشانہ بنتی۔ اس ہوس کی قیمت اسے صرف ایک بار نہیں بلکہ کئی بار چکانا پڑتی۔ نصیر اتاری جانے والی تصاویر کے ذریعے سائل خواتین کو دھمکیاں دے کر ان سے بے شمار پیسے بٹورتا۔ خواتین اپنی عزت گنوا کر گھر کا سکھ نہیں کھونا چاہتی تھیں۔ اس لیے اپنے ہی گھروں میں چوری کی مرتکب ہونے لگیں۔ اس طرح نصیر الاسلام اور اس کی بیوی نے مل کر مذہب کی آڑ میں انسانیت کے ساتھ خوب کھلواڑ کیا۔ حسن عسکری کی رائے کے مطابق:

"انسان بنابنایا پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنے آپ کو بناتا ہے"۔(۷۰)

انسان کے خود کو بنانے میں اختیار کردہ راہ اس کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ چاہے تو عمدہ راہ کا انتخاب کر کے کاملہ و صافیہ کے مقام تک پہنچ جائے۔ اور چاہے تو متضاد راہ اختیار کر کے انسانیت کے نام کو سوالیہ نشان بنادے۔

اپنی مرضی و منشا کی ایسی ہی راہوں کا انتخاب کرتا بوستان زندگی میں بڑے معرکے سر انجام دے چکا تھا۔ نگر نگر پھرتا ہوا کلکتہ، بمبئی اور حیدر آباد دکن تک کے سفر کر چکا تھا۔ اس نے موقع محل کے مطابق مختلف اوقات میں کئی روپ دھارے، ذاکر، جوتشی، عامل بابا، نعت خوان، نوحہ خواں، رمل فال نکالنے والا، شعبدہ باز غرض کوئی فعل ایسا نہ تھا جو اس سے سرزد نہ ہوا ہو۔ وہ تمام غیر شرعی حرکات کو مذہب کا رنگ دے دیتا۔ بوستان ایسا بہروپیا تھا جس کے تمام روپ کا شمار کرنا محال تھا۔ اسے مذہب کے نام پر عوام الناس کو بیوقوف بنانے کا ایسا ملکہ حاصل تھا کہ کسی قسم کی جسمانی اور ذہنی مشقت دکھانے سے نہیں کتراتا تھا۔ لوگ اسے خدا کا پر اسرار نیک بندہ تصور کرنے لگتے۔ ایسے میں نذر و نیاز کے ڈھیر لگ جاتے، کہیں راز کھل کر اس کی اصلیت واضح نہ ہو جائے، وہ سب کچھ سمیٹ کر اس علاقے سے رفو چکر ہو جاتا۔ بوستان نے زندگی میں جتنے روپ بدلے اتنے ہی نئے رنگ دیکھے۔ اب ایک نیا رنگ جو وہ اپنانے کی خواہش کرنے لگا تھا وہ کافی چونکا دینے والا تھا۔

"اب اس نے سوچا۔۔۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کسی خانقاہ، مقبرے مزار یا بزرگ کی قبر کا قبضہ مل جائے جہاں وہ زندگی کے باقی دن عیش و آرام سے بسر کر سکے۔"(۷۱)

بوستاں بڑا کائیاں تھا۔ وہ لوگوں کی حالت جان کر پتا لگا لیتا کہ اسے آگے کیا چال چلنی ہے۔ اس سے قبل وہ ایک بار سخی ولایت کے دربار پر ایسا کام کر چکا تھا۔ نوحہ خوانی کے دوران سامعین پر رقت طاری ہو گئی۔ مگر شاہ صاحب کافی ژرف نگاہ تھے۔ اس کی اصلیت جان گئے اور وہاں سے جانے کا بول دیا۔ ایسی جگہ بوستان کو

بھی نہیں بھاسکتی تھی۔ جہاں اس کا راز بد دیانتی فاش ہوتا۔ اپنا کپڑا لتا اٹھایا اور چل دیا۔ اب اس کا اگلا پڑاؤ محمد صادق قریشی کے گھر پر تھا۔ صادق قریشی کے سامنے خود کو ولی اللہ ظاہر کر کے اس سے بگے کو مانگ لیا۔ بدلے ہر ماہ رقم دینے کا وعدہ بھی کیا۔ گویا بگے کو اس کے اپنے باپ نے پیسے کے لالچ میں بوستان کے حوالے کر دیا۔ بوستان بگے کو لے کر دور دراز پہاڑیوں میں گم ہو گیا۔ سوچی سمجھی تدبیر کے مطابق اس نے پہاڑی کی چوٹی پر پتھر اکٹھے کر کے ان کی قبر بنائی اور اس پر رنگ برنگی جھنڈیاں لگا کر مزار بنا لیا۔ بگا کو پیر بنا کر بٹھا دیا۔ اور خود اس دربار کا متولی بن بیٹھا۔ اپنے کالے دھندے میں ناکارہ بیٹوں کو بھی شامل کر کے خوب دولت سمیٹنا شروع کر دی۔

اس دوران مجبور و بے کس "بگا" جو اب پھر سے پیر بگا بنا دیا گیا، ایسی حالت جس میں بوستان اور ان کی آل اسے رکھے ہوئے تھی، وہ شدید اذیت میں مبتلا رہتا۔ اسے افیم کا انجکشن لگا دیا جاتا اور بڑی سی کرسی پر بیٹھا اونگھتا رہتا۔ کبھی احتجاج کرتا تو بوستان اور اس کے بیٹے اسے زُود کوب کرتے۔ بگا کے تمام حالات کو ناول میں یکجا کر کے دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ وہ حسینہ بیگم اور نصیر الاسلام کے پاس تھا تو بھی وہ مذہب کی آڑ میں انسانی بربریت کا نشانہ بنا اور آج بوستان نے بھی اسے اپنے گھناؤنے مقصد کے لیے استعمال کیا تو مذہب کا سہارا لے کر۔ بگا کبھی رویا نہیں تھا۔ مگر اب مار کھانے کی اسے تکلیف اس قدر شدید ہوتی تھی کہ وہ باقاعدہ آنسو بہانے لگا تھا۔ بوستان اور اس کے بیٹے اس قدر ظالم تھے کہ انھیں اس اپاہج اور ذہنی طور پر مفلوج انسان پر رحم نہیں آتا تھا۔

محمد الیاس ناول کے ابتدائی اوراق میں اعتراف کی صورت لکھے گئے پیش لفظ میں بیان کرتے ہیں کہ:

> "۔۔۔ ہر قسم کے مال تجارت کے ساتھ ساتھ انسانی جسموں کی منڈیاں تو روز اول سے لگتی ہی رہیں لیکن عصر حاضر میں افکار و نظریات اور عقائد کو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ سر بازار برائے فروخت رکھ دیا گیا ہے۔۔۔ عدل و انصاف کے بغیر کوئی معاشرہ تا دیر قائم نہیں رہ سکتا۔ عرصہ ہوا ہمیں مرے ہوئے۔ ہم عفونت زدہ ماحول میں جیے جانے کی محض نقالی کیے جا رہے ہیں۔ کچھ درندے شکار کر کے اپنا پیٹ بھرنے کے بعد منہ موڑ لیتے ہیں۔ لیکن ایسے سخی صفت درندے شاید مہذب جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔ مردار خور درندوں کی حرص و ہوس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی"۔ (۷۲)

عقائد و نظریات کی سودابازی کر کے بوستان اور نصیر الاسلام جیسے کئی مکروہ چہرے معاشرے میں اپنا مفاد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی اس کامیابی کے پس پردہ نجانے کتنے مجبور و بے بس

افراد اپنے یقین و ایمان کی دنیا لٹا بیٹھتے ہیں۔ پیری مریدی، کرامات یہ سب آج کے دور میں کس طرح سے ظاہر ہوتے ہیں۔ نورانی چہروں کے پس پردہ کس قدر بھیانک اور سفاک چہرے چھپے ہوتے ہیں۔ بگا جیسے نجانے کتنے نامکمل انسان آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی ایسے فروخت ہو رہے ہیں جیسے دور جہالت میں غلام منڈیوں میں فروخت ہوتے تھے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی ظالمانہ فطرت میں گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ کمی آنے کی بجائے تیز رفتاری آئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ حنیف ندوی، مولانا، افکار ابن خلدون، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۹۵ء، ص:۸۹

۲۔ سبط حسن، ماضی کے مزار، مکتبہ دانیال، ۲۰۱۸، ص:۴۳

۳۔ ایضاً، ص:۴۴

۴۔ ڈی۔ ڈی کوسمبی، قدیم ہندوستان کی تہذیب و ثقافت، بک ہوم لاہور، ۲۰۱۲ء، ص:۷۷

۵۔ ایضاً، ص:۸۰

۶۔ سلمٰی کنول، دل کی چوکھٹ پر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸، ص:۴۵۴

۷۔ عاطف علیم، محمد، گردباد، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۷، ص:۱۱

۸۔ ایضاً، ص:۱۰۹۔۱۱۰

۹۔ ایضاً، ص:۱۱۳

۱۰۔ بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۸، ص:۶۱

۱۱۔ ایضاً،، ص:۶۱

۱۲۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد، ۲۰۲۰، ص:۴۰

۱۳۔ ایضاً،، ص:۴۵

۱۴۔ بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، ص،۱۴۱

۱۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، پاکستانی شاعرات، تخلیقی خدوخال، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۸، ص:۵۰

۱۶۔ رابعہ الربا، عورت، مصائب، وجوہات، نفسیات، دعا پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۵، ص:۲۸

۱۷۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص:۴۴

۱۸۔ ایضاً،، ص:۶۲،۶۱،۶۰

۱۹۔ ایضاً، ص:۶۵،۶۴

۲۰۔ مدیحہ رحمٰن، "کیا بنتا ہے، لڑکا یا لڑکی؟" مشمولہ بول کہ لب آزاد ہیں تیرے، مدیرہ سعدیہ بلوچ، وعدہ کتاب گھر کراچی، ۲۰۰۵، ص:۱۱۷

۲۱۔ Corsini encyclopedia of psychology, vol-3, John Will sons, New York, 1984, P:103

۲۲۔طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص:۹۱

۲۳۔ایضاً، ص:۹۵

۲۴۔عاصم بٹ، محمد، دائرہ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۴، ص:۸۷

۲۵۔ نسرین انجم بھٹی، چند سوال، مشمولہ ادب کی نسائی رد تشکیل، مرتبہ: فہمیدہ ریاض، وعدہ کتاب گھر کراچی، ۲۰۰۶، ص:۱۰۵

۲۶۔طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص:۱۰۳

۲۷۔ایضاً، ص:۴۹۷

۲۸۔مستنصر حسین تارڑ، دیس ہوئے پردیس، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۵، ص:۶۰

۲۹۔رابعہ الربا، احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں نسانیت، دستاویز مطبوعات لاہور، ۲۰۱۶، ص:۲۰

۳۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، عورت، جنس اور جذبات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۲ء، ص:۲۵۰

۳۱۔مستنصر حسین تارڑ، دیس ہوے پردیس، ص:۵۰

۳۲۔مستنصر حسین تارڑ، قربت مرگ میں محبت، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۹ ص:۱۷۹

۳۳۔ایضاً:ص:۱۸۶

۳۴۔رابعہ الربا، احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں نسائیت، دستاویز مطبوعات لاہور، ۲۰۱۶، ص:۱۱

۳۵۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، شہر زاد کراچی، ۲۰۰۸، ص:۴۴۵، ۴۴۳

۳۶۔وی۔پی۔سوری، ڈاکٹر، طوائف، سٹی بک پوائنٹ کراچی ۲۰۰۹، ص:۱۵

۳۷۔یونس جاوید، کنجری کا پل، جمہوری پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۱ ص:۴۴

۳۸۔ایضاً، ص:۱۴۴

۳۹۔شورش کاشمیری، اس بازار میں، چٹان پرنٹنگ پریس لاہور، س۔ن: ۳۱

۴۰۔عاطف علیم، محمد، گرد با، ص:۲۱

۴۱۔ایضاً، ص:۲۲

۴۲۔عبد الحمید سالک، اس بازار میں (ایک تعارف)۔۔۔ص:۲۴، ۲۳

۴۳۔عاطف علیم، محمد، گرد باد، ص:۵۳۔۵۴

۴۴۔کامران عباس کاظمی، سید، اردو ناول میں عصری آگاہی / آگہی (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ) مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی، وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، اسلام آباد، ۲۰۱۳، ص:۴۲۳

۴۵۔پروفیسر مجاہد کامران، ڈاکٹر، 9/11 & the new world order، سانحہ ستمبر اور نیا عالمی نظام، مترجم، پروفیسر ظفر المحسن پیرزادہ، یونیورسٹی آف دی پنجاب لاہور، ۲۰۱۴، ص:۴

۴۶۔ فرخ ندیم، تفریق، تقسیم اور ساسا، مشمولہ سہ ماہی ادبیات، خصوصی نمبر: ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ (جلد دوم)، شمارہ ۱۲۳۔۲۴، جنوری تا جون ۲۰۲۰، اکادمی ادبیات اسلام آباد، ص:۲۱۳

۴۷۔مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، سنگ میل پبلی کیشنز اسلام آباد، ۲۰۰۸، ص:۳

۴۸۔محمد شعیب خان، ڈاکٹر، مستنصر حسین تارڑ کے ناول "قلعہ جنگی" کا فنی و فکری مطالعہ، مشمولہ سہ ماہی ادبیات، خصوصی شمارہ: اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ، شمارہ نمبر ۱۲۳۔۲۴، جنوری تا جون ۲۰۲۰، اکادمی ادبیات اسلام آباد، ص:۲۶۱۔۲۶۲

۴۹۔مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، سنگ میل پبلی کشنز لاہور، ۲۰۰۸، ص:۱۲۱۔۱۲۲

۵۰۔مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۳، ص:۴۰۷

۵۱۔ایضاً، ص:۴۱۶

۵۲۔خالد طور، بالوں کا گچھا، آج، کراچی، شمارہ نمبر ۷۲، ۲۰۱۲، ص:۷۴، ۷۳

۵۳۔صفدر زیدی، بھاگ بھری، عکس پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۱۸، ص:۴۱۵۔۴۱۶

۵۴۔ایضاً، ص:۹۳

۵۵۔طاہرہ اقبال، نیلی بار،، ص:۴۰۱

۵۶۔ایضاً، ص:۱۰۶۔۱۰۷

۵۷۔ایضاً، ص:۱۱۳۔۱۱۴

۵۸۔ایضاً، ص:۴۱۲

۵۹۔ایضاً، ص:۲۲۴

۶۰۔ایضاً، ص:۲۵۴

۶۱۔ ایضاً، ص:۳۲۷

۶۲۔ شہناز شورو، ڈاکٹر، نیلی بار: میر ادیس نیلوں نیل، مشمولہ ادبیات خصوصی نمبر: اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ (حصہ دوم)، سہ ماہی شمارہ نمبر ۱۲۳۔ ۲۴، جنوری تا جون ۲۰۲۰، اکادمی ادبیات اسلام آباد، ص:۲۰۱

۶۳۔ سعید احمد، اردو داستانوں میں حیوانات کی علامتی حیثیت (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل اردو) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۵، ص:۳۱

۶۴۔ یونس جاوید، کنجری کا پل، ص:۱۷۸

۶۵۔ ایضاً ص:۱۳۹

۶۶۔ پروفیسر قادر۔ سی۔ اے، ڈاکٹر، اخلاقیات، اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۴ء، ص:۴،۳

۶۷۔ بازغہ قندیل، اردو ناول میں روال فطرت انسانی کی تمثیلات، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۱۲، ص:۱۵۵

۶۸۔ محمد الیاس، کہر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵، ص:۶۶

۶۹۔ ایضاً، ص:۱۰۹

۷۰۔ حسن عسکری، محمد، ستارہ بادبان، مکتبہ سات رنگ کراچی، ۱۹۶۳ء، ص:۱۰۰

۷۱۔ محمد الیاس، کہر، ص:۱۷۰

۷۲۔ محمد الیاس، کہر (پیش لفظ: اعتراف) ص:۸،۷

باب سوم

معاشی استحصال کی مختلف صورتیں اور پاکستانی اردو ناول

الف۔ پاکستان کا معاشی منظر نامہ: اجمالی جائزہ

از منہ قدیم سے ہی انسانی زندگی میں سماجی طبقات کا تصور پایا جاتا ہے۔ ان سماجی طبقات کا ظہور درجہ بندی کی بدولت ہوا اور درجہ بندی کی وجہ دولت اور ملکیت ہوتی ہے۔ معاشرتی سطح پر ہر شخص کو دی جانے والی قدر و منزلت طبقاتی تصور کی بدولت سامنے آتی ہے۔

> "طبقہ انگریزی لفظ Class کا اردو ترجمہ ہے۔ لفظ Class لاطینی زبان کے لفظ Classis سے ماخوذ ہے۔ عہد قدیم میں Classis ہتھیار بند گروہوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ جدید دور تک آتے آتے Class, Classis یا طبقہ لفظ کا استعمال انسانوں کے لیے ہونے لگا"۔(۱)

انسانی زندگی کے بنیادی اور اہم مسائل کی فہرست مرتب کی جائے تو معاشی مسئلہ اہم بن کر ابھرتا ہے۔ ابتدائے انسانی سے آج تک اگر ممالک کے تاریخی اوراق میں جھانکا جائے تو تمام تر تگ و دو معاشی مسائل دکھانے اور سلجھانے کے حوالے سے دکھائی دیتی ہے۔ اب تک جتنے بھی نظام متعارف ہوئے یا قوانین و اصلاحات کا نفاذ عمل میں آیا سبھی کا محرک معیشت ہی تھی۔ انسان نے تاریخ میں اگر کسی کو پچھاڑا تو معیشت ہی بنیاد تھی۔ اگر کسی کے زیر تسلط آیا تو بھی وجہ معاشی مسائل ہی تھے۔

معاشی مسائل کے حوالے سے خاص ہندوستانی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو ہندوستان کی تاریخ جتنی غربت دکھاتی ہے در حقیقت یہ اتنا غریب نہیں ہے۔ اس خطے کی زرخیز مٹی اور وسائل جتنے اعلیٰ نوعیت کے ہیں یہاں کے باشندے اتنے ہی جاہل، گنوار اور بد حال رہے۔ ان کو ترقی کے لیے وہ تمام بنیادی عناصر بر وقت دستیاب تھے جنھیں استعمال میں لا کر یہ دنیا پر اپنا سکہ جما سکتے تھے۔ مگر آرام پسندی نے انھیں یورپین کا زیر دست بنا دیا۔ فرحت اللہ انصاری اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

> "پروفیسر یو کانن نے ۱۹۳۴ء تک ہندوستان کی معاشی اور صنعتی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:"اس ملک میں صنعت کے تمام عناصر موجود تھے پھر بھی یہاں کارخانوں کی مصنوعات باہر سے آتی رہیں۔ چند معمولی صنعتیں قائم بھی کی گئیں تو ان کے کل پرزے ہمیشہ باہر ہی سے آتے رہے۔۔۔ یہاں کچی روئی اور کچی پٹ سن کی بہتات ہے۔ کوئلے

اور لوہے کی فراوانی ہے۔ سونے اور چاندی کے ایسے ذخائر ہیں جو دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔۔۔ غیر ملکی تاجر اپنی مصنوعات کو بڑے منافع کے ساتھ فروخت کرتے ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود ہندوستان صنعت میں اتنا پیچھے ہے کہ اس کی صرف دو فیصدی آبادی صنعتی کارخانوں سے روزی کماتی ہے"۔ (۲)

برطانیہ کی یورش سے قبل ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہی داستان سناتی ہے۔ ہندوستان ایک ایسا خطہ ارضی تھا جہاں ہر طرح کی معدنیات وافر مقدار میں پائی جاتی تھیں۔ یورپ میں اعلیٰ درجے کا فولاد بنانے کا طریقہ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ اس سے قبل یہ ہندوستان کا خاصا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان اپنی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے زور بازو پر جیتا تھا۔ اسے کسی بیرونی طاقت اور سہارے کی ہر گز ضرورت نہ تھی۔ اس وقت خوشحالی میں اس خطے کا ہر باشندہ خوش پوش اور خوش خوراک دکھائی دیتا۔ اس خطے کی تاریخ میں کئی واقعات ایسے آئے، جب مختلف علاقوں سے لشکر آکر یہاں حملہ آور ہوئے۔ متعدد نے یہاں سے اپنی مرضی و منشا کا سامان اٹھایا اور چل دیے۔ چند ایک قبائل اپنی زندگی کے قیمتی ایام اس خطے کو وقف کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

تاریخ میں مغلیہ سلطنت کے بعد دوسرا بڑا دور برصغیر میں انگریز سامراج کا مانا جاتا ہے۔ برصغیر پر مغلیہ سلطنت کی ابتدا سے جتنا اس خطے کی شہرت میں اضافہ ہوا، انگریز سلطنت نے اپنے دور میں اگرچہ یہاں کافی مثبت تبدیلیاں لائیں مگر ان کے متعارف کردہ نظاموں نے اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا۔ کھوکھلی جڑوں والے خطہ زمین پر انسان کا بھرپور استحصال ہوا۔

یورپ نئے صنعتی نظام کا گہوارہ بنا تو اس کی بنیادی جڑیں برصغیر ہی کی تاریخ میں پیوست دکھائی دیتی ہیں۔ اگر بغور دیکھا جائے تو برطانوی سامراج نے ہندوستان کو فتح محض اس مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے کیا کہ اس کا ہر سطح پر استحصال کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی معیشت پر قبضہ کیا جائے۔ انگریز بادشاہ نے تمام ترقی کے زینوں کی ابتدا برصغیر سے کی۔ مگر مرکز اپنے علاقوں کو بنایا اور برصغیر کو اپنا دست نگر رکھا۔ تاکہ اس کو اپاہج بنائے رکھے۔

انگریزوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے قدیم رائج کردہ نظاموں کو اپنی مرضی سے بدلا۔ مغلیہ دور میں زرعی زمین کا کسان مالک تھا۔ مگر انگریز کے ترمیم کردہ نظام کے تحت زمین کا مالک حکمران کو بنا دیا اور کسان

محض ایجنٹ کی سی زندگی بسر کرنے لگا۔ زمین کی ملکیت کے لیے شرط یہ رکھی گئی کہ اگر کسان ادا کر دے تو اس کو ملکیت دے دی جائے گی۔

"برطانوی نظام میں کسان الگ ہو گیا اور زمین دار الگ ہو گیا۔ اس سے جابر اور مجبور دو طبقے وجود میں آ گئے۔ یعنی ایک استحصالی طبقہ اور ایک وہ طبقہ جس کا استحصال کیا جائے۔ ساہو کار قرض دینے کے لیے اس نظام کا حصہ بن گیا اور کسان زمیندار اس کے شکنجے میں آ گئے"۔ (۳)

زیر تحقیق موضوع چونکہ پاکستانی ناول ہے اس لیے چند اہم معلومات برصغیر پاک و ہند کی تاریخ سے لینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ برصغیر کی ازلی تاریخ جیون کے دلخراش واقعات پر مبنی ہے۔ کہیں بیرونی حملہ آور، کہیں بادشاہی نظام کی سختیاں، تو کہیں ذات پات کے نظام کی جھلکیاں یہ ایسی سطحیں ہیں جو ظلم و ستم کی تاریخ بڑی واضح کر کے دکھاتی ہیں۔ بیرونی حملہ آوروں کی شورشوں نے ہندوستان کے لوگوں کا بھرپور طریقے سے استحصال کیا۔ دہلی ہندوستان کا مرکزی اور اہم شہر کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ سترہویں صدی میں بیرونی حملے سے تباہ و برباد ہو گیا۔ افراتفری کے اس سماں میں کسی کی جان محفوظ نہ تھی۔ لوگ اس علاقے کو چھوڑ کر اردگرد ہجرت کر گئے۔ اپنی جنم بھومی کو چھوڑنا یک لخت گویا جسم سے روح کا پرواز کرنا تھا مگر کوئی اور چارہ نہ ہو تو کیا کریں۔ محفوظ پناہ گاہ کے متلاشی دوسرے شہروں میں قیام پذیر ہونے پر مجبور ہو گئے۔

"اسی صدی میں فرانسیسی امرا نے بھی یہاں کی غریب عوام کو یرغمال بنایا اور ماریش کے جزیرے پر لے گئے جہاں ان سے محنت مزدوری کرواتے اور اس کا کوئی معاوضہ بھی نہ دیتے"(۴)

مغلیہ سلطنت کا دور برصغیر میں جہاں بیرونی حملہ آوروں کے آورد کے خلاف تھا وہیں ملکی سطح پر جبر و استحصال کی طویل داستان بھی لیے ہوئے ہے۔ جب بھی کوئی نیا بادشاہ تخت نشین ہوتا تو ظلم کی ایک خاص فضا قائم ہو جاتی۔ ولی عہدی کی جنگ میں ایک دوسرے کو المناک نتائج سے دوچار کیا جاتا۔ مشہور مغل بادشاہ شاہجہاں کے بیٹوں میں ولی عہدی کی جنگ چھڑی تو بھائی نے بھائی کو قتل کروا دیا۔ لالچ اور نفرت کی اس جنگ کی انتہا قتل سے بھی آگے چلی گئی۔ مقتول کی لاش کو مرنے کے بعد بھی چین نہ لینے دیا اور مسلسل تین روز تک اسے بازار کے چوراہے میں لٹکائے رکھا۔ ظلم و جبر کی یہ روایت آخر تک برقرار رہی۔

استحصال دنیائے انسانی کے تصور ملکیت کے ساتھ کرہ اراضی پر پنپتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور طبقاتی تصور نے اسے مزید تقویت دی۔ پاکستانی معاشی منظر نامے پر تاریخی تناظر میں نگاہ دوڑائی جائے تو کئی طبقات ہمارے سامنے آتے ہیں جو اپنے استحصالی عزائم کو پورا کرنے کے لیے کئی روپ اپنائے ہوئے ہیں۔ معاشرے کا حساس طبقہ ہونے کی حثییت سے ادیب استحصالی طبقات کے چہرے اپنی تحریروں کے ذریعے دکھاتے آئے ہیں۔ چاہے استحصال کرنے والے ہوں یا استحصال کا شکار ہونے والے دونوں طرح کے لوگ ادب کی دنیا میں سامنے آتے ہیں۔ صنف نثر میں ناول چونکہ وسیع کینوس رکھتا ہے اس بنا پر اس میں واقعات کا بھرپور اظہار ممکن ہے۔ اگر استحصال کا پاکستانی اردو ناول کے تناظر میں مطالعہ کیا جائے تو متعدد پہلوؤں سے واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر ان پہلوؤں سے پردہ اٹھانے سے قبل یہ ضروری ہے کہ ان نظاموں کے بارے میں ضروری معلومات درج کی جائیں جو استحصالی رویوں کے نتیجے میں سامنے آتے ہیں۔ یہ نظام کسی ایک وقت و حالات کی پیداوار نہیں تھے بلکہ ایک نظام کے بننے اور انسانی زندگی پر منضبط ہونے میں کئی سال گزرے۔ کئی تبدیلیاں آئیں۔ جو امیر تھے وہ امیر تر ہوتے چلے گئے اور جو غریب تھے غریب تر ہوتے چلے گئے۔ زیر تحقیق موضوع میں جن نظاموں کے تحت ناول کا مطالعہ کیا جائے گا وہ درج ذیل ہیں۔

۔ جاگیر دارانہ نظام

۔ سرمایہ دارانہ نظام

ب۔ جاگیر داری و سرمایہ داری نظام کے تحت انسانی استحصال کا جائزہ:

پاکستانی اردو ناول اور جاگیر داری نظام کے بیان سے قبل ضروری امر ہے کہ جاگیر داری نظام کی ابتدائی تاریخ سے واقفیت حاصل کی جائے آیا یہ نظام کیا ہے؟ کہاں سے شروع ہوا؟ برصغیر کی انسانی تاریخ پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ برصغیر کے بعد خاص پاکستان میں اس نظام کی جڑیں کس حد تک پیوست ہیں۔

"Feudalism: جاگیر دارانہ، تعلقہ داری، عہد وسطیٰ کا جاگیر داری نظام اور اس کی خصوصیات، زمین کی موروثیت کا نظام، زمینداری، وڈیرہ شاہی"(۵)

زمینداری یاوڈیرہ شاہی نظام کی ابتدا یورپ سے ہوئی جب رومی سلطنت زوال کا شکار ہوئی اور جرمن قبائل کو فتوحات حاصل ہوئیں تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو رومی مملکت کے نظام میں دولت کی مساویانہ تقسیم سے غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا چلا گیا ٹیکس کا ایک غیر مساوی نظام رائج کیا گیا جس میں تمام رقم غریب کو ادا کرنا پڑتی تھی۔ زمین پر اس قدر ٹیکس دے دے کر کسان تھک ہار کر شہروں کا رخ کرنے لگے جس سے زیادہ تر زرعی زمین بنجر ہو کر رہ گئی۔ ایک دفعہ زوال پذیر ہو جانے والا یہ نظام پھر سے اس وقت عروج کی بلندی کو چھوتا ہوا دکھائی دیتا ہے جب جرمن قبائل نے حملوں کے لیے شہروں کا رخ کیا۔ شہروں کی تباہی و بربادی دیہی علاقوں کی آبادکاری کا باعث بنی۔ جرمن قبائل کے حملوں سے شہروں میں ایک بڑی سطح پر تباہی و بربادی ہوئی۔ تمام نظام زندگی درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ ابلاغ کا نظام بھی بربادی سے دوچار ہوا۔ ایسے حالات میں یہ ضروری امر تھا کہ ہر گاؤں اور قصبہ اپنی سطح پر خود کفیل ہو۔

باہر کی فضا میں پھیلا خوف و ہراس لوگوں کے اندر تک سرایت کر گیا۔ معاشی و معاشرتی ابتری کے اس دور میں جبکہ کسان اپنے آپ اور گھر کو غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ ان کی آنکھیں کسی ایسے شخص کو ڈھونڈتی تھیں جو طاقت اور دولت کے بل بوتے پر ان کا سرپرست بنے۔ امرا اور رؤسا میں ایسے لوگ جو طاقت کی بنا پر دوسروں سے افضل تھے انھوں نے اس کام کو خوب نبھایا۔ اب گاؤں کا تمام انتظام و انصرام جس شخص کے ہاتھوں میں تھا اسے 'Lord' کہا جانے لگا۔ بیرونی خوف و ہراس کو ختم کر کے اس "Lord" نے آہستہ آہستہ اپنی ذات کا خوف لوگوں کے دل و دماغ میں بھرنا شروع کر دیا۔ تمام انتظامی امور، جھگڑوں کے فیصلے، ٹیکسوں کو عائد کرنا، قیمتوں کا تعین اور لوگوں کی بنیادی ضروریات سمیت سبھی کام اس کے ذمہ ہوتے جو وہ اپنے کارندوں سے کرواتا تھا۔

کاموں کی نوعیت کی بدولت طبقات بننا شروع ہو گئے۔ اور یہ ہی طبقات درحقیقت جاگیرداری نظام کی بنیادی اکائی تھے۔ یہ تو تھے وہ حالات جنھوں نے عام کسانوں کی زندگی میں باقاعدہ جاگیرداری نظام کو رائج کیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں یہ نظام کس طرح ظہور پذیر ہوا؟ مگر اس سے قبل یورپ میں پیدا اور پروان چڑھنے والے اس نظام کا پوری دنیا میں پس منظر جان لینا ضروری ہے کیونکہ اس نظام کی جنم بھومی وہی ہے۔ یورپ میں ہی پروان چڑھا اور وہاں سے دوسرے ممالک میں گیا۔

پوری تاریخ میں جاگیر داری نظام میں جاگیر دار کل طاقت رکھتا تھا۔ بے پناہ دولت و ثروت اور فوجی انتظام و انصرام ہونے کی بنا پر لوگوں کے دلوں میں اس کی ذات کا خوف پایا جاتا تھا۔ اپنی طاقت کے نشے میں غریب عوام کا پوری طرح استحصال کرتا۔ یہ کرہ ارضی پر ایک ایسا ناخدا تھا جو اپنے غلط و صحیح کا کسی کو جواب دہ نہ تھا البتہ باقی تمام لوگ اس کے جواب دہ ہوتے تھے۔ زندگیوں کے معاملات ایک خاص ڈگر پر چلانے کے لیے اس کے سامنے اپنا سر جھکائے رکھتے چاہے یہ جائز بولتا چاہے ناجائز۔

"A Feuded Lord who possessed political power also possessed important sources of wealth-land and building, markets and miles, forests and rivers and this wealth was naturally useful in maintaining or increasing their political authority." (6)

یورپی جاگیر دارانہ نظام میں چار قسم کے طبقے سامنے آتے ہیں۔

۱: زمینی طاقت کے حوالے سے جو شخص زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ وہ اپنے طاقتور ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عوام کا استحصال کرتا۔ اس کا طرز استحصال کچھ اس طرح سے سامنے آتا، ان کا سرپرست اور نگہبان بن کر ذاتی مفاد کے لیے ان کی سانسوں کی ڈور ہمیشہ اپنے پاس رکھتا۔ اور جب چاہتا اس ڈور کا استعمال کرتا۔ لوگوں کی ذاتی زندگیوں سے لے کر عدالتی فیصلوں تک سبھی کچھ اختیار اس لارڈ کے پاس ہوتے تھے۔ یہ فیوڈل لارڈ ساری طاقت کے ساتھ سیاسی طاقت کا بھی مالک ہوتا تھا۔ اس لیے ریاستی معاملات میں بھی اس کی حکم عدولی ممکن نہ تھی۔

۲: پوری فیوڈل ازم کی تاریخ میں دوسرا طبقہ فوجی انتظامات کا مالک تھا۔ اس طبقے کے پاس دولت و طاقت کی فراوانی ہوتی۔ دوران لڑائی اگر مخالف سے زیادہ طاقتور ہوتے تو اکثر ان کی زمین ہتھیا لیتے۔ تاریخی لڑائیوں کے اس لامتناہی سلسلے کی بنا پر ان جنگ جوؤں کے حوالے سے لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے خوف و دہشت کے بے پناہ جذبات پائے جاتے۔ فوجی نظام میں ضرورت کے تحت مزید طبقات پیدا ہوئے۔

۳: مذہبی طبقہ یورپی فیوڈلز میں تیسرے نمبر پر آتا ہے۔ مذہبی پیشوا بھی دوسرے جاگیرداروں کی طرح اپنی خدمات کے صلے میں باقاعدہ زمینی طاقت کے مالک ٹھہرے۔ اور کلیسائی نظام میں مذہب کے نام پر جاگیریں عطا کرنا باقاعدہ ایک روایت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

۴: یورپی فیوڈلز کی تاریخ میں مظلوم ترین طبقہ کسان کا تھا۔ یہ ایسا پیداواری طبقہ ہوتا تھا۔ جو کسی قسم کی ملکیت تو نہیں رکھتے تھے البتہ محض اپنے مالک کی اجازت سے چند ضروری اشیا کو استعمال کرنے کا حق رکھتے تھے۔

> "سرف کا حال جانوروں سے کچھ ہی بہتر ہوتا یہ لوگ اپنے زمیندار کو چھوڑ کر بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔ اگر فرار ہونے کی کوشش کرتے تو ان پر بھاری جرمانہ عائد ہوتا اور سخت سزائیں دی جاتیں یہ لوگ خریدے اور فروخت کیے جاتے تھے۔ کسان اپنے لارڈ کے ہر حکم کا غلام ہوتا"۔(۷)

جہاں تک ہندوستان کی تاریخ میں جاگیرداری نظام کے کردار کا تعلق ہے۔ تو یہ مسلمانوں کے دور حکومت میں دہلی کے ابتدائی سلاطین نے متعارف کرایا۔ اور اس نظام کے متعارف کرانے سے مرکزی حکومت کی جانب توجہ گھٹ گئی۔ کم و بیش تیرھویں صدی کے اواخر میں غیاث الدین بلبن نے اس نظام کی حوصلہ شکنی کر کے اسے کافی حد تک کمزور کر دیا۔ ان کے بعد علاؤالدین خلجی نے اپنے دور حکومت میں اسے مکمل طور پر ختم کر دیا۔ البتہ فیروز شاہ تغلق جب تخت نشین ہوا تو اس نظام کی بحالی کے حوالے سے خوب پیش رفت ہوئی جو کامیاب ٹھہری۔ عروج و زوال کی اس داستان میں یہ نظام مختلف صورتوں میں ہندوستان کے تاریخی نقشے پر برجمان ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

۔ پہلی صورت: ہندوستان کی قدیم معاشرتی زندگی کی تاریخ خانہ بدوشی تھی۔ کسی جگہ ٹک کر نہ رہنے سے زمین کی قدر و قیمت نہ ہونے کے برابر تھی۔ جاگیرداری کی ابتدائی صورت ہندوستان میں اس وقت سامنے آئی جب مختلف برادریاں زمین پر قابض ہونے لگیں۔ تو زمین کی ملکیت ایک برادری سے دوسری میں منتقل ہو جاتی ۔ اس صورت میں زمین کسی ایک شخص کی نہیں بلکہ برادری کے ملکیت ہوتی تھی۔

۔ دوسری صورت: خلفائے راشدین کے دور میں ایسی زمین جو بنجر تھی اسے عوام میں اس صورت تقسیم کر دیا جاتا، کہ محنت کے بعد اس کا مردہ پن ختم ہو سکے۔ لیکن زیادہ عرصہ اس زمین کو کاشت کرنے والے اس پر

قابض ہونا شروع ہو گئے۔ اس طرح یہ اقطاع دار اس پر قبضہ کر کے اسے موروثی اور ذاتی بنا لیتے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا کہ ان اقطاع داروں کے پاس زمین کی وجہ سے اتنی طاقت آجاتی کہ حکمران ان کی مرضی ومنشا کے مطابق منتخب ہوتے۔ جاگیر داری نظام کی یہ صورت عربوں کے دور کی رائج کردہ سامنے آتی ہے۔ عہد سلجوق تک یہ اصول چلتا رہا۔ چنانچہ غیاث الدین بلبن نے اپنے دور میں اس نظام کی نفی کی۔ کیونکہ اپنی بادشاہت کا وجود تبھی ممکن تھا جبکہ ان اقطاع داروں کے اثر ورسوخ کم کیے جاتے۔

۔ تیسری صورت: عہد اکبر میں جتنے بھی سرکاری منصب دار ہوتے انھیں تنخواہ نقد دی جاتی یا پھر اس کے عوض اراضی عطا کر دی جاتی۔ اکبر بادشاہ کے دور کا رائج کردہ یہ نظام مغلیہ حکومت کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتا گیا۔ اس نظام نے کئی منصب داروں کو جاگیر دار بنایا۔ کاشت کار اور مزارعین لگان اور محصول کے لیے ان جاگیر داروں کے جواب دہ ہوتے تھے۔ اس نظام سے جہاں ناجائز اختیارات کے استعمال میں کمی واقع ہوئی وہیں بادشاہ کی نرم مزاجی نے ان منصب داروں میں یہ جرات پیدا کر دی کہ انھوں نے کسانوں اور کاشت کاروں سے لگان کے طور پر ساری کمائی ہڑپ کرنا شروع کر دی۔

> ”مغلیہ جاگیر داری نظام میں کسان ۔۔۔ کی زندگی مفلسی اور غربت کی تصویر بنی رہتی۔ حکومت جو ٹیکس زمینداروں پر عائد کرتی وہ اسے کسانوں پر ڈال دیتے۔ ان مظالم سے تنگ آکر کسان یا تو جنگلوں میں بھاگ جاتے یا کسی بڑے زمیندار کی حفاظت میں آجاتے۔ اس کا آخر نتیجہ یہ نکلا کہ زمین بنجر اور ویران ہونا شروع ہو گئی۔“(۸)

ہندوستانی جاگیر دارانہ نظام کی تاریخ میں چوتھی صورت اس وقت جلوہ گر ہوتی ہے۔ جب مغلیہ سلطنت کو زوال آتا ہے۔ امیر سے امیر تر اور غریب سے غریب تر ہوتے طبقات میں ہر قسم کی بے راہ روی، تنگ نظری اور خود غرضی جیسی صفات جنم لینا شروع ہوئیں۔ تو معاشرہ شکست وریخت کا شکار ہونا شروع ہو گیا۔ طبقات میں پھیلی معاشی تفاوت سے بیرونی طاقت نے معاشرے کو اپنے تصرف میں لے لیا۔ چنانچہ برطانوی اقتدار کے بعد ہندوستان میں بھی پوری طرح فیوڈل لارڈز والا نظام رائج ہوا۔ اپنی سہولت کے لیے انھوں نے جاگیر داروں کی اہمیت بڑھائی اور ان کو بہت سے اختیارات عطا کر دیئے محض اس لیے کہ انھیں

وقت پر ریونیو ملتا رہے۔ یہ جاگیر دار حکومت وقت کو خوش کرنے کے لیے زمین پر خدا بن بیٹھے اور کسانوں کے ساتھ ان کا ناروا سلوک بڑھتا چلا گیا۔

قانون فطرت ہے کہ ظلم بڑھتا ہے تو اس کی اخیر بھی ہوتی ہے۔ ظالم پر کوئی اور ظالم آتا ہے جو اس سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ جاگیر داری نظام میں انصاف کا ترازو بھی ظالموں کے ہاتھ میں آگیا تھا اس لیے اس نظام کو روبہ زوال ہونا تھا۔ برصغیر کی سرزمین پر یہ نظام اپنا مکمل عروج دیکھا کر زوال پذیر ہوا تو اس کی جگہ سرمایہ داری نظام نے لے لی۔

برصغیر پاک وہند کی سرزمین جب اس نظام کی خرابیوں سے پاک ہو کر سرمایہ داری نظام میں ڈھلی تو اصولاً پاکستان کو بحیثیت ایک آزاد ملک اس نظام سے آزاد ہونا چاہیے تھا۔ آمری نظام کی نفی کر کے ایک ایسا ملک جو جمہوری اصولوں پر قائم ہونا تھا۔ اس کی جڑوں میں جاگیر داری نظام پیوست تھا۔ اس مضبوط نظام نے جمہوریت کی جڑیں کھوکھلی کر کے رکھ دی تھیں ۔ ایک جمہوری ملک کی بنیادوں میں پیوست جاگیر داری و زمینداری نظام انگریز بادشاہ سے تحفے میں ملا۔ اور اس تباہ کن نظام سے آج تک چھٹکارا حاصل نہیں ہو سکا۔ اس ملک خداداد میں جاگیر داری نظام کا چہرہ کچھ اس طرح سے سامنے آتا ہے کہ یہاں پر زمین کا مالک اپنی زمین کسان کاشت کار کو ٹھیکہ پر دے دیتا ہے۔ دوران کاشت ہر قسم کی سہولت مثلاً بیج، پانی، کھاد وغیرہ کا انتظام کاشت کار کرتا ہے۔ مالک صرف سالانہ رقم وصول کرتا ہے۔ اس طرز کے مالکان زمین سو میں سے پانچ فیصد دکھائی دیتے ہیں۔ زیادہ تر کا طریقہ کار کچھ اس طرح سے سامنے آتا ہے کہ وہ مزارع یا ہاری سے رقم کے ساتھ ساتھ تیار فصل کا حصہ بھی وصول کرتے ہیں۔ مخلوق دیہہ کی نجی زندگی میں بھی یہ جاگیر دار طبقہ اپنے فیصلے مسلط کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وڈیرہ ازم کے اصول میں غریب کی زندگی اس کی اپنی نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک کٹھ پتلی کی طرح اس طرز پر ویسا ہی ناچتا ہے جیسا جاگیر دار اس کو حکم دیتا ہے ۔ جاگیر دار اس مخلوق خداوندی کا استحصال معاشی، معاشرتی، نفسیاتی اور جنسی ہر سطح پر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے ظلم و ستم سے تنگ آکر اگر کوئی غریب بھاگ جانے کی ہمت کرتا بھی ہے تو وڈیروں کی تیار کردہ ذاتی جیلوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جہاں صرف وہ ہی نہیں اس کی آئندہ نسلیں بھی آخری سانسوں تک سڑتی رہتی ہیں۔

ایک جمہوری ملک میں سیاست کی تاریخ پر بھی انھی وڈیروں اور جاگیر داروں کا قبضہ دکھائی دیتا ہے۔ قیام کے ساتھ ہی تمام بڑی اور اہم نشستوں پر یہ ہی وڈیرے بر جمان ہو گئے اور تمام اختیارات پہلے کی طرح آج بھی انھی کے پاس دکھائی دیئے جانے لگے۔ اگر چہ کئی بار ان حالات کو بدلنے کی کوشش بھی کی گئی تا کہ چند اصلاحات نافذ کر کے ملک کو صحیح معنوں میں جمہوری بنایا جا سکے۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایسے خواب دیکھے تو بہت گئے مگر آج تک کوئی بھی ایسا نہ تھا جو شرمندہ تعبیر ہو سکتا۔ سبط حسن اس حوالے سے رقمطراز ہیں

۔

> " زرعی اصلاحات نہ صرف پاکستان بلکہ ایشیا اور افریقہ کے تمام پسماندہ ملکوں کا سب سے ضروری مسئلہ ہے۔ اس صدیوں پرانے فرسودہ نظام کو بدلے بغیر ملک نہ صحیح معنوں میں آزاد ہو سکتا ہے اور نہ جمہوری قدریں فروغ پا سکتی ہیں نہ پیداوار میں اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ عام لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو سکتا ہے۔ "(۹)

مختصر ا اگر اس نظام کی تاریخ بیان کی جائے تو جہاں بنجر زمین سیر اب ہوئی وہیں انسانی سرسبز زندگیاں ویران ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔

سرمایہ داری نظام: دنیاوی تاریخ میں دو بڑے نظام انسانی زندگی میں ہر سطح پر تبدیلی لانے کا باعث بنے۔ یورپ میں چودھویں سے سولھویں صدی تک کا زمانہ ایسا تھا جو کئی تبدیلیاں لایا۔ جاگیر داری نظام کے خاتمے کے ساتھ ہی عوام میں آگہی کے ایک نئے دور نے کروٹ لی۔ علوم کے کئی شعبوں میں اہل مغرب نے ترقی شروع کی۔ جغرافیائی سطح پر کئی ممالک کے ساتھ روابط میں بہتری آگئی۔

لین دین کے نظام میں بھی تبدیلی سامنے آئی۔ سوداگروں کے پھیلے کاروبار کی بدولت کئی تجارتی چوراہوں پر شہر بسنا شروع ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں دولت و ذہانت کے وہ مراکز جو پہلے قصبوں میں پائے جاتے تھے اب شہروں کی طرف سرکنے لگے۔ اور اس طرح شہر تجارت، صنعت اور علمی و ادبی سرگرمیوں کے مراکز بنے۔ صدیوں تک جاگیر داری اور کلیسائی نظام کے شکنجے میں پھنسے سوداگر اور اہل حرفہ جن میں آگے بڑھنے کی لگن تھی۔ کئی محاذوں پر جنگ ریزی کے بعد بالآخر قدیم نظام کے شکنجے سے آزاد ہو کر ایک نئے نظام کا حصہ بنے۔ پرانے جاگیر داری نظام کی جگہ نئے نظام نے لی جو "سرمایہ دارانہ نظام" کہلایا۔

عالمی انسائیکلوپیڈیا میں اس نظام کی تعریف کچھ اس طرح سے سامنے آتی ہے۔

"۔۔۔سماجی معاشیاتی تشکیل جس نے جاگیر داری نظام کی جگہ لی۔ سرمایہ داری کی بنیاد ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت اور اجرتی مزدور کے استحصال پر ہے۔ قدرزائد کا حصول سرمایہ دارانہ پیداوار کا بنیادی اصول ہے۔ پیداوار کی بد نظمی ، مخصوص عرصہ بعد بحران شدید بے روزگاری، عوام کی غربت اور مقابلہ بازی و جنگیں سرمایہ داری نظام کا خاصہ سمجھی جاتی ہے۔ (۱۰)"

دو بڑے معاشی نظاموں کی تاریخ وار تقابیان کرنے کا مقصد استحصالی رویوں کو جانچنا ہے۔ کہ آیا ایک نظام میں جو استحصالی محرکات تھے وہ دوسرے میں جوں کے توں رہے؟ یا ان میں کمی بیشی آئی؟ جاگیر داری نظام میں جاگیر دار طبقہ کسان اور مزراع کا استحصال زندگی کی ہر سطح پر کرتا رہا۔ جب جاگیر دار طبقہ زوال پذیر ہوا تو اس کی جگہ سرمایہ دار نے لی۔ سرمایہ دار جاگیر دار کا دوسرا ترقی یافتہ روپ تھا۔ اس نے دولت وثروت سے اپنے اثرورسوخ بڑھائے۔ اور جس حد تک ممکن ہو سکا انسان کا استحصال کیا۔

سرمایہ داری نظام کے تحت تجارتی اور صنعتی دو طرح کے طریقے سامنے آئے۔ تجارتی سرمایہ داری کی ابتداء اس وقت ہوئی جب کاریگروں میں سے بہتر زندگی گزارنے والے طبقے نے الگ سے اپنی جماعتیں بنالیں ۔ اور اس طرح یہ نظام چل نکلا۔ اس طریقہ آمدن میں سرمایہ دار کا سرمایہ کہیں پر بھی صرف نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ کاریگر اور خریدار کے مابین ہونے والے معاملات سے مالک کا فائدہ نکل آتا تھا۔ یعنی ایک جگہ سے سستا مال خرید کے دوسری جگہ منافع کے ساتھ بیچ دیا جاتا۔ تجارتی سرمایہ داری کے نظام کی ساخت ان بنیادوں پر قائم کی گئی تھی کہ اس کا پیداوار سے قطعا کوئی تعلق نہیں تھا۔

تجارتی سرمایہ داری کے بعد صنعتی سرمایہ داری کے طریقہ کار کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں لوہے اور فولاد کے استعمال کی بدولت پورا معاشرہ زراعت سے صنعت کی جانب منتقل ہونا شروع ہو گیا۔ تبدیلی کے اس عمل کی ابتدا سب سے پہلے انگلینڈ سے ہوئی اور اس کے بعد پورے یورپ میں پھیل گئی۔ صنعتی سرمایہ داری کی بدولت آنے والے انقلاب کو جس طبقہ نے خوش آمدید کہا وہ بورژواطبقہ تھا۔ کیونکہ علم و حرفت کے تمام در انھی کی اجازت سے کھلتے تھے۔ صنعتی سرمایہ داری کی بدولت

شہروں میں بڑے پیمانے پر کارخانے قائم ہوئے۔ چھوٹے چھوٹے سوداگر اور کاروباری لوگ بڑے کارخانہ داروں کے دست نگر ہو کر رہ گئے۔

صنعتی سرمایہ داری نے جہاں کسانوں کو جاگیر داری نظام کی غلامی سے نجات دلائی وہاں ان سے زمین کا وہ ٹکڑا بھی چھین لیا جس پر محنت کر کے وہ اپنا گزارا کرتے تھے۔ اب زمین کے ٹکڑے کی غلامی سے آزاد ان فالتو ہاتھوں میں مزدوری کے وہ اوزار تھما دیئے گئے جن کی کڑیاں نہ جانے کتنی نسلوں تک جاتی تھیں۔ صنعتی سرمایہ داری کی بدولت اجرتی مزدوروں کی بڑی فوج پیدا ہوئی جنھوں نے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے شہروں کا رخ کیا اور کارخانہ داران کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر ان کا استحصال کرنے لگا۔

مغربی دنیا میں سرمایہ داری نظام کا سرسری جائزہ لینے کے بعد مشرقی خاص کر ہندوستان میں سرمایہ داری نظام کی آمد کا جائزہ لینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ چونکہ زیر تحقیق باب کا تعلق پاکستانی ناول میں سرمایہ داری نظام کے حوالے سے انسانی استحصال کا جائزہ لینا ہے اس لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ یہاں اس نظام کی آمد نے انسانی زندگی پر مثبت و منفی کس نوعیت کے اثرات مرتب کیے؟ مخلوق خدا اس نظام کے شکنجے میں جکڑے جانے کے بعد انسانیت کے مقام سے گری؟ یا اس مقام کو پہچانا؟

معاشیات کی تاریخ میں ہندوستان کی معیشت سرمایہ داری کے ابتدائی زمانے میں کچھ اس طرح سے سامنے آتی ہے کہ جب ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام عمل میں آیا، تو اس وقت پرتگیزی اور ڈچ اقوام برصغیر میں موجود تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے انگریز سرکار نے تجارت کے لیے ساحلی علاقوں کا استعمال کیا۔ کم و بیش ڈیڑھ صدی معمولی سوداگروں کی سی تجارت کی۔ ایسے ابتدائی دور میں جبکہ ابھی قدم جمانے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جا رہے تھے۔ ساحلی علاقوں پر کوٹھیاں بنائی گئیں جنھیں اسٹور کے طور پر استعمال کیا جاتا۔ ان اسٹور میں ملک بھر سے خریدا ہوا مال بھر دیا جاتا۔ کپڑا، نیل اور گرم مصالحہ کی نوعیت والی اشیا کو جہازوں کے ذریعے یورپ روانہ کر دیا جاتا تھا۔ ان تمام اشیا سے انگریزوں کو بے تحاشا فوائد حاصل ہوئے۔ وہ مالی طور پر اس قدر مضبوط ہو گئے کہ انھوں نے پُرتگیزی اور ڈچ کمپنیوں سے متعدد علاقے چھین لیے۔

یہاں ایک بات قابل توجہ ہے کہ انگریز ہندوستان سے سامان کی خریداری کے بدلے انھیں رقم دینے کی بجائے چاندی کی صورت قیمت ادا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ وہ دور تھا جبکہ انگلستان صنعتی لحاظ سے اتنا مضبوط

نہیں ہوا تھا۔ انگلستان میں ترقی کی بنیاد ہی انسانی استحصال پر رکھی گئیں۔ ہندوستان میں اشیا کے بدلے دیا جانے والا چاندی افریقی غلاموں کو بیچ کر حاصل کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آنے والی اس قوم نے یہاں سیاسی اقتدار حاصل کر کے اپنی اجارہ داری قائم کی، تو اس ملک کو پسماندہ بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ہندوستان کو خام مال پیدا کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ تمام عمدہ چیزوں کی پیداوار اپنے ملک اور ہاتھوں میں لے لی۔ تاکہ ہندوستانی قوم کا استحصال بھرپور انداز میں کیا جاسکے۔

ڈاکٹر محمد فاروق خان "اکیسویں صدی اور پاکستان میں رقمطراز ہیں:

> "ایسٹ انڈیا کمپنی کے مالی استحکام کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۷۳۶ء سے ۱۷۵۶ء تک بیس سالوں میں فرانسیسیوں نے ایک کروڑ پندرہ لاکھ پونڈ کی ہندوستانی اشیا کی فروخت کی جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے چار کروڑ بارہ لاکھ پونڈ کی تجارت کی جو اس سے تین گناہ زیادہ تھی۔۔۔(Duplex)ڈپلیکس فرانسیسی کمپنی کا سربراہ آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ فرانس کے لیے ہندوستانی تجارت اب سود مند نہیں "(۱۱)

انگریزوں کی اقتصادی تاریخ جہاں صنعتی انقلاب کی بدولت تبدیل ہوئی وہیں ہندوستان اور انگلستان کے معاشی نوعیت کے تعلقات میں بھی ردوبدل ہوا۔ اٹھارھویں صدی تک ہندوستان معاشی لحاظ سے ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔ اس دور میں انگلستان سوتی کپڑے کی خرید کے بدلے ہندوستان کو چاندی کی دھات مہیا کرتا تھا۔ اس کے برعکس مشینوں کی ایجادات کی بدولت صنعتی انقلاب کے آجانے سے تمام صورتحال الٹ ہو گئی۔ ہندوستانی کپڑا جو ہاتھ سے بنا جاتا تھا مشینی کپڑے کے مقابلے بے وقعت ہو کر رہ گیا۔ کارل مارکس کے بقول:

> "ہندوستان جو نجانے کتنے زمانے سے سوتی کپڑے کا سب سے بڑا کارخانہ تھا اور اسے ساری دنیا کو فراہم کرتا تھا۔ اب انگلستان کے دھاگوں اور سوتی کپڑے سے بھر گیا۔ اس کی مصنوعات کو انگلستان سے باہر رکھا جاتا یا ان کو انتہائی سخت شرائط پر داخل کیا جاتا تھا۔ اور برطانوی مصنوعات ہندوستان میں بہت کم اور برائے نام محصولی پر انڈیلی جارہی تھیں۔ جس کا نتیجہ دیسی کپڑوں کی بربادی تھا جو کسی زمانے میں اتنے مشہور تھے۔ "(۱۲)

انگلستان میں مشینی صنعتی انقلاب کی بدولت ہندوستان کی معیشت تباہ ہو کر رہ گئی۔ ہندوستان پر انگریز سامراجیت کے دور میں ریلوے اور باغات پر توجہ دی گئی۔ چونکہ باغات زیادہ نفع بخش تھے اس لیے ان پر بھی اجارہ داری انگریز طبقہ ہی کی تھی۔ لیکن یہاں یہ بات بیان کرنا ضروری ہے کہ انگریز کی مضبوطی اور استحصالی رویوں میں مقامی تاجر کا کردار بہت اہم رہا۔ ابتدائی صنعتی دور میں انگریز تاجر کو ہندوستان میں پاؤں دھرنے کی جگہ فراہم کرنے والا تاجر ہندوستانی ہی تھا۔ کیونکہ ہندوستانی تاجر کا سامان تجارت اگر انگلستان کی سرزمین پر پہنچتا تھا تو وہ انگلستانی تاجر کی بدولت ممکن ہوا تھا۔ اب صورتحال کچھ اس طرح سے سامنے آئی کہ سرمایہ دار اور تاجر بہتر سے بہترین کی جانب بڑھتے چلے گئے اس کے برعکس متوسط اور غریب طبقہ بے روزگاری اور مفلسی کی اندھی دلدل میں دھنستا چلا گیا۔ یہ استحصالی قدم اس تیزی سے بڑھا کہ ملکی حالات قحط کا شکار ہونے لگے۔ تاراچند کے بقول:

> "صرف انچاس سال میں یعنی ۱۸۶۰ء سے ۱۹۰۸ء تک بیس قحط پڑے۔۔۔ اڑیسہ اور بنگال میں ۱۸۶۷ء تا ۱۸۶۸ء میں تیرہ لاکھ انسان موت کے گھاٹ اترے۔ ۱۸۷۶ء تا ۱۸۷۷ء کے قحط میں تقریباً پچاس لاکھ انسان مرے اور ۱۸۹۶ء تا ۱۸۹۷ء میں پنتالیس لاکھ اور ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۰ء میں ساڑھے بارہ لاکھ لوگ مرے۔ ۱۸۶۰ء کے بعد اتنی جلدی جلدی قحط پڑنے کے اسباب کیا تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ صرف بارش کی کمی نہیں تھی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ غربت اور قیمتوں کی زیادتی کی وجہ سے غریب طبقات غذا حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ خصوصاً ان دنوں جب فصلیں خراب ہو جاتی تھیں اور روزگار کے مواقع کم ہوتے تھے۔"(۱۳)

تمام تاریخی خاکے سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صنعتوں نے جہاں زندگی میں تیز رفتاری اور نئی ایجادات سے آسانی پیدا کی وہیں انسان کی شخصی آزادی کہیں کھو گئی اور وہ ہر لحاظ سے امرا کا غلام بن کر رہ گیا۔ خاص ہندوستانی انسان کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو اس کا استحصال جہاں غیر ملکی سامراجی حکومت نے کیا وہیں اس کی ابتدائی اینٹ مقامی تاجر نے رکھی۔

پاکستان بحیثیت اسلامی جمہوریہ جب دنیا کے نقشے پر ابھرا تو اس نظام کی خرابیوں سے قطعی طور محفوظ نہ رہ سکا۔ ایک اسلامی ملک کی حیثیت سے یہاں ایسے اصولوں کا نفاذ ہونا چاہیے تھا۔ جو تمام لوگوں میں مساویانہ

زندگی کے طریقے رائج کریں۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں جتنا جاگیر داری نظام کی خرابیوں نے اہم کردار ادا کیا وہیں سرمایہ داری نظام ایک استحصالی نظام بن کر ابھرا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس ملک میں دولت کی غیر مساویانہ تقسیم کی بدولت امیر بے حد امیر ہے اور غریب بے حد غریب ہے۔ اگر ایک گھر میں دیکھا جائے تو ملکی و غیر ملکی ہر نوعیت کا سامان تعیش موجود ہے۔ مقابلتاً دوسرے گھر میں شاید چولہے کی لو بھی دکھائی نہ دے۔ کیونکہ جہاں امارات کی بدولت زندگی آسان ہے۔ وہیں غربت کی بدولت زندگی کی بنیادی ضروریات بھی مہیا نہیں۔ مختصراً اگر پاکستان کی موجودہ صورتحال کا جائزہ لے کر نتیجہ اخذ کیا جائے۔ تو سرمایہ داری نظام ایک گھناؤنے کھیل کی طرح واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ اس کی مثال کے لیے اتنا کہہ دینا کافی رہے گا کہ ایسا ملک جہاں گنے اور گیس دونوں کی پیداوار وافر مقدار میں ہو اور وقت ضرورت انھی اشیا کی کمی پائی جائے تو نتائج خود بخود سامنے آجاتے ہیں کہ سرمایہ داری نظام کے پنپنے میں یہاں کے امرا کتنا اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ میاں عبدالرشید کے بقول:

> "سرمایہ دارانہ نظام میں بعض لوگ پہلے سرمایہ اکٹھا کر کے ذرائع پیداوار مثلاً بڑے بڑے کارخانوں اور قطعات اراضی پر قابض ہو جاتے ہیں اور پھر روپے اور اپنے نیچے کام کرنے والے مزدوروں کی مدد سے قوت حاصل کر لیتے ہیں۔ پھر اپنی اسی سیاسی قوت کو سرمایہ اور غصب کردہ حقوق کو محفوظ کرنے کے لیے استعمال میں لاتے ہیں۔"(۱۴)

سیاست اور دولت کی طاقت جس طبقہ کے ہاتھ میں آجائے وہی طبقہ بالاتر ہوتا ہے۔ اور اپنی طاقت کے زعم میں وہ خلق خدا کو انسان کی بجائے کیڑے مکوڑے تصور کرتا ہوا ان کا استحصال کرتا چلا جاتا ہے۔ جس سے معاشرتی سطح پر بہت سی برائیاں جڑ پکڑتی ہیں۔ لوگوں کا بھرپور طریقے سے استحصال ہوتا ہے۔ سرمایہ داری نظام کی برائیاں / خامیاں جن کی بدولت لوگوں کا استحصال ہوتا ہے۔ چند ایک درج ذیل ہیں۔

☆ سرمایہ دار کی شخصی آزادی سے بلا روک ٹوک سامان تجارت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہے۔ اس طبقہ کی حرص و ہوس اسے ایک جابرانہ نظام کے طور پر سامنے لاتی ہے۔

☆مشین کی پیداوار سے جہاں بورژواطبقہ کی جیب بھاری ہوئی وہیں پر ولتاریہ کے گھروں کی رونقیں ماند پڑ گئیں۔وہ کام جو انسانوں سے کرائے جاتے اب مشینیں کرنے لگیں جس سے لوگ بے کار ہو کر گھروں میں بیٹھ گئے اور غریب کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

☆ سرمایہ داری نظام میں اضافہ کی صورت مزدور ہاتھوں کا جنگل اور زیادہ گھنا ہوتا چلا جاتا ہے۔ چھوٹی سطح پر شخصی نوعیت کا روزگار رکھنے والا بندہ غربت و افلاس کی چکی میں پسا شہروں کا رخ کرتا ہے۔ اور پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے اخلاقیات کو بھی داؤ پر لگا بیٹھتا ہے۔ معاشرتی اقدار کے خاتمے کا گھناؤنا کھیل اسی سرمایہ داری نظام کی بدولت سامنے آتا ہے۔

جاگیر داری نظام کے خاتمے پر سرمایہ داری نظام کو انسان نے خوش آمدید کہا تو اس بنا پر کہ شاید یہ کچھ بہتری کی طرف راغب کرے گا۔ مگر یہ نظام ایک ایسی مچھلی بنا جو بھوک میں چھوٹی مچھلیوں کو ہڑپ کر گئی۔ جاگیر داری نظام اپنی نوعیت کا سخت نظام رہا مگر سرمایہ داری نظام میں معصوم بچے بھی نہ بچ سکے سرمایہ دار اپنی خود غرضی میں اجرت کی مقدار کم کر دیتا ہے۔ جس کی بنا پر گھر کا چولہا چلانے کے لیے معصوم بچے بھی رات گئے تک کام کرتے ہیں۔

James Fulcher says:

> "In the system of industrial capitalism there was cheap child labor and at times nearly help their employee were under the there were too children under the age of ءage of 16. In 1819 10, some as young as 7, who worked from 6:00 in the morning until 7:00 at night."(15)

☆سرمایہ داری کی بدولت سود خوری نے رواج پایا۔

☆ سرمایہ داری نظام نے ایک نیا معاشرہ پیدا کیا جو انسانی ہمدردی اور ترحم جیسے جذبات سے نا آشنا تھا۔ اس نظام کی بدولت جہاں ممالک معاشی سطح پر ترقی کرتے نظر آتے ہیں۔ وہیں گھر تباہی و بربادی کے زینے بڑی تیزی سے طے کر رہے ہیں۔ اس نظام نے ایک ایسے معاشرے کو جنم دیا جو سفاکیت اور نجاست جیسی غلاظت کا

مرکب ہے۔ مجموعی طور پر اس نظام کی بدولت معاشروں میں جو برائیاں پھیلیں۔ ان کا سدباب کچھ اصلاحی اقدامات اپنا کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر آج بھی معاشی سطح پر بیشتر ممالک میں یہی نظام رائج ہے۔ جو بلواسطہ یا بالاواسطہ لوگوں کا استحصال کر رہا ہے۔

ج۔ اکیسویں صدی کے پاکستانی اردو ناول میں معاشی استحصال کی عکاسی

کسی بھی معاشرے کی ترقی و تنزلی کے تمام نشیب و فراز اس کے ادب میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ادب جہاں معاشرتی سطح پر رسم ورواج اور تہذیب و معاشرت کے بارے آگاہی فراہم کرتا ہے وہاں معاشرے میں بسنے والے افراد کی معاشی ترقی و پسماندگی کو بھی زیر بحث لاتا ہے۔ کسی بھی ملک کے معاشی حالات اجتماعی و انفرادی دونوں سطحوں پر ادب کا حصہ بنتے ہیں۔

ہر ذی شعور اس بات سے آگاہ ہے کہ اگر ملک معاشی حوالے سے مستحکم ہو گا تو اس کا معاشرہ زندگی کی ہر سطح پر ترقی حاصل کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ اس کے برعکس معاشی تفاوت کی صورت میں نہ صرف عوام غربت کی زندگی بسر کریں گے بلکہ اخلاقی لحاظ سے بھی معاشرہ گراوٹ کا شکار ہو جائے گا۔ آئے دن لوٹ مار، قتل و غارت گری، اخلاقی پستی اور اس جیسے بے پناہ مسائل اس معاشرے میں در آئیں گے۔ یہ بات حقیقت کے بہت زیادہ قریب ہے کہ انفرادی معاشی بدحالی ہی معاشرے کی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ ملکی سطح پر جب بھی معیشت میں غیر مساویانہ انداز بڑھا ادیبوں نے اسے ادب کے ذریعے بیان کیا۔ ادب میں بیان کی یہ صورت شاعری اور نثر دونوں میں دکھائی دیتی ہے۔ انسانی زندگی جس طرح سے بھی متاثر ہوئی اسے تمام باریکیوں کے ساتھ بیان کیا گیا۔

فکر معاش میں انسان روز اول ہی سے گھرا ہوا ہے۔ مالی حالات کو بہتر بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرتا آیا ہے۔ اور آج بھی کر رہا ہے۔ مگر نتیجہ کے طور پر آج ایک کمزور انسان کسی طاقتور کے سامنے جھکنے پر مجبور ہے تو معیشت کی غیر مساویانہ تقسیم کی بدولت ہے۔ معاشی غلامی / معاشی استحصال اتنا ہی زہرناک ہوتا ہے جتنا کسی انسان کو عملاً غلام بنا کر اس کا استحصال کیا جائے۔ معاشی استحصال کے نتیجے میں غربت، طبقاتی تقسیم، اور معاشرتی ناانصافی جیسے عوامل سامنے آتے ہیں، جو کہ ایک معاشرے میں افراد کی ترقی کرنے کی صلاحیت کو محدود کرتے ہیں۔

معاشی استحصال کی صورتیں:

معاشی استحصال (economic exploitation) سے مراد وہ صورتحال ہے جس میں کسی فرد یا گروہ کو مالی فائدہ حاصل کرنے کے لیے غیر منصفانہ طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ استحصال مختلف شکلوں میں ظاہر ہو سکتا ہے، جیسے:

- جاگیر دارانہ یا سرمایہ دارانہ نظام میں مزدوروں کا استحصال، جہاں مزدوروں کو کم اجرت پر زیادہ کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔
- کارکنوں کو غیر محفوظ یا خطرناک حالات میں کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔
- محنت کشوں سے ان کے حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے، جیسے کہ قانونی چھٹیاں یا کام کے مناسب اوقات کار نہیں ملتے۔
- خواتین کو کم اجرت، غیر مساوی مواقع یا کام کی جگہ پر ہراسانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔
- غریب افراد کو قرضے دے کر ان سے زیادہ سود وصول کیا جاتا ہے، جس سے وہ غربت کی چکی میں پسے رہتے ہیں۔

ادبی دنیا کا حساس طبقہ کسی انسان کی غلامی برداشت نہیں کرتا۔ محنت کش سے اجرت کے بدلے موصول نہ دینے والے کو نہ تو ادیب کی سوچ اچھا مانتی ہے اور نہ ہی اس کا قلم ایسے لوگوں کے لیے مثبت الفاظ کا چناؤ کر پاتا ہے۔ تمام اصناف سخن انسان کے معاشی استحصال کے حوالے سے اپنے اندر متعدد مواد لیے ہوئے ہیں۔ جہاں تک ناول کی بات ہے تو اس میں پلاٹ کی وسعت کی بدولت انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے اندر سمانے کی صلاحیت ہے۔ ناول کا ابتدائی دور برصغیر پاک و ہند کے معاشرے میں فرد کی نہ صرف سماجی، سیاسی اور نفسیاتی زندگی کو بخوبی بیان کرتا آیا ہے بلکہ انفرادی و اجتماعی سطح پر افراد کی معاشی کیفیات بھی ناول کا حصہ بنتی آئی ہیں۔ خاص کر پاکستانی اردو ناول کے حوالے سے دیکھا جائے تو کہیں بھی تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔

پاکستان کی تاریخ کے کم و پیش پچھتر سالہ دور میں معیشت کے حوالے سے کئی نشیب و فراز آئے۔ ملکی سطح پر اگر معاشی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو ایک وسیع بحث اس حوالے سے سامنے آتی ہے۔ ہمارا موضوع تحقیق چونکہ ایک باب پر مشتمل ہے۔ اس لیے اختصار کے ساتھ چند اہم معاملات سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ قیام کے وقت ہی سے یہ ملک اقتصادی حوالے سے مضبوط بنیادوں پر قائم نہیں ہوا تھا۔ روز اول ہی سے اس کی معیشت کمزور تھی۔ تقسیم کے وقت ایسے علاقے جن میں غیر مسلم اکثریت میں تھے۔ اس خطے کا حصہ بنا دیئے گئے۔ جو وقتاً فوقتاً ہجرت کر کے بھارت کے ساتھ جا ملے۔

پاکستان کی کمزور اقتصادی صورتحال کی بدولت یہ ملک آج بھی ترقی پذیر ممالک کی صف سے آگے نہیں نکل پا رہا۔ قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کی آبادکاری، ان کے باقاعدہ روزگار کی فراہمی اور ایسی حالت میں جبکہ معیشت بہت زیادہ کمزور تھی، تشویشناک صورتحال کے طور پر سامنے آئی۔ تقسیم ہند کے وقت جتنا بھی اثاثہ نو زائیدہ مملکت کے حصے میں آیا بھارتی حکومت نے (بگڑے ملکی حالات کو مزید بگاڑنے کے لیے) اسے دینے میں تاخیر برتے رکھی۔ نتیجتاً معاشی خستہ حالی کے دن طویل ہوتے گئے۔ ایسی صورتحال جبکہ لوگوں کو ایک ایک نوالے کے لالے پڑنا شروع ہو گئے تو عوامی نمائندے ملکی سطح پر سوچنے کی بجائے انفرادی زندگی کو بہتر بنانے کی جانب راغب ہونے لگے۔ کسی ایک کی بہتر حالت سے سارا ملک بگاڑ کا شکار ہونا شروع ہو گیا۔ دولت اکٹھی کرنے کی ہوس نے لوگوں کو ہر ناجائز کام بھی جائز کرنا سیکھا دیا۔ ایسے حالات میں ہر وہ کام جو انسانی استحصال کے زمرے میں آتا ہے کیا گیا۔ مقامی طاقتور طبقہ جس طرح سے ناانصافی کا علم بلند کیے ہوئے تھا، مہاجرین بھی کسی طرح پیچھے نہ ہٹے۔ اپنی اقتصادی حالت بہتر بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے انھوں نے بھی ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جائیداد کو اپنے نام لکھوانے کے لیے جعلی دستاویزات تیار کرانے میں جس قدر رشوت دینے کی ضرورت پڑی، ادا کرنے سے اجتناب نہ برتا۔ تحقیقی عوامل کو احاطہ کار میں لایا جائے تو پتا چلتا ہے کہ مہاجرین کی آبادکاری کے سلسلے میں بننے والوں محکموں میں رشوت لینے کا سلسلہ اس قدر طویل ہے کہ یہ کہنا معیوب نہیں ہو گا کہ لاکھوں کروڑوں کی جائیداد کو اپنے نام کروانے کے

لیے رشوت جیسی برائی کو اس ملک میں جنم دینے میں مقامی و مہاجرین نے مل کر کردار ادا کیا۔ اور پھر گزرتے وقت کے ساتھ اس میں اضافے کی بدولت غریب کا استحصال بڑھتا چلا گیا۔

ادب کی دنیا میں جھانکا جائے تو اس دور کا ناول ان تمام حالات کو بیان کرتا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں شوکت صدیقی، جمیلہ ہاشمی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عبد اللہ حسین وغیرہ کے نام خاص طور پر قبل ذکر ہیں۔ انھوں نے ناول میں جہاں سماجی مسائل کو جگہ دی وہیں ہجرت و فسادات کے مسائل کو بیان کر کے معاشی صورتحال کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

ادیب کسی حد بندی کے بغیر لکھتا ہے۔ اسے ملکی جغرافیہ سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ تو قلم کو لوگوں کے درد و غم بیان کرنے کے لیے اٹھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناول کی ابتدائی تاریخ میں تقسیم سے قبل مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے خاتمے کا المیہ بڑی شدت کے ساتھ اپنی جگہ بناتا دکھائی دیتا ہے۔ جغرافیائی حد بندی سے جہاں پاکستانی عوام کو علیحدہ وطن کی خوشی حاصل ہوئی وہیں دونوں ممالک کی اقتصادی حد بندی قائم ہونے سے معاشی مسائل کا عمل بڑھوتری کا شکار ہوا۔ غربت، بھوک، بے روزگاری جیسے جرائم وغیرہ نے معاشرے میں اپنی جڑیں مضبوط کر کے لوگوں کا ناقابل بیان استحصال کیا۔ ان تمام مسائل کو ناول نے اپنے اندر سمو کر پیش کیا۔

کارل مارکس کے اقتصادی نظریات پوری دنیا کے ساتھ ہندوستان کی ادبی تاریخ کا حصہ بنے۔ مارکس معیشت کی بہتری کی بات کرتا ہے، کیونکہ معیشت کے مستحکم ہونے سے عوام کی خوشحالی ممکن ہوتی ہے۔ اس نے بین الاقوامی سطح پر غریب و مزدور کے استحصال کے خاتمے کی بات کی۔ ہندوستان میں ترقی پسندی کا منشور کسی حد تک انھی سوشلسٹ نظریات کی عکاسی کرتا ہے۔ ترقی پسندی کے تحت سامنے آنے والے ادب میں غربا کی تنگدستی کو بیان کیا گیا۔

۱۹۴۷-۷۱ء تک کے پاکستانی اردو ناول کا جائزہ لیا جائے تو اس میں مارکسی نظریات / خیالات کی ایک واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس دور کے ناول میں ناول نگاروں نے عوام کی کسمپرسی، بنیادی سہولیات سے محرومی (تعلیم و صحت وغیرہ) مزدوروں کا سرمایہ دار اور جاگیر دار کے ہاتھوں استحصال، رشوت خوری، بچوں

سے جبری مشقت وغیرہ جیسے موضوعات کو جگہ دی۔ یہ ایسے موضوعات ہیں جن کا براہ راست تعلق معیشت کے ساتھ جڑا تھا۔

ہندوستان کے دو حصے ہوئے تو معیشت قدرے محدود ہو گئی۔ اس کے بر عکس جب ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ کا سانحہ پیش آیا تو پاکستان کا دو لخت ہو نا نہ صرف جغرافیائی حدود کا تعین کر گیا بلکہ اقتصادی وسائل مزید محدود ہو جانے سے مسائل میں بھی اضافہ ہوا۔ اس سانحہ نے جس طرح لوگوں کی زندگیوں کے ساتھ کھلواڑ کیا۔ اس دور کے ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں بیان کیا۔ ان ناول نگاروں میں رضیہ فصیح احمد (صدیوں کی زنجیر)، طارق محمود (اللہ میگھ دے)، سلمٰی اعوان (تنہا) طارق اسماعیل ساگر (کمانڈو) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

۱۹۷۱ء سے ۲۰۰۰ء تک کا ناول سقوط ڈھاکہ کے ساتھ ساتھ ایک اور اہم موضوع کو زیر بحث لا تا ہے جو کہ ضیاء الحق کے دور میں اسلامی نظام کے نفاذ اور ادیبوں، شاعروں، صحافیوں کی تحریکوں پر لگائی جانے والی پابندیاں ہیں۔ آزادی اظہار پر پابندی کی صورت میں معاشرہ گھٹن کا شکار ہونا شروع ہو گیا۔ جبر کی اس کیفیت سے باہر نکلنے کے لیے ادیب پھر سے میدان میں اترے۔ اس دور میں انھوں نے انسان کے داخلی و خارجی کرب کو یکجا کر کے عظیم فن پارے پیش کیے۔ اس دور میں ناول نگاروں نے معاشرتی زندگی کے ساتھ ساتھ معاشی زندگی کے مسائل کو بھی بیان کیا۔

اکیسویں صدی کا دورانیہ آغاز ہی سے ہنگامہ خیز تھا۔ ابتدائی دور ہی میں ملکی و بین الاقوامی سطح پر کئی طرح کی تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ سیاسی تناظر میں دیکھا جائے تو ایک جانب بین الاقوامی سطح پر امریکہ کا افغانستان پر حملہ کرنا اور دوسری جانب پاکستان کا اپنی سرحدیں استعمال کرنے کے لیے امریکہ کو اجازت دینا، یہ دو ایسے واقعات تھے جنھوں نے لوگوں میں خوف و ہراس کی کیفیات پیدا کر دیں۔

دنیا نے جب گلوبل ولیج کی صورت اختیار کی تو کئی ملکی باشندے روزی کی تلاش میں باہر کا رخ کرنے لگے۔ آئے روز خود کش حملوں نے بھی ملکی معیشت کو تباہی کے دہانے لا کھڑا کیا۔ ایسا معاشی زوال معیشت کی تاریخ میں نہیں ملتا۔ نتیجتاً بے روزگاری، جرائم وغیرہ نے پنجے گاڑھ کر انسان کا مزید معاشی استحصال کیا۔ سیاسی سطح پر دھرنوں نے معاشی پہیہ جام کر دیا۔ مزدور طبقہ فاقوں مرنے لگا۔ ملک کے پس ماندہ علاقوں کے مکین منفی

سوچ رکھنے والے طبقہ کے ہتھے چڑھ گئے۔ جس نے انھیں دہشت گرد ی جیسے برے فعل کا مرتکب ٹھہرایا۔ غربت انسان سے ہر برا فعل کرانے کے لیے اسے تیار کر لیتی ہے۔ غریب کو پیٹ کا دوزخ بھرنے، گھر کا چولہا جلائے رکھنے کی خواہش تھی جو مقتدر طبقہ پوری کر رہا تھا۔ چاہے بدلے میں عقائد و نظریات کی صورت قیمت ادا کرنا پڑتی، چاہے جان کی صورت، بات تو چولہے کی لو کے جلنے کی تھی۔

اکیسویں صدی کے پاکستانی اردو ناول کے سفر کا جائزہ لیا جائے تو جہاں ٹیکنالوجی کی بدولت انسان چاند تک کو مسخر کرنے میں کامیاب ہوا، بے پناہ سماجی علوم میں بھی ترقی کر لی۔ وہیں آئے دن نت نئے مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ زیر تحقیق موضوع چونکہ معاشی استحصال ہے اس لیے پاکستانی اردو ناول میں اکیسویں صدی میں ہونے والی معاشی تبدیلیوں کا جائزہ لیا جائے گا۔

پاکستان میں ابتدا ہی سے معیشت غیر مستحکم تھی۔ جو امیر تھا وہ غربا کا ہر سطح پر استحصال کر رہا تھا۔ اور آج اکیسویں صدی میں بھی حالات زیادہ نہیں بدلے۔ کمزور معاشی حالات نے آج بھی عوام کی زندگی کو مسائل سے دوچار کر رکھا ہے۔ متوسط طبقہ غربت زدہ دکھائی دیتا ہے۔ اور غریب کی غربت نا قابل بیان ہے۔ وہ خط غربت سے بھی نیچے پہنچ چکا ہے۔

سرمایہ دار مزدوروں کے معاشی استحصال کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ جانے بھی کیوں دے؟ اگر وہ غریب کے استحصال سے دستبردار ہو جائے تو دولت کہاں سے اکٹھی کرے گا؟ سرمایہ دار دولت اکٹھی کرنے کے لیے اخلاق، مذہب، معاشرتی اقدار غرض ہر شے سے کنارہ کش ہو کر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ دولت ہی اس کا ایمان ہوتا ہے۔ وہ اس وقت کو بھول جاتا ہے جب وہ خود دو وقت کی روٹی کے لیے کسی کا ملازم تھا۔ اجرت مزدوری سے کم دے کر اس کا استحصال کیا جاتا تھا۔ عبداللہ المجدوعی (مشمولہ: سرخ تیل) ایک ایسے ظالم سرمایہ دار کے طور پر سامنے آتا ہے، جو اپنے اوپر بیتے تمام برے لمحات بھول بیٹھا ہے ۔ آج اس کے پاس سرمایہ ہے تو وہ لوگوں کے سانس گروی رکھ کر انھیں دو وقت کی روٹی بھی پیٹ بھر کر دینے کو تیار نہیں۔ اعجاز احمد فکرال نے اپنے ناول کا نام "سرخ تیل" رکھا جو استعارہ ہے مزدوروں کے خون کا۔ مزدور خون پسینہ ایک کر کے محنت کرتے ہیں اور مزدوری حاصل کرنے کے لیے زیادہ محنت کرتے ہیں مگر انھیں اپنی محنت کے آدھے کی بھی اجرت فراہم نہیں کی جاتی۔ اقتباس:

"سرخ تیل بھی مزدوروں کی خوشیوں کو پامال کر کے ان کی محنت کے عوض کم معاوضہ دے کر چاندی کرنے والے ایک انسانی شیطان کی امارت کی کہانی ہے "۔(۱۶)

مصنف ناول کے انتساب میں ہی اس بات کو واضح کر دیتے ہیں کہ اس میں آگے چل کر مزدوروں کا استحصال بیان کیا جائے گا۔ مصنف کی درج بالا بیان کردہ تحریر میں لفظ "بھی" سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی اور لکھاری کی اس نوعیت کی تحریر سے متاثر ہو کر بات کر رہے ہیں جسے اگلی سطروں میں وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس موضوع پر ناول لکھنے کی یہ کوشش "گورکی" سے متاثر ہو کر کی۔

اپنی جنم بھومی انسان پیٹ بھرنے کے لیے چھوڑنے کو تیار تو ہوتا ہے مگر آگے چل کر حالات اسے زندگی کا کونسا رخ دکھاتے ہیں، یہ کہاں اندازہ ہو پاتا ہے؟ ناول "سرخ تیل" کی کہانی المجدوعی کیمپ سے شروع ہو کر قریباً وہیں ختم ہو جاتی ہے۔ اس ایک کیمپ کے شب و روز میں مزدوروں کا جو حال کیا جاتا ہے ان کے استحصال کو مصنف نے تمام باریکیوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔

غربت کس قدر اذیت ناک شے ہے یہ انسان سے اس کی عزت نفس، خود داری، احساس انسانیت سبھی کچھ چھین لیتی ہے انسان ایک ایسا درندہ بن کر سامنے آتا ہے جو اپنی ہی نسل کے لوگوں کو چیر پھاڑ کر ان کا استحصال کرتا چلا جاتا ہے۔ غریب چند روپوں کی خاطر اپنے ایمان کا سودا کر کے سرمایہ دار کا ساتھ دیتا ہے۔ اپنے ہی طرح کے غریبوں کو مزید غریب بنانے کے نت نئے طریقے اپنے مالک کو بتاتا ہے۔ اور اس صورت میں ترقی پاتا ہے۔ غربت اور بھوک دنیا کا اتنا بڑا اور کڑوا سچ ہے جو انسان کی فتح کو شکست میں تبدیل کر دیتا ہے۔ بھوک کی تلخیاں انسان کے تمام علم و ہنر کے چشموں کو زہریلا کر دیتی ہیں، جلتے چراغ بجھا دیتی ہیں۔ دولت سے بھری تجوریاں بھوکے کی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہیں، جنھیں حاصل کرنے کے لیے وہ تمام اخلاقی اصول و قوانین کی حدیں پھلانگتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ سرمایہ دار اپنے سرمائے کو بڑھانے کے نت نئے طریقے غریب پر آزماتا ہوا دولت کے ڈھیر لگاتا چلا جاتا ہے۔ اس کے زیر دست لوگ خط غربت سے نیچے رہ کر مر جائیں یا جیئیں اسے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اقتباس:

"مزدوروں کے کپڑوں جسموں، برتنوں، جوتوں غرض۔۔۔ جس جگہ پر بیٹھتے وہاں سے بد بوئیں خارج ہوتی رہتیں۔ ان۔۔۔ سے پسینے، لوہے، کیمیکل، تیل، سرانڈ، ہڈیوں کے جلنے اور

رستے زخموں کی بد بو اور ایسی غلیظ بد بوئیں جو کہیں بھی تیار نہ ہوتیں خارج ہوتی رہتی تھیں"۔(۱۷)

"العاصفہ "۲۰۰۶ میں منظر عام پر آنے والا ایسا ناول ہے جس میں اشاراتی انداز اپنا کر عرب ممالک میں نچلے طبقات کی محرومی اوراستحصال کو بیان کیا گیا ہے۔ عرب ممالک میں تیل جیسی معدنیات کی بہتات ہے۔ بادشاہی نظام کی بدولت سارے وسائل بادشاہ اور اس کے خاندان کی ملکیت ہوتے ہیں۔ بادشاہی نظام کے تحت عوام غربت کی چکی میں پس رہے ہیں۔ زندگی کی تمام سہولیات پر اگر کسی کا حق ہے تو وہ بادشاہ وقت اور اس کا خاندان ہے۔ اور اگر بنیادی سہولیات سے محرومی کسی کے حصے میں آئی تو وہ عوام ہیں۔

ناول میں غیر ملکی کمپنیوں کا ملکی سطح پر کردار بنیادی موضوع بنتا ہے۔ مقتدر اعلیٰ کثیر رقم حاصل کر کے اپنی جیب بھاری کرتا ہے۔ اور عوام تیل کی مصنوعات کے تحت استحصال کا شکار ہوتی ہے۔ سب کچھ جان لینے کے بعد بھی جبریت کے اس نظام سے کنارہ کشی ناممکن ثابت ہوتی ہے۔ محض غم و غصہ نکال کر اپنا کتھارسس کیا جاسکتا ہے۔ اقتباس:

"تاجر ملک کو لوٹ رہے ہیں لیکن ملک تک میں ہمت نہیں ہے کہ انہیں ملک سے نکل جانے کو کہے۔ ایسا زور بس اپنے ملک والوں پر چلتا ہے۔ یا ان کام کرنے والوں پر جو گرے پڑے ملکوں سے یہاں آتے ہیں۔۔۔ تیل عرب ممالک یا ایران میں کیا نکلا ہے؟ تیل تو سفید لوگوں کے ملکوں میں نکلا ہے، جہاں اس سے پیدا ہونے والی دولت ہمیشہ سے جاری ہے"۔(۱۸)

مصنف کردار زاہد کے ذریعے ملکی سطح پر نکلنے والے تیل کی بدولت عوام کے استحصال کو بیان کرتا ہے۔ غیر ملکی مقامی لوگوں پر ہر قسم کی پابندی لگانے کی جسارت کرتے ہیں۔ مرکزی کردار کے ذریعے مصنف حکومت کی نااہلی کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ حکومتی سطح پر جتنی بھی اصلاحات منظور ہوتی ہیں ان کا نفاذ صرف اور صرف مجبور و بے بس لوگوں پر ہوتا ہے۔ چاہے وہ مقامی ہوں یا بیرون ممالک سے آئے ایسے حضرات جو دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کو ان ممالک کا رخ کرتے ہیں۔ ایسے ممالک جن کے معاشی حالات بہتر ہیں ان کے باشندے اگر کچھ خلاف قانون بھی کریں تو ان سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کی جاتی۔

ناول میں آئل کمپنیوں کے ذریعے جہاں عوام کا استحصال دکھایا گیا ہے وہیں معاشی تفاوت بھی ناول کا موضوع بنتی دکھائی دیتی ہے۔ ترقی پذیر ممالک اپنے باشندوں کو جو پہچان دیتے ہیں۔ جبریت، غربت، بے بسی و لاچاری کی یہ مہر اتنی پکی سیاہی سے لگائی جاتی ہے کہ سات سمندر پار بھی نہیں مٹتی۔ پسماندہ طبقہ اہل ثروت کے ہاتھوں اپنے ملک میں بھی پستا رہا۔ زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم رہا۔ اور یہ سب کچھ اس کے ساتھ بیرون ملک بھی ہوتا ہے۔ طویل فاصلہ طے کر کے جس سے پیچھا چھڑانے بیرون ملک سفر اختیار کرتا ہے، وہ شناخت یہاں بھی اس کی پہچان معاشی سطح پر کرا کے اسے ذلت کی دلدل میں دھکیل دیتی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید عرب ممالک سے تیل کی مصنوعات کو حاصل کر کے اپنی معیشت مستحکم کرنے والے ممالک کو ہدف کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں:

> "زید۔۔۔ ہمیں اس بیمار معاشرے سے آگاہی بخشتا ہے جس کی ریت کا لا سونا اگل رہی ہے اور اس بہتے ہوئے سونے پر بے کردار امریکی پل رہے ہیں جن کے دلوں میں نہ عرب زمین کی عزت ہے جس سے تیل نکلتا ہے اور نہ اس کے انسانوں کی"۔ (۱۹)

سماجی سطح پر عوام کے ساتھ برتی جانے والی زیادتی کے ساتھ ساتھ معاشی مسائل کو غیر ملکی کمپنیوں کے ذریعے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس ناول کے ذریعے سامنے آنے والے حقائق کے مطابق عوام کے حقوق کی پامالی میں شاہ وقت کا کردار بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اب چاہے وہ خود سامنے آجائے یا غیر ملکی کمپنیوں کو اس عمل کی اجازت دے۔ دونوں صورتوں میں استحصال عوام ہی کا ہوتا ہے۔ جبریت کا شکار عوام ہی ہوتی ہے۔

ادب کی دنیا میں جہاں بھی نظر دوڑائی جائے ان دو نظاموں کے تحت غربا کا استحصال دکھائی دیتا ہے۔ جاگیر داری نظام اگر کمزور پڑا تو وہی وڈیرے سرمایہ داری نظام کے ذریعے ملکی معیشت پر قابض ہوتے دکھائی دیے۔ دولت کے نشے نے ہر طرح کے عقیدے اور قدریں پامال کرا دیں۔ جاگیر داری نظام نے جہاں غریب کے گلے میں غلامی کا طوق پہنایا وہیں سرمایہ داری نظام انسان کی آزادانہ فطرت کو اپنے شکنجے میں کستا چلا گیا۔ غرض یہ دونوں نظام عجب گورکھ دھندہ بن کر انسان کے سامنے آئے۔ سکون کا متلاشی کسی امن کی راہ

پر چلنے کا خواہش مند ہے۔ مگر امن و سکون اس کے حصے میں کہاں؟ وہ بس اندر کی گھٹن کو نکالنے کی خواہش کر سکتا ہے نکال نہیں سکتا۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد نوزائیدہ مملکت میں کئی برائیاں پروان چڑھنے لگیں۔ وسیع پیمانے پر ہجرت، قتل و غارت گری، عورتوں کی عصمت دری، انسانوں کی مسخ شدہ لاشیں، مجروح ہوتی زندگیاں، پامال ہوتی قدریں ایسے مسائل تھے جن کے سامنے نئی مملکت کے ستونوں کا سیدھا کھڑے رہنا ناممکن ہو رہا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد ملک کے سیاسی و معاشی حالات ابتر ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ انسانی ذاتی مفادات و خواہشات ملکی منفعت پر غالب ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ملکی سیاسی و معاشی صورتحال بہتری کی بجائے ابتری کی جانب مائل تھی۔ سماجی زندگی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں امن و امان کی کوئی راہ نکلتی دکھائی دیتی ہو ۔ معاشرے میں فسادات کی بدولت تڑپتی سسکتی زندگیاں اور ماتم کناں انسانیت کے نوحے ادیبوں کی قلم کا حصہ بننے لگے۔ تاریخ ادب اس بات کی گواہ ہے کہ جب بھی کوئی معاملہ انسان کے ساتھ کبھی، کہیں بھی پیش آیا اس کے اثرات صدیوں تک ادیب کی قلم کے ذریعے سامنے آتے رہے۔ ماتم کناں انسانیت کے نوحے آج اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں بھی قلمکاروں کی تحریروں میں دکھائی دیتے ہیں۔ جنھیں پڑھ کر قاری اس بات کا ادراک حاصل کرتا ہے کہ زندگی کے جس شعبے میں بھی ترقی کر لیں۔ ظلم و بربریت انسان کی فطرت سے کبھی اخراج نہیں پا سکتی۔

انسانی زندگی بہتری کی راہ پر تبھی گامزن ہو سکتی ہے۔ جب عمل کی راہ اختیار کی جائے۔ ورنہ بداعمالی سے تباہی و بربادی کے کئی راستے نکلتے ہیں جو انسان کی سوچ کو جلا بخشنے کی بجائے اندھی دلدل میں دھکیل دیتے ہیں۔ جہاں سے راہ فرار کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ لوٹ مار، قتل و غارت گری وغیرہ کے علاوہ بدعنوانی اور رشوت خوری جیسے افعال معاشرے کے لیے زہر ناک ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں ملوث افراد کئی سماجی برائیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حسن منظر ماہر نفسیات ہونے کے ساتھ ساتھ اکیسویں صدی کے بہترین ناول نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کے ناول حقیقت پر مبنی مختلف معاشروں کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کا تحریر کردہ ناول "انسان اے انسان" کا بنیادی موضوع نفسیات ہے۔ سوچوں کا تسلسل سماج میں بحیثیت انسان پیش آنے والے واقعات کی بدولت ظہور پذیر ہوتا ہے۔

اس کرداری ناول میں تلمیذ کا کردار اہم ہے۔ جس سے کہانی شروع ہو کر اسی پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زندگی استاد سے زیادہ سخت ہوتی ہے کیونکہ یہ امتحان لے کر سبق دیتی ہے۔ تلمیذ نے بھی پوری زندگی کے تجربات سے جتنا سیکھا آخر میں یہی تمنا ظاہر کرتا ہوا دکھایا گیا ہے کہ اے کاش! زندگی دوبارہ میسر آتی۔ کیونکہ تجربات سے وہ سیکھ چکا تھا کہ اسے کس طرح زندگی بسر کرنی ہے۔ تلمیذ کے کردار سے وابستہ مزید کئی کردار سامنے آتے ہیں۔ اور انھی کی بدولت سماج میں زندگی کے مختلف شعبوں کو قاری کے سامنے لایا جاتا ہے۔ جن سے وقتاً فوقتاً وہ سبق حاصل کرتا ہے۔

تلمیذ کے والد اولاد کو نعمت خداوندی جانتے ہوئے ان کی پیدائش پر پابندی و تاخیر کو گناہ تصور کرتے ہیں۔ کم و بیش دس بچے پیدا کرنے کے بعد گھر میں روٹی کے لالے پڑنے لگے۔ اولاد کو بہتر بنیادوں پر تربیت نہ دینے کی صورت میں وہ بے راہ روی کا شکار ہونا شروع ہوئے تو اپنی ذمہ داری بیٹی کے سپرد کر دی۔ غربت کی حالت میں زندگی بسر کرنے والی بیٹی چاروناچار باپ کی بگڑی ہوئی اولاد کو سنوارنے کی حامی بھر کر اپنے پاس رکھ لیتی ہے۔ مگر تلمیذ جس غربت سے جان چھڑا کر یہاں آیا وہ غربت اور برائی ادھر بھی اس کے ساتھ آگئی۔ جوا کھیلتے کھیلتے بدعنوانی جیسے گھناؤنے کھیل میں ملوث ہو گیا۔ جیل کی ہوا کھائی۔ متعدد لوگوں سے مختلف اوقات میں میل ملاپ ہوا۔ کرتے کراتے اورنگ ناز تک جا پہنچا جو ایک سیاسی لیڈر تھا۔ اپنی غاصبانہ فطرت کی بدولت اورنگ ناز اسے کسی کا قتل کرنے کا حکم دیتا ہے اور انکار کی صورت میں اسے جیل ڈلوا کر سزائے موت دلوا دیتا ہے۔ جہاں سے تلمیذ بھاگ نکلتا ہے۔

سردار اورنگ جیسے سیاسی مقتدر اعلیٰ ہمارے ملک کے وہ نام نہاد عزت دار لوگ ہیں جو اپنے مفاد کے لیے عوام کا استحصال کرتے آئے ہیں۔ صدیوں قبل شروع ہونے والا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ عوام کی زندگیوں میں گھس کر انھیں تمام برے کاموں کا دعوت نامہ ارسال کرتے ہیں۔ جو مان گیا تو یہ دعوتیں شب و روز کا معمول بن جاتی ہیں، اور اگر انکار کر دے تو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ ان سیاسی باشندوں کے حکم دیمک کی مانند ہوتے ہیں جو عام انسان کی زندگیوں کو چاٹ جاتے ہیں۔

> "سردار اورنگ ناز سرمایہ دارانہ نظام کا وہ نمائندہ ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ ملکی دولت چند خاندانوں میں سمٹی ہوئی ہے۔ اور یہ وہ طبقہ ہے جو اسمبلیوں میں بیٹھ کر قانون سازی کرتے

ہیں، سیاست ان کے گھر کی باندی اور قانون ان کا خریدا ہوا غلام ہے"۔ (۲۰)

ملکی سطح پر معاشی نظام کی بد حالی روز بروز عروج پر ہو تو ایسے کئی کردار عوام کا استحصال کرتے نظر آتے ہیں۔ نفسا نفسی اور لا قانونیت کی آلودہ فضا ہمیشہ گھٹن زدہ ہی رہتی ہے۔مادیت پرستی آسیب کی مانند پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے انسانیت کی پامالی کے کئی روپ در آتے ہیں۔

سماج کا دولت مند طبقہ غربا کو پیٹ بھر روٹی دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ والدین کے غیر ذمہ دارانہ رویے سے بگڑا بچہ جب معاشرے کی لپیٹ میں آتا ہے تو متعدد کالے دھندوں میں ملوث کر دیا جاتا ہے۔ دولت کی غیر مساویانہ تقسیم کی بدولت معاشرے میں مختلف برائیاں جڑ پکڑتی ہیں۔ ابتدائی سطح پر ہونے والی یہ برائیاں آج ملک کی جڑیں کھوکھلی کر چکی ہیں۔ پورا معاشرہ انصاف اور قانونی بالا دستی کے نام پر ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے آتا ہے۔ اقتباس:

"کیا آدمی گناہ اور جرم سے کبھی واقعی دور ہوتا ہے؟ اور ممکن ہے اس کے ذہن میں آیا ہو، جرم میں کر رہا تھا یا قانون"۔ (۲۱)

مصنف ناول کے آخر میں مرکزی کردار کے ذریعے ملک میں پھیلی لا قانونیت پر گہرا طنز کرتے ہیں۔ ملکی سطح پر ناانصافی کا چرچا عام ہوتا واضح طور پر دکھائی دے رہا ہے۔ گناہ نہ کرنے کی پاداش میں وہ سزائے موت کا مستحق ٹھہرا۔ بڑی عجب سی بات ہے گناہ کرو تو سزا ملے گی۔ مگر آج جبکہ ظلم و جبریت کے اس دور میں انسان قانون اور انصاف کی صدا لگا رہا ہے۔ تو صدا سننے والا ناخدا اپنے کانوں کو بند کیے زندگی کی رنگینیوں میں کھویا ہوا ہے کیونکہ قانون ان کا اپنا ہے، اور اپنی شے صرف خود استعمال کرنے کے لیے ہوتی ہے۔

انسان کا خمیر ایک بہتر شے سے اٹھایا گیا، پیدا کرنے والے نے اسے اشرف المخلوقات کا درجہ دیا، علم سکھایا، اچھے اور برے کا شعور دیا تا کہ وہ زندگی کے تمام مراحل کو احسن طریقے سے انجام دے سکے۔ مگر دنیا میں قدم رکھتے ہی اس نے حرص و لالچ کا ایک بازار گرم کر دیا۔ وہ بھول گیا کہ اسے انسان پیدا کیا گیا تھا اور انسان میں انسانیت ہی باقی نہ رہے تو پیچھے کیا رہ جاتا ہے۔ بازغہ قندیل اس حوالے سے لکھتی ہیں:

"جارج آرویل کا ناول 'جانورستان' بہت دقیع ہے اس میں حیوان کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ چند جانور ایک فارم پر زبردستی قابض ہو جاتے ہیں اور وہاں کے مالک کو نکال دیتے ہیں۔ وہ

خود وہاں حصول اقتدا کی جنگ کرتے ہیں۔ اور بالکل انسانی فطرت کی عکاسی کرتے ہوئے
دوسرے جانوروں کا استحصال کرتے ہیں"۔(۲۲)

انسانی فطرت اچھائی، برائی اور بلندی و پستی کا منبع ہے۔ اسے کسی ایک پہلو سے دیکھ کر فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ حمید شاہد کا ناول "مٹی آدم کھاتی ہے" کی کہانی دو زاویوں کے ذریعے بیان کی گئی ہے۔ تین چار کہانیوں پر مشتمل اس ناول میں ایک اہم موضوع جاگیر داری نظام کے تحت غربا کا استحصال ہے۔ غریب کے پاس ذاتی کچھ ہوتا بھی ہے تو وہ اس کا اپنا نہیں ہوتا۔ صرف اور صرف غربت اس کا کل اثاثہ متاع ہے جو پشتوں سے اس کی پہچان ہے۔ راوی اپنے باپ کے بارے بیان کرتے ہوئے جاگیر دار کی ظالمانہ روش سے متعلق کہتا ہے: اقتباس

"میرا باپ کچھ بھی نہ رہا تھا۔ میرا باپ نہ میں۔ بڑے خان کے مرنے کے بعد زمین کا وہ ٹکڑا
جو بڑے خان نے اپنی زندگی میں اس کے نام کر دیا تھا خان جی نے واپس لے کر اپنے اصطبل
کے ساتھ ملا لیا، اس قرض کے بدلے جو میرے باپ نے، میری بہشتی ماں کو مرنے سے
بچانے کے لیے اٹھایا تھا اور شہر کے ڈاکٹروں کو لٹا کر لاش اٹھالایا تھا"۔(۲۳)

غریب انسان کس قدر بے بس و لاچار ہوتا ہے کہ جاگیر دار اپنے گھوڑے کو اس پر ترجیح دیتا ہے۔ گھوڑے کی لید صاف کرنے والا انسان بہتر مقام کا حامل ہو بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ معاشرتی تقسیم میں غریب ہمیشہ سے رذیل اور قابل ذلت تصور کیا جاتا رہا ہے۔ غربت کی بدولت انسان انسان نہیں رہتا۔ حقیقی زندگی میں ان کی برابری وڈیرے کے گھوڑے سے کی جائے تو وہ بھی بہتر نکلتا ہے۔ جاگیر داری نظام معاشرے میں پھیلا ایسا ناسور ہے جس سے رستا ہوا مواد غریب معاشرے میں بدبو پھیلا رہا ہے مگر اس سے چھٹکارہ پانا ناممکن ہو گیا ہے۔ بظاہر سادہ اور مختصر کہانی پر مشتمل اس ناول میں جاگیر داری نظام کے تمام پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔

انسانی تاریخ میں دولت کی غیر مساویانہ تقسیم، ناانصافی، ظلم اور بربریت کو جنم دیتی آئی ہے۔ اسی غیر مساویانہ تقسیم سے معاشرتی سطح پر کئی طبقات سامنے آئے ہیں۔ ان طبقات میں امیر مزید امیر اور غریب خط غربت سے بھی نیچے جاتا جا رہا ہے۔ خالدہ حسین کا ناول "کاغذی گھاٹ" کا موضوع اگرچہ معاشرتی سطح پر عورت کی حیثیت اور مقام کو بیان کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی غرباء کی دیمک زدہ زندگی کے حالات بھی سامنے لاتا ہے۔ اگرچہ تھوڑا مگر معیشت کی غیر مساوی تقسیم پر مستند مواد موجود ہے۔

کیا عجیب فطرت انسانی کی داستان ہے کہ غریب پر ظلم بھی امیر کرتا ہے اور اس کے بارے میں کہیں نرم گوشہ بھی امیر ہی کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔ وہ خود ایک بہتر زندگی جینے والا کردار نرم گرم بستر میں لپٹی غربا کی حالت پر کف افسوس مل رہی تھی۔ غریب کے لیے موسم بھی بے رحم ثابت ہوتا ہے۔ سردی کی ٹھٹھرتی یخ بستہ راتیں، رہنے کو جھونپڑی، ایسی صورت میں جب ٹھنڈی ہواؤں میں زور پیدا ہوتا ہے تو تنکا تنکا بکھر جانا گویا قدرت بھی ہر طرح سے غریب کی بے بسی کا مذاق اڑانے پر اتر آئی ہو۔ قدرت کے تمام موسم اور موسموں کے سبھی رنگ زندگی کے رنگوں کی طرح بس امیر کے لیے ہی بنے ہوتے ہیں۔ غربت کی چکی میں پستے غریب یا تو ہسپتالوں کی چوکھٹ پر بنا دوا کے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں یا پھر زمیندار کے لیے زمین کی ترائی اپنی ہڈیوں اور پسینے سے کرتے ہوئے، جھڑکیں سہتے رہتے ہیں۔

> "وہ شخص جو اپنا خون اور ہڈیاں گلا کر زمین سینچتا ہو گا اور وہ زمیندار جو اپنی طویل و عریض حویلیوں میں مخملیں، سبزوں پر پیچواں گڑگڑاتے ہو گے اور جن کی کانونٹ زدہ لڑکیاں وسیع دستر خوان سے صرف سلاد کھا کے اٹھ جاتی ہوں گی کہ وہ ڈائٹ پر ہیں۔ اور دس پندرہ کھانے جوں کے توں رہ جاتے ہوں گے "۔(۲۴)

تقسیم ہند کے بعد عوام کی جو معاشی زبوں حالی سامنے آئی اس کے اثرات آج بھی انسانی زندگی میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس کایا کلپ نے کہیں کہیں امیروں کو فقیر اور فقرا کو کروڑپتی بنا دیا۔ نئے ملک میں سامنے آنے والے بے شمار نو دولتیے سماجی اور اخلاقی قدروں کو پامال کرتے دکھائی دیے۔

انسانی معاشرت کے ساتھ ہی انسانی زندگی کو بہتر بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً کئی قوانین و اصلاحات پیش کی جاتی ہیں۔ نفاد کے حوالے سے بات کی جائے تو صرف ایسے قوانین پر غور کیا جاتا ہے جو امراء و رؤسا کے حق میں بہتر ثابت ہوں۔ معاشرتی سطح پر طبقاتی تقسیم میں تین طبقات زیر بحث آتے ہیں۔ امیر، متوسط اور نچلا طبقہ۔ شیراز زیدی نے اپنے ناول "جہنمی لوگ" میں ایسے غرباء کی حالت زار کو بیان کیا ہے۔ جو کہنے کو تو نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں مگر یہ نچلا طبقہ خط غربت سے بھی نیچے کی زندگی بسر کرتا ہے۔ صاحب ثروت ان کا استحصال مختلف طرح سے کرتے ہیں۔ مرد و عورت کی تخصیص کیے بنا ہر ایک کے ساتھ ناروا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ ٹھیکیداروں کے رحم و کرم پر پلنے والے یہ خاندان ایک ایک نوالے کے محتاج

ہوتے ہیں۔ ان کی کل جمع پونجی پورے دن کی مزدوری پر مشتمل ہوتی ہے جو رات کے آخری نوالے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر مسعود رضا خاکی کے بقول:

"جو ادیب عام انسانوں کی افلاس، جھونپڑیوں کی بدبو اور غریبوں کی زندگی کی بدصورتی سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا وہ صحیح معنوں میں حسن سے محبت ہی نہیں کر سکتا اور حسن کاری کی وسعتوں سے بھی ناواقف رہتا ہے۔"(۲۵)

لکھاری کسی بھی صنف میں طبع آزمائی کرے۔ عوام کا نبض شناس ہوتا ہے۔ خط غربت سے بھی پست درجہ کی زندگی بسر کرنے والے مزدور کی کہانی کو اگر مصنف جہنمی لوگ کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ تو یہ ناول نگار کی معاشرتی سطح پر عمیق مطالعے کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان لوگوں کی دنیاوی زندگی میں بھوک اور ننگ کا دور دورہ ہے۔ بھوک افلاس اور غربت کی گھٹائیں ان کی جھونپڑیوں کو ہر سو اپنی لپیٹ میں لیے رکھتی ہیں۔ انھیں پیٹ بھر نوالہ تک میسر نہیں آتا۔

قدیم و جدید انسانی تاریخ پر تاحد نگاہ دوڑائی جائے، جو کچھ دکھائی دیتا ہے اس پر اعتماد و یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ابتدا سے آج تک انسانی زندگی میں جتنے بھی ادوار آئے ان میں مساوات بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ تفریق و تفاوت کی عمر زیادہ رہی نسبت برابری کے۔ یا شاید تفریق ہی تفریق تھی۔ محمد الیاس کا ناول "کہر" کچھ ایسے ہی حالات و واقعات کے ساتھ ناول کی تاریخ کا حصہ بنتا دکھائی دیتا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۲ء تک کے پاکستانی سماج کو اس ناول کے اندر بیان کیا گیا ہے۔ جو ہر لحاظ سے آزمائشوں پر مبنی دور کہا جا سکتا ہے۔ سماجی و نفسیاتی حالات کے ساتھ ساتھ ایک پہلو معاشی بھی اس ناول کا حصہ بنتا ہے۔

ناول میں متعدد کرداروں کے ذریعے ملکی معاشی حالات سامنے آتے ہیں۔ تقسیم کا ابتدائی دور بہت ہی کربناک دکھایا گیا ہے۔ زمین، زر اور زن کی بدولت پہلا قتل اس سیارے کا مقدر بنا۔ اس نے آئندہ کے قتل کی راہیں ہموار کرتے ہوئے مزید بیج بو دیے۔ اس بیج سے کئی تناور درخت جاہ و جلال کے ساتھ آج بھی قائم و دائم ہیں۔ انسانیت کی پامالی، عزت و آبرو کا خاتمہ، عصمت دری، آنسو، آہیں، آگ، شعلے غرض وہ سب کچھ جو تباہی و بربادی کی وجہ بنتا ہے۔ پورے برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں اس وقت دیکھا گیا۔ جب یہ خطہ تقسیم ہو رہا تھا گو یا ایسی کالی آندھی چلی جس میں دو نفوس ایک دوسرے کو آمنے سامنے کھڑے دکھائی نہ دے رہے تھے۔ اور

اس کے پس پشت انسانی مفاد پرستی وہوس زر تھی۔ خاص ناول کے حوالے سے دیکھا جائے تو جہاں بھی انسانیت کے مقام سے گرتا کوئی بھی انسان دکھایا گیا ہے اس کے پیچھے دولت کی ہوس ہی دکھائی دیتی ہے۔ قتل وغارت گری کے دور میں دو نفوس نو مولود بچے کو گود میں لیے ایک انجان وادی میں پناہ گزین ہوئے تو وجہ دولت ہی تھی۔ ناول کی کہانی میں تقسیم کے وقت جو فسادات برپا ہوئے اس کے حوالے سے انسانیت کی پامالی کو بھرپور انداز میں رقم کیا گیا ہے۔

خان بہادر کے بیٹے اور رام چند کے بھائی ایک ہی ادارے سے فارغ التحصیل ہیں۔ رام چند کے بھائیوں کی ذہانت کا خاتمہ کرنے کے لیے اور اپنی دال کو بہتر انداز میں گلانے کے لیے خان بہادر کے بیٹوں کو اس سے بہتر کوئی موقع نہ ملتا کہ وہ خدا کی زمین میں رخنے ڈال کر اسے کلمے کے نام پر مخصوص کر دیں۔ معاشرتی سطح پر کیے جانے والے اس ظلم کے پس پشت دولت ہی بڑا محرک تھی۔ کیونکہ وجہ کلمہ ومذہب ہوتا تو رام چند کا پورا خاندان اجڑنے سے قبل کلمہ پڑھ چکا تھا۔ ہوس زر نے مذہب واخلاقیات کی تمام روایات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انسان سے وہ شرمناک کام کرواڈالا جسے دیکھ کر انسانیت دور کھڑی شرمسار تھی۔ اور درندگی اپنا علَم بلند کیے ہوئے تھی۔

> "انسان اور پست درجے کے جانوروں میں بہت فرق ہے زیادہ تر لوگ یہ فرق بھی مٹا دیتے ہیں"۔ (۲۶)

ناول میں "پیر بگاہ" کے ذریعے معاشی استحکام حاصل کرنا انسانی استحصال کی تاریخ کا ایک گھناؤنا فعل ہے جسے بوستان پیر بگا کے گھر والوں کے ساتھ مل کر انجام دیتے ہوئے اپنا تخت ہوس مضبوط کرتا ہے۔ فطری طور پر ذہنی پسماندہ بچہ کو پہلے نصیر الاسلام اور حسینہ اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس کے بعد بوستان اپنی پست ذہنیت کی بدولت بگا کو اس کے گھر والوں سے سالانہ کرائے پر حاصل کر کے اسے استعمال کرتا ہے۔ اور اپنی تجوریاں بھرتا رہتا ہے۔ ول ڈیورانٹ نے اگر انسان کو پست درجے کے حیوانوں سے مماثل قرار دیا تو کچھ غلط نہیں تھا۔ کیونکہ قدیم سے جدید دور تک انسان نے برتنے کی اشیاء ایک دوسرے سے ادھار لیں ان کے سودے کیے، کرائے پر لیں اور بیچیں بھی۔ لیکن انسان کو کرائے پر لینا انسانی تاریخ کا ایک گھناؤنا اور مکروہ فعل بن کر انسانیت کو منہ چڑھاتا دکھائی دیتا ہے۔

"یہاں دو ہی طبقے ہیں ایک لوٹنے والوں کا اور دوسرا لٹنے والوں کا۔۔۔بابا کہتا ہے جب تک لالچ کی دنیا قائم ہے، دکھ اور مصیبتیں ہیں، ناانصافی اور لوٹ مار ہے۔ نفرتیں اور کدورتیں ہیں، ہمارا کاروبار چلتا رہے گا"۔(۲۷)

قدیم دور جبکہ انسان شعور کی بے پناہ منازل طے نہیں کر پایا تھا۔ انسانی جسموں کی منڈیاں لگا کرتی تھیں۔ سر بازار غلاموں اور لونڈیوں کے سودے کیے جاتے تھے۔ لیکن جدید دور میں جس ڈھٹائی اور جرات مندی کے ساتھ پست ذہنیت کے مالک اپنی آرزؤں کو پورا کرنے کی خاطر چور راستوں پر چل نکلتے ہیں۔ اس کی مثال دور جہالت کی تاریخ بھی شاید ہی پیش کر سکے۔ دولت کے پجاری اپنی ہوس ایک ذہنی طور پر مفلوج انسان کے ذریعے حاصل کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

ان مسائل کے علاوہ اس ناول میں ملکی سیاسی تاریخ کے تناظر میں ہونے والے معاشی مسائل کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ جنرل ایوب، ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں ملکی سطح پر درپیش معاشی مسائل کا احوال جابجا دکھانے کی کامیاب کوشش ملتی ہے۔ غیر مساوی معیشت کی بدولت عوام کی زبوں حالی کا نہ صرف تذکرہ ملتا ہے بلکہ ان کی وجوہات بھی بیان کی گئی ہیں۔ مارشل لا کا یہ دور عوام کے لیے بے ثمر ثابت ہو تا دکھایا گیا ہے۔ ہمیشہ کی طرح ان تینوں شخصیات کے دور حکومت میں بھی صنعتی و زرعی ترقی کا حاصل چند ہاتھوں کی زینت بنتا دکھایا گیا ہے۔

"پوری آبادی دو واضح طبقوں میں بٹ گئی۔ لوٹنے والے، لٹنے والے لیکن مصنوعی اور یک طرفہ خوشحالی کا چرچا دن رات کیا جاتا۔۔۔عام آدمی کی حکومتی امور میں ہر سطح پر عدم شمولیت، غربت و افلاس، تعلیم، علاج، انصاف اور بنیادی حقوق سے محرومی جیسے تلخ حقائق نے خوشنما نعروں کی افادیت خاک میں ملادی"۔(۲۸)

سیاسی سطح پر ہونے والا عوامی استحصال صرف سیاسی نہیں رہتا بلکہ اس کا بنیادی محرک معیشت ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ اہل اقتدار عوام کو مہرہ بنا کر اپنی جیبیں بھرنے کے عادی ہیں۔ بڑے بڑے دعوے اور وعدے ان کے ضمیر کو نہیں جھنجوڑتے۔ جھنجوڑیں بھی کیسے؟ دولت ان کے ضمیر کو ابدی نیند سلا دیتی ہے، اور اس میٹھی نیند کے نشے میں ابتدائی سطح پر عوام بکتی ہے، پھر ایمان بکتا ہے اور اس کے بعد اس زمین کا بھی سودا کرنے سے گریز نہیں کرتے جو انھیں پناہ دینے کا سبب بنی تھی۔

انسانی زندگی کے زمین پر ظہور سے لے کر آج اکیسویں صدی کی دوسری دہائی تک کے سفر کا سرسری جائزہ لیا جائے تو آئے دن ترقی کی راہیں اس پر کھلتی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ حالات کے سامنے سینہ سپر ہو کر اپنے مفاد کی جنگ لڑتا ہے اور پھر جیت بھی جاتا ہے۔ کائنات اس کے لیے تخلیق کی گئی اور اس نے اسے تسخیر کر لیا۔ وہ آج اپنی کاوشوں کا ثمر حاصل کر چکا ہے۔ آسمانوں کی بلند و بالا وسعتوں میں اڑنا اس کا خواب تھا، جس کی تعبیر وہ پا چکا ہے۔ دنیا کے ایک کونے میں رہتے ہوئے دوسرے کونے کے باشندوں تک پیغام رسانی اور تعلقات کا ایک طویل سلسلہ چل نکلا ہے۔ پوری دنیا گلوبل ویلیج کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ انسان نے جتنی بھی ترقی کی ہے اس کی بنیاد سائنس ہی تھی۔ اکیسویں صدی گذشتہ تمام صدیوں کی نسبت اس لحاظ سے زیادہ قابل ستائش ہے کہ اس میں انسان نے ٹیکنالوجی کے میدان میں جو ترقی کی ہے گذشتہ ادوار میں اتنی تیز رفتار کبھی نہیں رہی۔

مرزا اطہر بیگ کا ناول "صفر سے ایک تک" سائبر سپیس کے حوالے سے کافی مواد فراہم کرتا ہے۔ ٹیکنالوجی نے جہاں انسانی خواہشات کی تکمیل میں ہاتھ تھام کر اس کی منزل تک رسائی ممکن بنائی وہیں اس کی تذلیل کا موجب بھی بنا۔ انسانی خواہشات نے جہاں دور قدیم میں انسانیت کی تضحیک و تذلیل کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا وہ آج بھی اسی آب و تاب کے ساتھ اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔ فرق بس رہا تو اتنا کہ پہلے مظلوم طبقہ پاؤں کی جوتی سے زیادہ کی اوقات نہیں رکھتا تھا۔ اسے برابری کا خواب تک دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔ تضحیک و تذلیل آج بھی ہو رہی ہے۔ بس استحصال اور ذلالت کے انداز بدل لیے گئے ہیں۔ غریب کی اولاد اگر بہتر ذہن رکھتی ہے تو اسے استعمال کر کے اپنا مفاد حاصل کیا جاتا ہے۔ اس وقت تک جب تک شریف طبقہ چاہے۔ جب اس کا جی بھر جائے تو اس پر مقدمہ چلا کر جیل بھجوا دیا جاتا ہے۔

> "سالار بڑوں کی سرگرمیاں وسیع ترین معنوں میں ہمیشہ سے شکار تک محدود رہی تھیں۔ جس میں حیوانی، انسانی اور ملکیتی کی کوئی تخصیص نہیں"۔(۲۹)

زمینی فاصلے جتنے کم ہوتے جا رہے ہیں، انسان کا دوسرے انسان سے فاصلہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ نفرتیں اور عداوتیں اپنی جگہ اتنی ہی گہری بناتی جا رہی ہیں۔ ایسی ہی جڑ پکڑتی نفرتوں کا موجب نائن الیون کا واقعہ تھا۔

بیسویں صدی کے آخری دس سال انسانی زندگی میں آنے والی مثبت تبدیلیوں کے حوالے سے کافی اہم گردانے جانے لگے۔ انسان سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں قدم رکھ کر اپنے آپ کو ترقی کی راہوں پر گامزن کر کے مطمئن دکھائی دیا جانے لگا۔ ایسی صورتحال میں یہ تصور عام ہونے لگا کہ اب مزید کوئی جنگ انسانی تاریخ کا حصہ نہ بن سکے گی۔ انسان کی تمام تر کوششوں کا محور و مرکز معاشی حالات کی درستی اور ترقی ہو گی۔ مگر گزرتے وقت نے اس خیال کو حقیقت کا جامہ نہ پہننے دیا اور دیگر آفات کے ساتھ ساتھ نائن الیون کا واقعہ انسانی زندگی کی بدترین آفت بن کر سامنے آیا۔

ان حالات میں جہاں انسانی زندگی سماجی و نفسیاتی مسائل سے دوچار ہوئی وہیں معاشی عدم استحکام بھی سامنے آیا۔ معاشی عدم مساوات اور سماجی ناانصافی کا ایک عمیق سمندر دکھائی دیا جانے لگا۔ یہ ایسا سمندر تھا جس میں جدید عہد کا ماحول ہچکولے لینے لگا۔ استعماری قوتیں اپنے شکنجے نئے انداز اور اختیارات کے ساتھ کستی چلی جا رہی تھیں۔ ہر جانب بیروزگاری، بھوک اور افلاس کی دنیا کا بازار گرم دکھائی دینے لگا۔ معاشی نظاموں پر قابض اک جدا دنیا کے باشندے انتہائی بے رحمانہ انداز میں غریب قوموں کا خون نچوڑنے لگے۔

"ساسا" شیراز دستی کا تحریر کردہ ناول کچھ ایسے ہی حقائق پر سے پردہ اٹھاتا ہے۔ ناول میں جابجا معاشی ناہمواریوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ غربت کی داستان میں گزرتا وقت شاید اپنا حصہ ڈالنا بھول گیا اور بے توجہی کے عالم میں اگر پھیلے دامن میں کچھ ڈالا بھی تو فاقہ کشی، محرومی، مجبوری اور بے کسی، یہ غربت کی ایسی شکلیں ہیں جو بے کس و لاچار انسان کو ترسا ترسا کر مار دیتی ہیں۔ سلیم کا گاؤں ترقی کر رہا تھا۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک کی ترقی سے کہیں زیادہ تیزی سے، مدت گزر جانے کے بعد وہ لوٹا تو اس کا علاقہ غربت میں پہلے سے کہیں زیادہ ڈوبا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے گاؤں کے معصوم چہرے آج بھی ادھورے لباس میں ملبوس تھے۔ گویا دنیا کے دوسرے کونے کی ترقی میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اگر تھا بھی تو بس اتنا کہ ان کی کھوپڑیوں پر ترقی کے مینار بنائے جا رہے تھے۔ انھیں محض شک کی بنا پر موت کے گھاٹ اتارا جا رہا تھا۔ وہ لوگ جو دور دیس محبتوں کے پیغام بھیجتے تھے جنھیں ترقی یافتہ معاشروں کے نام تک نہ آتے تھے وہ ڈرون حملوں کی نذر ہو رہے تھے۔

عموماً بین الاقوامی سطح پر لڑی جانے والی جنگوں کا ایک ہی مقصد ہوا کرتا ہے اور وہ یہ کہ مال اکٹھا کر کے سرمایہ دار کی حیثیت کو مضبوط کیا جائے۔ دنیا میں مساویانہ طرز زندگی کا تصور ناپید ہے وجہ ایک ہی طبقہ کو برتر رکھنا۔ استحصالی قوتوں نے استعمال کے ہتھیار بھی الگ نوعیت کے بنا رکھے ہیں۔ دنیا کے اکثر لوگوں کو اوسط درجے سے آگے کی معلومات فراہم کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ وجہ؟ ان کی سوچ بیدار ہونے سے زندگی ہو شیار ہو سکتی ہے۔ اس لیے سماج کے یہ ٹھیکے دار ان پر گہری نیند کے تنبو تانے رکھنا اپنا اولین فرض تصور کرتے ہیں۔ لاعلمی کی شراب انھیں نشے کے طور پر پلائی جاتی ہے۔ اور اس نشے میں دھت حال سے بے نیاز، انھیں سماج کی ایسی صف میں کھڑا کر دیا جاتا ہے جس کا قبلہ بدلنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ اقتباس:

> "۔۔۔ آپ کا دوست سادہ مر گیا۔۔۔ ڈرون حملے میں۔۔۔ کیونکہ سادہ غریب تھا۔۔۔ سادہ لکیر کی دوسری اور رخ کر کے ٹھہرا تھا۔۔۔ اس سادے کو پتا بھی نہیں چلا اور عصر حاضر کا قبلہ بدل گیا۔ نئے ورلڈ آرڈر میں قبلہ رخ نہ ہونے والوں کی سزا موت متعین ہوئی تھی۔ سادہ اس اصول سے واقف نہ تھا۔ سو اس سے فرعون وقت کی نماز قضا ہو گئی "۔(۳۰)

نئے قائم کردہ نظام انصاف کے مطابق غریب کا زندہ رہنے سے زیادہ مرنا اہم ہوتا ہے۔ کیونکہ فرعون وقت کی نماز قضا کرنے والوں کے لیے ٹھنڈی چھتوں والی قبریں نہیں ہوا کرتیں۔ بلکہ ان کے چیتھڑے اڑائے جاتے ہیں تاکہ ان کے لاشے صندوقوں میں بند کر کے پکی میخیں لگا کر لائی جائیں۔ اور اس طرح ان کے استحصال کی تاریخ رقم ہو سکے۔ فرخ ندیم اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

> "۔۔۔ جس طرح جنگیں کرنسی کے ریٹ سے لڑی جاتی ہیں اسی طرح موت کی قیمت بھی کرنسی کے ریٹ سے طے ہوتی ہے۔ سادہ ایک دیہاتی مدرسے کا مولوی ہے جس کی ڈرونی موت اس کے کئی ساتھیوں کی اجتماعی موت کے باوجود کشش ثقل نہیں رکھتی جس طرح ایک امریکی پرندے ساسا کی ناگہانی مرگ کی معنی خیز مقناطیسیت تجسیم ہوتی ہے "(۳۱)

ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ کے بعد دنیا میں قائم ہونے والا نیا نظام استحصالی قوتوں کو مزید طاقتور بنا گیا۔ مذہبی اور معاشی تفاوت پر لڑی جانے والی جنگوں میں انسانیت کی پامالی اس قدر بڑھتی گئی کہ اس کی قیمت

ایک پرندے سے بھی کم تر ہو کر رہ گئی۔ مسلم ممالک اور خاص کر پاکستانیوں کے حوالے سے رویہ انتہائی جارحانہ سامنے آیا۔ بقول ساجد اقبال:

"۔۔۔ناول میں اکثر مقامات پر معاشی ناہمواریوں کے ماروں کی غربت کا نوحہ بہت خوبی سے لکھا ہے۔ غربت جس کی کوکھ سے محرومیاں، مجبوریاں اور مایوسیاں جنم لیتی ہیں جو فاقہ کش کو مجرم اور بے کس کو گناہ گار کے روپ میں پیش کر کے تہی دست کر کے مارتی ہے کسی عذاب سے کم نہیں "(۳۲)

یہ عذاب ہر وہ انسان جھیلتا آیا ہے اور جھیلتا آئے گا جو غریب ہے، سادا ہے کیونکہ سادے کو فرعون وقت کے قائم کردہ اصول اس لیے نہیں بتائے جاتے کہ اسے سادا ہی رکھنا ہوتا ہے۔ ہوشیار ہو جائے تو بیدار ہو جائے گا اور سادے کی بیداری ہوشیار کی موت ہے۔ لھذا ہوشیار کی بقا کے لیے سادے کا فنا ہونا لازم ہوتا ہے۔

ناول "قربت مرگ میں محبت" معاشرتی و نفسیاتی کے ساتھ ساتھ معاشی مسائل کو بھی بیان کرتا ہے۔ اقتباس:

"سائیں وہ سجدہ کریں گے۔۔۔۔۔اور واپس چلے جائیں گے۔۔۔۔ہم مرشد کی چوکھٹ کی حفاظت کریں گے۔۔۔اپنے سسر کو کہہ دیں گے کہ ایسا نہ ہو۔۔۔۔اور ایسا نہیں ہو گا۔۔۔"۔(۳۳)

اور واقعی ایسا نہ ہوا۔ تب تک جب تک خاور عابدہ سومرو کے لیے وجہ تسکین ہستی بنا رہا۔ مرشد کی چوکھٹ اس کے لیے مذہبی عقیدت کا رتبہ رکھتی تھی۔ وہ بل ڈوزر جو کل خدائی کو ڈھا دینے والے تھے۔ اس کی چوکھٹ پر سجدہ ریز رہے۔ ان کی مجال ہی نہ تھی ایسا کچھ کرنے کی۔ پھر اچانک ایک رات جب وہ لفظوں کا کھیل قلم اور کاغذ پر کھیلنے میں مگن تھا تو اس کا گھر کھنڈر بنا دیا گیا۔ بڑے بڑے بلڈوزر اپنے دانت کھولے دیواروں کو گراتے چلے جا رہے تھے۔ کتابوں، کرسیوں کو مسمار کرتے کرتے وہ اس کی ذات تک آ پہنچے۔ بمشکل خود کو ملبے میں ڈھیر ہونے سے بچایا یا۔ غیر قانونی گھر تو بہت سے تھے صرف اسی کا نہ تھا۔ اس کے ارد گرد قریباً سبھی گھر غیر قانونی تھے۔ مگر انسان کی بنائی ہوئی مشینری وہی کچھ دیکھتی تھی جو اسے دکھایا گیا۔ بلڈوزر حیثیت کی تخصیص کر سکتے تھے۔ انھیں پتہ تھا کہ اقتدار کے ایوانوں تک رسائی حاصل کرنے والوں کی دیواروں پر سجدے کرتے ہیں۔ انھیں چومنا ہے اور چلے جانا ہے۔ با لکل اسی طرح سجدہ ریز ہونا ہے جس طرح خاور کے در پر کچھ عرصہ قبل سجدہ ریز رہے۔ کیونکہ خاور اس وقت مرشد

تھا۔ آج خاور کی حیثیت ایک عام انسان کی تھی۔ اور عام انسان کو جینے کا حق صاحب ثروت خیرات میں دیتا ہے۔ دل کیا تو دی اور نہ کیا تو مار ڈالا۔ کہا جاتا ہے کہ فطرت کا قانون عدم مساوات لیے ہوئے ہے مگر بغور مطالعہ کیا جائے تو شاید انسان فطرت سے بھی کہیں زیادہ ظالم ثابت ہوا ہے۔ فطرت کا قانون سبھی کے لیے یکساں ہوتا ہے۔ موت، زلزلہ اور دیگر نوعیت کی قدرتی آفات امیر غریب سبھی کے لیے یکساں طور آتی ہیں۔ مگر یہ قانون انسانوں کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ جو غریبوں کے لیے عرصہ حیات تنگ کر دیتا ہے۔

خاور نے جب گھر بنایا تو آس پاس مقامی سیاست دانوں کے حواری بھی آباد تھے۔ بیوروکریٹس اور ایٹمی سائنسدانوں کے میل ملاپ والوں کی آماجگاہیں بھی تھیں۔ بلڈوزر در دولت پر آتے، حاضری لگواتے اور چلے جاتے۔ وجہ ارد گرد کے غریب لوگوں کو ہراساں کرنا اور مرشدوں کے در کو آباد رکھنا تھا۔

اس کا گھر عقابوں کے نشیمن میں تھا مگر یہ عقاب کسی حد تک اس کی بقا کے ضامن بھی تھے۔ وہ گمنام تھا۔ پھر اچانک دولت مند اس کے دوست بن بیٹھے۔ کچھ عرصہ اپنی چھاؤں میں رکھا اور پھر عمر بھر کے لیے تپتے صحراؤں کی نذر کر دیا۔ خاور کو ادیب سے دولت مندوں کے مرشد ہونے کا شرف ملا جو اس کی کل حیات لے گیا۔ سانسوں کی ڈور تک چھن گئی۔ مرنے کے لیے کشتی رہ گئی۔ گھر کی چھت تلے موت بھی نصیب نہ ہونے دی۔ کاش! وہ دولت مندوں کا مرشد نہ بنتا۔ عقابوں اور سرخابوں کے نشیمن اس کی بقا کے ضامن تو تھے۔ ڈرتے ڈرتے ہی زندگی کے دن گزر تو رہے تھے مگر اب کیا؟ جبکہ زندگی ہی باقی نہ رہی تھی۔

ملکی سطح پر پھیلی معاشی ناانصافی اور استحصال کا شکار پوری عوام ہوتی ہے۔ کوئی ایک مخصوص علاقہ نہیں ہوتا۔ مگر بغور مطالعہ کیا جائے اور شاید تاریخ کے حقائق بھی اس سلسلے میں اپنا پلڑا دیہی علاقوں کے حوالے سے بھاری رکھیں گے۔ دیہی علاقے اکثر و بیشتر ان تمام منصوبہ بندیوں سے بری الذمہ قرار دیے جاتے ہیں جن کا تعلق ترقی سے ہوتا ہے۔ شہروں میں اگر سرمایہ دار زندگی اجیرن کیے ہوئے ہے تو گاؤں میں قدیم و جدید سبھی نظام مل کر ان کی تباہی کا موجب بنتے ہیں۔ کسی نے بہت زیادہ توجہ دی تو اپنے مفاد کو پانے کی غرض سے ووٹ لینے جلسے جلوس نکالے۔ ڈھول کی تھاپ پر غریب غربا کو نچایا، خود کو اہم جاننے کا نشہ ملا تو غریب سنبھال نہ پائے اور جو کہا گیا کر بیٹھے۔ لینے والوں نے ووٹ حاصل کیے، مقام و منصب پر فائز ہو کر آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ کبھی کوئی رکا نہیں، رکنا تو درکنار ٹھہرا تک نہیں۔ اب کی بار کوئی آ کر رکا تو وہ "ولیم" (مشمولہ: نو لکھی کوٹھی) تھا۔ ولیم انگریز سرکار کا کارندہ ہے۔ جدی پشتی 'Lan Lord' تھا۔ زندگی میں سب کچھ دیکھ چکا تھا۔ نہ صرف دیکھا بلکہ پانے کا مزا بھی لے چکا تھا۔ ہندوستان سے خاص لگاؤ رکھنے کی بنا پر یہاں کی معاشی ابتر حالت پر کڑھتا ہے۔ ہندوستانیوں سے خاص ہمدردی رکھتا ہے۔ یہی

وجہ ہے جب وہ اپنا عہدہ سنبھالتا ہے تو پہلے دورے پر نکلتے ساتھ ہی حالات کا بغور جائزہ لے کر انھیں بدلنے کی ٹھان لیتا ہے۔وہ پورے ملک کی عوام کو خوش حال دیکھنے کا متمنی ہے۔اقتباس:

"ولیم بڑی گہری نظروں سے اس پورے علاقے کا جائزہ لیتا ہوا جا رہا تھا۔۔۔ویران اور غیر سبز علاقے کو دیکھتا اور سوچتا جا رہا تھا کہ یہ لوگ کیا کماتے اور کیا کھاتے ہوں گے۔اسے ان غریب آبادیوں پر ترس آنے کے ساتھ ساتھ دحشت ہو رہی تھی، جنھیں کچھ خبر نہ تھی۔"(۳۴)

ولیم اپنی سوچ کو الفاظ دے کر عوام کو باور کراتا ہے کہ انھیں اپنے حقوق کے لیے کھڑا ہونا چاہیے۔مگر جن پر غربت کے کئی تھپیڑے یک بعد دیگرے پڑتے رہے ہوں انھیں ہوش کہاں رہتا ہے۔ولیم حکومتی سطح پر بگڑے ہوئے مسائل کی بات کرتا۔جنھیں اس نے سنوارنے کی بہت حد تک کوشش بھی کی۔کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ برصغیر کے علاقوں میں معاشی بدحالی کی بنیادی وجہ انگریز سرکار ہے۔اگر حکومت وقت دولت سمیٹنے کے ساتھ ساتھ کچھ زندگی کے حوالے سے بہتر اقدامات کرتی تو آج یوں بنجر پن کو دیکھ کر وہ وحشت زدہ نہ ہوتا۔دل ہی دل میں اپنے سے قبل یہاں نامزد ہونے والے آفیسروں کو برا بھلا کہتا۔لوگوں کی حالت زار پر کف افسوس مل رہا تھا۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"انگریزی حکومت بد نیتی، معاشی استحصال، جابرانہ لوٹ کھسوٹ اور خود غرضی کا نہایت مکروہ پہلو رکھتی تھی۔"(۳۵)

ولیم کی دسترس میں جتنے بھی علاقے آتے تھے وہ باری باری سبھی کی جانب چلتا جا رہا تھا۔اور وہاں معاشی بدحالی کو دور کرنے کے حوالے سے جو اقدام ہو سکتے تھے، وہ سبھی سوچتا چلا جا رہا تھا۔وہ جن جن علاقوں کا دورہ کرتا ہر ایک کی حالت دوسرے سے زیادہ ابتر دکھائی دیتی۔معاشی اور تعلیمی حالت تو بری تھی ہی مگر لڑائی، فساد، ڈکیتی کے واقعات سمیت نجانے کتنے مسائل میں گھرے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔علاقوں کی کسمپرسی دل کو دہلا رہی تھی۔ولیم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کوئی جادو کی چھڑی ہوتی جہاں سے گزرتا وہیں پھیر کر سب کچھ پلک جھپکنے میں درست کر دیتا ۔ولیم نے اپنے سے قبل افسروں کی تقلید کرنے کی بجائے اپنے پیشے سے انصاف برتتے ہوئے علاقوں کی ترقی پر توجہ دی اور کئی پیش رفت سامنے آئیں۔تعلیمی نظام کی جانب خصوصی توجہ دے کر مذہبی رہنماؤں کو دین کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم کی جانب راغب کیا۔ان کی معاشی حالت کو بہتر کرنے کے لیے باقاعدہ تنخواہ دار ملازم رکھنا شروع کر دیا۔

اب ولیم کے علاقے کا مولوی گھر گھر مانگی ہوئی روٹی کا محتاج نہیں رہا تھا۔وہ خود کفیل ہو رہا تھا۔ علم کے حوالے سے بھی اور جیب کے حوالے سے بھی۔ مگر یہ کیا؟ سب کو انصاف دلانے والا خود زیادتی و جبر کا مستحق کیوں ٹھہرا؟ وہ لوگوں کے شعور کی بات کرتا رہا۔ انھیں اندھیرے سے نکلنے کے چراغ مہیا کرتا رہا اور اپنے ہی چراغ کو بجھا دیا گیا۔ وہ جن کا محسن تھا، انھی کی آل نے اسے آج بے گھر کر دیا۔ وہ گھر جو اس کے باپ دادا کی ملکیت تھا۔ جو خود انھوں نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کرایا تھا۔ وہ آج بھی اس پر لاگت کے بارے میں جانتا تھا۔ دادا سے سن رکھا تھا کہ بھلے وقتوں میں اس پر نولاکھ خرچ آیا تو اس نسبت سے شاید اس کا نام "نولکھی کوٹھی" رکھا گیا تھا۔

علاقے سے محبت کی پاداش میں بادشاہ وقت نے بڑی بھاری سزا سنائی تھی۔ وہ حیران و پریشان اس جوابی خط کو پڑھ رہا تا جو حکومت پاکستان کی جانب سے اس کی درخواست پر بھیجا گیا تھا۔ حکومتی معاملات بھی عجیب ہوتے ہیں جو آپ کا خیر خواہ ہوتا ہے اسی کو دشمن جان کر ہٹانے کے جتن کرتے ہیں۔ پہلی ہی ٹھوکر اس قدر زور دار ہوا کہ وہ اپنے وجود کا توازن کھو بیٹھے۔ اور اگر وجود کا توازن بر قرار رہے تو کم از کم ذہنی سطح پر کشمکش ضروری ٹھہرے۔ کچھ ایسے ہی مسائل سے دوچار ولیم ہوا۔

تقسیم کے بعد اس کا پورا خاندان انگلستان واپس جا چکا تھا۔ مگر وہ یہاں پر رہ کر ملک اور اس کے باشندوں کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ وہ واپس جانے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اور اپنی اسی خواہش کو اس نے نوزایئدہ مملکت کے کارندوں کے گوش گزار کی۔ بنا سوچ بچار اور تحقیق کے فوراً جواب دے دیا گیا۔ جواب ایسا تھا کہ گویا پہلے سے طے شدہ تھا۔ آپ ہمارے ملک کی شہریت نہیں رکھتے لھذا آپ کو ایسے کسی عہدے پر رکھ کر یہاں رہنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ وہ تمام اثر و رسوخ کام نہ آئے جو بھلے وقتوں کے یار تھے۔

تاریخی حقائق اگرچہ ایسے ہی تلخ ہوا کرتے ہیں۔ کہ گھنی چھاؤں دینے والے پیڑ جب جھڑ جائیں تو درخت کی رونق ختم ہو جایا کرتی ہے۔ لوگ مڑ کر نہیں دیکھتے۔ اب ولیم کا وہ مقام باقی نہیں رہا تھا کہ لوگ اس کے لیے سفارش کرتے۔ ولیم اس وقت تک کروڑ کا ہاتھی تھا جب تک انگریز سرکار یہاں حاکم تھی۔ اب حکومت کسی اور کی تھی تو اثر و رسوخ بھی نوازالحق جیسے لوگوں کے چلتے تھے۔ ولیم کے نہیں۔ ولیم کام کرنے والا بندہ تھا اور کام کرنے والا بندہ ایسی جگہوں پر رکھنا مناسب نہیں ہوتا۔ جہاں ملکیتیں دوستی کے نام پر دی جاتی ہیں: اقتباس:

> "۔۔۔ وہاں ایک بڈھا انگریز رہتا ہے۔ یہ کوٹھی اسی کے باپ دادا نے وکٹوریا دور میں بنوائی تھی۔۔۔ مگر آپ لاہور کو چھوڑ کر وہاں اتنی پرانی کوٹھی میں کیوں رہیں گے۔۔۔ شمس الحق نے دوبارہ سگریٹ سلگایا اور بولا، نواز صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ہمیں سیاست کرنی

ہوتی ہے۔ وہ رہنے کے لیے تھوڑی آلاٹ کروانی ہے؟ وہاں ہمارے مال مویشی ہوں گے یا کچھ نوکر رہیں گے۔ کبھی کبھی ہم بھی وہاں آجایا کریں گے۔ اس طرح علاقے میں وجود برقرار رہتا ہے۔"(۳۶)

پرانے بنگلوں اور کوٹھیوں کی بدولت عوام پر اپنی دہشت اور دھاک قائم رکھنے کے لیے ولیم کے باپ داد کی ملکیت اس سے چھین لی گئی۔ ولیم کو بے گھر کرنے والا وہ انسان تھا جس کے باپ داد پر ولیم کے احسانات تھے۔ مولوی کرامت اور فضل دین دونوں پر اگر ولیم کی نظر کرم نہ پڑتی تو آج نوازالحق اس قدر کرخت لہجہ لیے اس کے در پر نہ آن کھڑا ہوتا۔

ملکی سطح پر پھیلی معاشی بدحالی سے ہر خاص وعام متاثر ہوا۔ اگر شمس الحق آج "نولکھی کوٹھی" کا نامہ اپنے نام لکھوا رہا تھا۔ تو اس بات سے بخوبی آشنا تھا کہ نوازالحق اس سے اپنی ترقی کی بات کرنے والا ہے۔ اور شمس الحق کے اتنے اثر ورسوخ تھے کہ ایک آفسر کو ترقی دلانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ یعنی اونچے طبقات میں لین دین کا جو طویل سلسلہ چل نکلا تھا۔ اس میں اگر کوئی پس رہا تھا تو وہ متوسط اور نچلا طبقہ تھا۔ حکومتی ملکیت ایک دوسرے کو تحفہ دے کر اپنا مفاد حاصل کرنا کوئی نئی بات نہ تھی اور نہ ہی کسی کی آبائی ملکیت اس سے چھین کر کسی اور کو دینا کوئی بڑی رہی تھی۔ یہ طویل سلسلہ عوام کا سدا سے استحصال کرتا آیا تھا اور آج بھی کر رہا تھا۔

ولیم سے متعلق کوئی ایک واقعہ ہی نہیں جو ہندوستان کے معاشی حالات کے بگاڑ کی وجہ ہو۔ تقسیم سے قبل کے حالات پر غور کر لیا جائے تو حقائق روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتے ہیں کہ سودھا سنگھ غلام حیدر کا بڑا نقصان کر کے بھی نہیں پکڑا جاتا تو اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ وہ اس وقت کی حکومت کو دیسی شراب کے مٹکے مہیا کر رہا تھا۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انگریز حکومت بھی رشوت خوری جیسی برائی کی مرتکب تھی؟ کیا ان کی فطرت بھی اس چلن کی تھی جیسی ہندوستانیوں کی؟ ناول کے تناظر میں جو حقائق دیکھنے کو ملتے ہیں ان کے مطابق حکومت کو ایسی بری لت لگانے والی خود عوام تھی۔ ورنہ ان کا اپنا معاشرہ ایسے تمام معاملات سے پاک تھا۔ رشوت خوری نے جہاں غریب لوگوں کی زندگی اجیرن کی وہاں ملکی معاشی پسماندگی کو بھی ہوا دی۔ اقتباس:

"یہ انگریزی بابو اور میمیں یہاں کتے لڑانے، زمینیں خریدنے، کبوتر اڑانے اور کوٹھیاں بنانے کا دھندا کھلے کھیتوں کرتے ہیں۔ اور یہ سب عیاشیاں رشوت کے بغیر نہیں ہوتیں۔۔۔ جہاں دیسی دلا دس لیتا ہے، یہ گورا بیس لیتا ہے۔ مُل میں فرق ہے کر توت میں نہیں رہا۔"(۳۷)

رشوت خوری مقامی لوگوں کی مانند انگریز حکومت کے منہ کو بھی لگ چکی تھی۔ جس کی بدولت ملک معاشی بدحالی کے اندھے گڑھے میں گرتا چلا جارہا تھا۔ ابتدائی ادوار میں جبکہ دہلی کو فتح کر کے وہاں نئی حکومت قائم کی گئی تو ایسے تمام برے کاموں سے دور تھے۔ مگر جونہی مقامی باشندوں کے ساتھ میل جول زیادہ ہوا تو ہر وہ برائی اس حکومت کا بھی حصہ بنتی چلی گئی جو مقامی حکومت کے باشندوں میں تھی۔ انگلستان کے بااثر رویے کی بدولت انگلستانی کام کرنے کے پیسے بھی مقامی لوگوں سے زیادہ لینے لگا تھا۔ اس طرح رشوت جیسی بری شے ملکی سطح پر اپنی جڑیں مضبوط کر کے معاشی بدحالی میں اضافہ کرتی چلی گئی۔

ابتدا سے آج اکیسویں صدی آج تک ہمارے ملک کے بیشتر لکھاریوں نے اردو ادب کے خزانے کو اپنی گراں قدر خدمات سے بھرنے کی ان تھک کوشش کی ہے۔ ادیبوں کی اس کہکشاں نے شاعری و نثر دونوں انواع میں طبع آزمائی کی اور بے پناہ چمکتے ہوئے ستارے ادب کی دنیا میں روشن ہو کر ابھرے۔ طاہرہ اقبال اسی کہکشاں کا ایک چمکتا ہوا ستارہ ہیں۔ ان کا شمار ایسے حقیقت نگاروں میں ہوتا ہے جو بے دھڑک حقائق بیان کر دیا کرتے ہیں۔ افسانے کی دنیا میں اپنا آپ منوانے کے بعد ناول لکھا۔ اور پنجاب کے بیشتر علاقوں کی تاریخ کو اس کے اندر سمو دیا۔ ("نیلی بار" وسطی پنجاب کا وہ علاقہ جو دریائے راوی اور ستلج کے درمیان واقع ہے)۔ انھوں نے ملکی و بین الاقوامی سطح پر درپیش مسائل کو اپنے ہاں جگہ دی۔ مگر جاگیر داری نظام کے خدوخال اجاگر کرنے میں ایک ماہر دست کار کی طرح کام کرتی ہیں۔ خود اسی نظام کی پروردہ ہونے کی بدولت اس نظام کی خوبیوں اور خامیوں سے بخوبی آشنا دکھائی دیتی ہیں۔ متعدد جگہوں پر وہ اس طبقہ خاص کے بھیدوں کی طلسم کشاہ کھائی دیتی ہیں۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد پنجاب کا بیشتر علاقہ جاگیر داری نظام کے شکنجے سے آزاد ہونے کی بجائے اس میں مزید جکڑا گیا۔ محمد نعیم اللہ اس حوالے رقمطراز ہیں:

> "۱۶۱۴ء میں یہ کون کہہ سکتا تھا کہ انگریز تاجر برادری بتیس سال بعد ۱۶۴۹ء میں اپنے بادشاہ چارلس اول کی گردن سر بازار پارلیمنٹ کے سامنے کاٹ کر ۱۶۶۰ء میں ملک انگلستان میں تو فیوڈل ازم کا خاتمہ کر دیں گے۔ لیکن ہندوستان کو فتح کرنے کے بعد ہندوستان میں جا گیر داری، زمینداری نظام کو نہ صرف اس کی طبعی موت سے بچائیں گے بلکہ اپنی سب سے بڑی اس کالونی میں فیوڈل ازم کو ایسی مضبوط بنیادوں پر دوبارہ کھڑا کر جائیں گے کہ یہاں کے لوگ آزادی کے پچپن سال بعد اپنے ظالم فیوڈل حکمرانوں کے جنگل سے نہیں نکل سکیں گے"۔ (۳۸)

یورپ کی سرزمین سے شروع ہونے والا یہ نظام سامراجی حکومت کے ساتھ برصغیر پاک وہند کی سرزمین پر پڑا۔ یہاں کی ذرخیز زمین میں اس قدر پنجے گاڑھے کہ خطہ دولخت ہو جانے کے باوجود بھی اس سے چھٹکارا نہ پا سکا۔ معاشی حالت دگرگوں ہونے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی نجی زندگیوں میں بھی اس نظام کا دخول دکھائی دیتا ہے۔

بھوکے کو پیٹ بھر روٹی مل جائے تو وہی جگہ اس کے لیے مقدم ہوتی ہے۔ شاید ماں کی گود کی مانند مقدس۔ ملک فتح شیر (مشمولہ: نیلی بار) کی جاگیر پر لٹنے والے ذیلدار کے در سے بازیابی کی بھیک مانگنے پہنچے۔ ایک سے لٹے تو دوسرے اسی کے جیسے سے التجائے رحم۔ کیسی کم عقل دنیا کے باسی تھے۔ وڈیروں کا بارہا شکار ہونے کے باوجود بھی ان کی کیمسٹری نہ جان پائے تھے۔ اقتباس:

> "لیں ملک جی یہ پستہ ایران سے کل ہی آیا ہے۔ اپنے ایک وزیر صاحب دورے پر گئے تھے۔۔۔ یہ قہوہ خالص سری لنکا کا ہے۔۔۔ لیں ذیلدار جی! خالص بلجیم کا تمباکو۔۔۔ آپ تو جانتے ہیں سائیں اپنی گرفت مضبوط رکھنے کو بعض اوقات رعیت کے ساتھ سختی کرنا پڑتی ہے۔۔۔ ان غریبوں کو اگر آج رج کے کھانے اور سر اٹھا کر چلنے کی آپ اجازت دے دیں گے تو ان کا کمینہ خون کل آپ کے خلاف جوش مارے گا۔ انھیں بھوکا اور لاغر رکھو"۔(۳۹)

کیا گُر بتا رہے تھے ملک جی ذیلدار صاحب کو رعایا کو قابو کرنے کا۔ پیٹ کی بھوک کو جگائے رکھنا تاکہ آپ کے نام کی تسبیح کرتے رہیں۔ ان کی انا کو ٹھیس پہنچاتے رہو، کچلتے رہو، روندتے رہو۔ اگر انا پرست بن گئے تو عزت کو عزت بنا بیٹھیں گے۔ اپنی عورتوں کی عزتیں پامال ہونے کا تاوان لینا شروع کر دیں گے۔ غیرت کے نام پر قتل کرنے لگیں گے۔ انھیں خوف کی گہری دلدل سے نکلنے نہ دینا۔ اگر خوف کی کوکھ سے باہر آئے تو تخت الٹ دیں گے۔ عددی مقابلے پر اترے تو جیت انھی کی ہو گی۔ بادشاہت واقتدار کے مالک یہی ٹھہریں گے۔ اپنی تمام پشتوں کا بدلہ لینے ان کے ہاتھ ہماری گردنوں تک پہنچ نہ پائیں۔ اس لیے ان کی عورتوں کو ان کے سامنے پامال کیا کرو۔ ان کی روزی روٹی پوری نہ ہونے دیا کرو۔ کیونکہ پیر کی جوتی پیر میں ہی سجا کرتی ہے، سر پر نہیں۔

مال دار طبقات کی قدیمی سوچ، غریب کے حقوق غصب تو کرنے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اہم کام کہ وہ آگاہ بھی نہ ہونے پائے کہ اس کا زندگی سے متعلق کوئی حق بھی تھا۔ اسے تعلیم، صحت، عزت جیسی کوئی شے مہیا کرنے کی غلطی سرزد نہیں ہونی چاہیے۔ غریب کی آگہی امیر کی موت ہو گی۔ اس لیے اسے روٹی کپڑے کے چکر میں پھنسائے رکھنا بے حد ضروری ہے۔ امرا و رؤسا کے لیے خشک میووں کی بوریاں بیرون ممالک سے تحفتاً لائی جاتی

ہیں۔وہ طشتریاں بھر بھر ایک دوسرے کے آگے رکھتے ہیں۔ میووں کو کھاتے وقت ان کی گفتگو کا موضوع غریب کی ہی زندگی ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے اپنے تجربات بیان کرتے ہیں۔ غربا کا ان کے ہاتھوں ہونے والا استحصال، ان کی معصومیت، بدلتے حالات کی امید میں اپنا حق لینے کے لیے کھڑا دیکھنا، اور حقیقت اس کے برعکس پا کر پھر سے اپنے آقا کی جوتیاں سیدھی کرنا۔ ان سب تذکروں میں غریب کے جذبات باعث تضحیک ہوتے ہیں۔ مذاق اڑا کر قہقہے لگائے جاتے ہیں۔ غربا کی بیوقوفیاں امرا کی سمجھداری و عقل مندی کے لیے سیڑھی مہیا کرتی ہیں۔ اس لمحے سب کچھ دولت و مقام کے نشے میں زیر دست معلوم ہوتا ہے۔ انھیں غربا کو دبا کر رکھنے کے تمام گر پتا ہوتے ہیں۔ اور اقتدار و اعلیٰ منصب کے نشے میں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سدا استحصال و زیادتی کا شکار غریب ہی نہیں رہتا۔ کہیں وقت موڑ کھاتا ہے تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اور امیر بھی امیر کے استحصال کا باعث بنتا ہے۔

اقتدار و حکومت کے نشے میں اخلاقیات و انسانیت کے تمام قاعدے قوانین نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ انسان وہی کرتا ہے جس سے اس کے تخت کو مضبوط بنیادیں فراہم ہوں۔ عبدالرحمٰن باپ کے متعدد ناجائز کاموں میں اس کے خلاف سینہ سپر ہونے لگا۔ بالآخر وہی تخت ہوس جس کے لیے ملک فتح شیر غریبوں کی عصمت دری، ان کے حقوق سبھی کچھ غصب کرنے کا ماہر تھا۔ اپنی ہی اولاد کی چالیں نہ جان پایا تو ان کا شکار ہو گیا۔ جوان خون، جوان ذہن بڑی ہشیاری کے ساتھ جال بنتا رہا اور باپ کو سفر آخرت کی جانب روانہ کر دیا۔ ماں رقیہ بیگم حالات اور بیٹے سے سمجھوتا کر کے چھوڑ کر شہر آبسی۔ وہ شوہر گنوا چکی تھی۔ اب دو بیٹیاں نہیں گنوانا چاہتی تھی۔ غریبوں کے جذبات کا مذاق اڑانے والا آج آکر دیکھتا کہ اس کی ذات کی قیمت کتنی اور کس نے لگائی؟ گویا استحصال کے لیے صرف غریب ہی تختہ مشق نہیں بنتا اکثر و بیشتر امرا اور رؤسا بھی اس کا نشانہ بن جایا کرتے ہیں۔

معاشی پسماندگی اور غیر مساویانہ تقسیم دولت سے معاشرے میں طبقات تخلیق ہوتے ہیں۔ اور انھی تخلیق کردہ طبقات کی تفاوت کو اس ناول میں متعدد جگہوں پر بیان کیا گیا ہے۔ زارا فتح شیر (ملک فتح شیر کی بیٹی) کا بیٹا دوران حج اپنی ماں سے ایسی ہی طبقاتی تفریق سے متعلق سوال کرتا ہے۔ اقتباس:

"ماما کیا خدا بھی امیروں کا ساتھی ہے"۔

زارا نے پیچھے مڑ کر اس گستاخ لڑکے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ یعنی ماما I mean خدا بھی ہماری سوسائٹی سے Belong کرتا ہے"۔

"بیٹا یہ باتیں سوچنے کی ابھی تمہاری عمر نہیں ہے۔ بس اللہ کا شکر ادا کرو کہ وہ تمھیں کس اعزاز سے نوازنے والا ہے۔۔۔"

"لیکن ماما غریبوں کا خدا ان کے لیے کعبہ کا دروازہ کیوں نہیں کھول سکتا۔ خود کیا وہ اس کے اندر نہیں رہتا غریبوں کا خدا اور ہے اور امیروں کا خدا اور ہے ماما"۔(۴۰)

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے جو ایک بار ہوا وہی بار ہا ہوا۔ یہ اس دنیا کا نظام ہے اور ایسا برسوں پہلے بھی ہوا کرتا تھا اور آج بھی ہو رہا ہے۔ دنیا کے قانون میں جبریت کی چکی میں کل بھی بے بس پستا تھا اور آج بھی پس رہا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شکیلہ خاتوں، ڈاکٹر، اردو ناول میں طبقاتی کشمکش، بک ٹاک لاہور، ۲۰۱۸، ص:۱۹

۲۔ فرحت اللہ انصاری، ادب اور تہذیب، آزاد کتاب گھر کلاں محلہ دہلی، ۱۹۴۷ء، ص:۱۵۵۔۵۶

۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (جلد سوم) مجلس ترقی ادب لاہور، ۲۰۰۸، ص:۳۲

۴۔ ڈی۔ڈی کوسمبی، قدیم ہندوستان کی تہذیب و ثقافت، بک ہوم لاہور، ۲۰۱۲ء، ص:۱۳۲

۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، (مرتب) قومی انگلش اردو ڈکشنری، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ص:۳۶۷

۶۔ Coulbourne, Rusbton, Feudalism in History, Princetion University press, London, 1956, P-17

۷۔ عمارہ طارق، ڈاکٹر، اردو افسانے میں جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے مظاہر، (مشمولہ) ماہ نامہ فانوس لاہور، جنوری ۲۰۱۶، ص:۱۹

۸۔ عرفان حبیب، مغل ہندوستان کا طریق زراعت، (مترجم) جمال محمد صدیقی، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی، ۱۹۷۷ء، ص:۴۳۷

۹۔ سبط حسن، پاکستان کے تہذیبی و ثقافتی مسائل، مکتبہ دانیال لاہور، س۔ن، ص:۲۵۰

۱۰۔ یاسر جواد، عالمی انسائیکلوپیڈیا، الفیصل ناشران و تاجران کتب لاہور، جلد اول ۲۰۰۹، ص:۱۱۹۲

۱۱۔ محمد فاروق خان، ڈاکٹر، اکیسویں صدی پاکستان، شرکت پرنٹنگ پریس لاہور، ۱۹۹۶ء، ص:۳۳

۱۲۔ کارل مارکس، ہندوستان کا تاریخی خاکہ (ترتیب و تعارف) احمد سلیم، تخلیقات لاہور، ۲۰۰۲، ص:47)

۱۳۔ تاراچند، ڈاکٹر، تاریخ تحریک آزادی ہند، جلد دوم، مترجم غلام ربانی تاباں، قومی کونسل برائے فروغ وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند، ۲۰۰۱، ص:۲۵۶

۱۴۔ عبدالرشید، میاں، پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص:۱۹۱

۱۵۔ Fulcher, James, Capitalism, a very short Introduction, oxford press, UK. P-11

۱۶۔ اعجاز احمد فکرال، سرخ تیل، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۱۸، ص:۵

۱۷۔ ایضاً، ص:۲۲

۱۸۔ حسن منظر، العاصفہ، شہر زاد پبلشرز م کراچی، ۲۰۰۶ء، ص:۹۹۔۱۰۱

۱۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، حسن منظر، "اردو کا انوکھا افسانہ نگار" مشمولہ ہفت روزہ، ندائے ملت، لاہور، جلد ۴۰، شمارہ ۴۶، ۱۳۔۱۹ نومبر ۲۰۰۸ء، ص:۱۱

۲۰۔ ثمینہ سیف، ناول انسان اے انسان کا فکری و فنی جائزہ" (مشمولہ) جرنل آف ریسرچ اردو، جلد ۳۶، شمارہ ۲، (ششماہی) جولائی تا دسمبر ۲۰۲۰ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان، ص:۵۹۔۶۰

۲۱۔ حسن منظر، انسان اے انسان، شہر زاد پبلشرز کراچی، ۲۰۱۳، ص:۵۹۱

۲۲۔ بازغہ قندیل، اردو ناول میں زوال فطرت انسانی کی تمثیلات، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۱۲، ص:۲۸

۲۳۔ حمید شاہد، محمد، مٹی آدم کھاتی ہے، اکادمی بازیافت کراچی، ۲۰۰۷، ص:۲۷

۲۴۔ خالدہ حسین، کاغذی گھاٹ، دوست پبلیکیشنز اسلام آباد، ۲۰۰۲، ص:۷۸، ۷۷

۲۵۔ مسعود رضا خاکی، ڈاکٹر، اردو افسانے کا ارتقا، مکتبہ جہاں لاہور، ۱۹۸۷ء، ص:۳۱۸

۲۶۔ ول ڈیورائٹ، انسانی تاریخ کے عظیم ترین ذہن اور نظریات (مترجم)، یاس جواد، نگارشات پبلشرز لاہور، ۲۰۱۶، ص:۴

۲۷۔ محمد الیاس، کہر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہوار، ۲۰۱۵، ص:۲۰۸

۲۸۔ ایضاً، ص:۲۷۷

۲۹۔ اطہر بیگ، مرزا، صفر سے ایک تک، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲، ص:۷

۳۰۔ شیراز دستی، ساسا، ص:۱۴۱۔۱۴۲

۳۱۔ فرخ ندیم، تفریق، تقسیم اور ساسا، مشمولہ سہ ماہی ادبیات (خصوصی شمارہ: اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ، شمارہ نمبر، ۱۲۳۔۲۴، جنوری تا جون ۲۰۲۰، اکادمی ادبیات اسلام آباد، ص:۲۱۳۔۲۱۴

۳۲۔ ساجد اقبال، شیراز دستی کے ناول "ساسا" کا تجزیاتی مطالعہ، مشمولہ شش ماہی اردو، جلد ۹۷، شمارہ ۱ (جنوری تا جون ۲۰۲۱) ص:۷۸

۳۳۔ مستنصر حسین تارڑ، قربت مرگ میں محبت، ص:۱۷۲

۳۴۔ علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی: ص:۱۴۹

۳۵۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اردو شاعری ۱۸۵۷ء کے بعد، مشمولہ: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور زبان و ادب،

(ضیاءالحسن،ڈاکٹر،ڈاکٹر ناصر عباس نیر (مرتبین):۱۸۵۷ء جنگ آزادی اور زبان وادب،لاہور،کلیہ علوم شرقیہ،پنجاب یو نیورسٹی،۲۰۰۸)،ص:۲۱

۳۶۔ علی اکبر ناطق،نولکھی کوٹھی،ص:۴۱۱۔۴۱۲

۳۷۔ ایضاً،ص:۱۹۶

۳۸۔ نعیم اللہ،محمد،پاکستان جاگیر داری زمینداری نظام کے شکنجے میں،جمہوری پبلی کیشنز لاہور،۲۰۰۳،ص:۲۶

۳۹۔ طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص:۷۹،۸۰

۴۰۔ ایضاً،ص:۴۵۴

باب چہارم

پاکستانی اردو ناول میں نفسیاتی استحصال کی پیشکش

انسان کائنات کا محور و مرکز ہے۔ جس کی وجہ اس کا اشرف المخلوقات ہونا ہے۔ کیونکہ اگر باقی تمام مخلوقات پر اسے برتری دی گئی تو اس کی وجہ وہ عقل و شعور تھا جو انسان ہونے کے ناطے اسے عطا کیا گیا۔ اسی عقل و شعور کا استعمال کرتے ہوئے وہ کائنات کے سربستہ رازوں سے واقف ہو پایا۔ دنیائے انسانی کے متعارف ہونے والے قدیم و جدید سبھی علوم پر دسترس حاصل کر کے مہارت کا ثبوت دیا۔ علم و عمل کے سبھی رازوں سے واقف ہو جانے کے بعد اسے اپنی ذات کا ادراک پانے کا خیال آیا، کہ آخر انسانی ذات کیا ہے؟ جواب کی غرض سے کئی سوالات نے سر اٹھایا۔ اس دوران انسان نے عقل سے زیادہ مشاہدے پر زور دینا شروع کیا۔ اور اسی مشاہدے نے نفسیات کی بنیاد رکھی۔

لفظ نفسیات کے لیے انگریزی زبان میں سائیکالوجی کی اصطلاح مستعمل ہے۔ جو کہ یونانی زبان کے دو الفاظ Psyche اور Logos کا مرکب ہے۔ جن کے معنی بالترتیب روح کا مطالعہ ہیں۔ ایک عرصے تک نفسیات کو روح کا مطالعہ گردانا جاتا رہا۔ مگر غور و فکر اور ترقی حاصل کر کے اسے انسانی دماغ سے متعلق علم مانا جانے لگا۔ انسانی دماغ جسم کا وہ حصہ ہوتا ہے جس کو بیان کرنا قدرے مشکل تھا۔ کیونکہ دماغ کی سطح پر بہت سی کارکردگیاں ہمہ وقت موجود ہوتی ہیں۔ اور محض دماغ سے متعلق علم کی حیثیت سے نفسیاتی کیفیت کے شعور تک تو پہنچا جا سکتا تھا۔ مگر نفسیات کا مکمل عمل حاصل کرنے کے لیے مزید علمی گہرائی درکار تھی۔ چنانچہ اسی بنا پر علما نے نفسیات کو شعور کا مطالعہ Study of consciousness کا نام دیا۔ جس کا مطلب عام نفسیاتی کیفیتیں اور افعال ہوئے۔ بعد ازاں جدید ماہرین نفسیات نے اس علم کو Study of behaviors یعنی کردار کے مطالعہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ جس میں انسانی کردار کے کم و بیش سبھی پہلو آ جاتے ہیں۔ یہاں لفظ کردار وسیع معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں وہ تمام افعال اور جسمانی کیفیات جو آشکار نہیں ہوتیں جن کا عمل اور ردعمل انسان کے اندرون میں ظہور

پذیر ہوتا ہے اور جن کا ہمیں عام طور پر شعور نہیں ہوتا، سبھی کردار کے دائرہ میں آتی ہیں۔

نفسیات فرد کی ذات، اس کے انفرادی طریقہ، طرز عمل، احساس و جذبات، فکر و رجحان اور باطنی کیفیات جیسے تمام مسائل و معاملات کا جائزہ سائنسی نقطہ نظر سے لیتی ہے۔ اس طرح انسانی شخصیت کے تمام پہلو نفسیات کا مرکز بن جاتے ہیں۔ نفسیات میں چونکہ کردار کو بنیادی / مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے اس لیے اس میں نہ صرف ذہنی کیفیت بلکہ جسمانی حرکات و سکنات کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ نفسیات کے دائرے میں وہ چیزیں بھی آجاتی ہیں جن کے مشاہدے میں کوئی دوسرا شخص شامل نہیں ہو سکتا۔ محسوسات، جذبات، فکر و تخیل، ذہنی الجھنیں، خواہش، عزم، فیصلہ، احساس، کامیابی و نامرادی، حسرت و پشیمانی وغیرہ سبھی نفسیات کے زمرے میں آتے ہیں۔

نفسیات کردار اور نفسی کیفیات کے اسباب و علل کی تلاش کا نام ہے۔ اس میں سب سے زیادہ اہمیت فرد کو دی جاتی ہے۔ کیونکہ فرد کو جانے بنا سماج کے اجتماعی رویوں اور ذہنیت کو جاننا قدرے مشکل ہی نہیں نا ممکن بھی ہوتا ہے۔ غرضیکہ وہ علم جو انسان کی روح اور حسیاتی زندگی سے متعلق ہو اسے نفسیات کہا جاتا ہے۔

انسانی تاریخ یہ آگاہی فراہم کرتی ہے کہ انسان ابتدا ہی سے ذہنی پریشانیوں کو دور کرنے اور اپنے انفرادی و اجتماعی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ تاکہ خوش حال زندگی بسر کر سکے۔ کیونکہ اندر کے ذہنی تصادم سے پیدا ہونے والی کسی بھی خرابی کے نتائج سماجی تبدیلیوں کے باعث سامنے آتے ہیں۔

سماج میں جوں جوں نئی قدریں، رجحانات، رسم و رواج اور رہن سہن کے انداز بدلے، نئے نئے پیچیدہ مسائل کے ساتھ ساتھ ذہنی تصادم، نفسیاتی الجھن اور خلفشار میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان سب مسائل سے انسان کسی نہ کسی ذہنی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان بیماریوں کی ابتدا کب ہوئی؟ انسانی تاریخ اس سوال کا جواب اس طرح سامنے لاتی ہے کہ یہ بیماریاں یا مسائل اتنے ہی قدیم ہیں جتنی کائنات میں انسانی زندگی اور اس کے تمام تر احساس و جذبات۔ یہ سب مسائل و معاملات ابتدا ہی سے کسی نہ کسی شکل میں انسان کے ساتھ موجود رہے ہیں۔ جہاں صحت مند ماحول خوشگوار زندگی کا ضامن ہوتا ہے وہیں آپس کا تضاد بے پناہ الجھنوں اور پریشانیوں کو بھی جنم دیتا ہے۔

عہد قدیم میں غیر معتدل(Abnormality) کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ انسان کی عجیب و غریب حرکات اور اس کے پاگل پن کا ذمہ دار خود انسان کی بجائے کوئی بری روح ہوتی ہے۔ متقدمین اس قسم کے مظاہر کو کسی روحانی وجود کے زیر اثر تصور کرتے تھے۔ جس کا واحد علاج انسان کو اس بری روح سے چھٹکارہ دلانا ہوتا۔ عمومی خیال یہ تھا کہ اگر کوئی انسان اچھی یا عمدہ حرکات کا مرتکب ہوتا تو دیوی دیوتا کے خوش ہونے کی بناپر۔ اس کے برعکس کوئی شخص مروجہ اخلاقی اصولوں کے منافی طور طریقہ اپناتا تو گویا وہ کسی بری عفریت کا شکار تصور کیا جاتا۔ جس کو اتارنے کے لیے معالج اس پر ظلم کرتے تھے۔ اس طریقہ کار کو آسیب اتارناExorcism کہا جاتا۔ جس میں جھاڑو، پھونک، دعا و منتر، کوڑے مارنا، آگ میں جلانا، بھوکا رکھ کے مار ڈالنا وغیرہ شامل ہوتے۔

یونان اور روم میں لوگوں نے وہم پرستی کو چھوڑ کر ہر چیز کو عقل و فلسفہ کی روشنی میں تلاش کیا۔ جس میں سب سے پہلا نام ہیپو کریٹس(Hippocrates ۴۶۰۔۳۷۷ ق۔م کا ہے۔ اس نے ذہنی بیماریوں کے قدیم نظریوں کی تردید کی اور نئے نظریے پیش کیے۔ اور بتایا کہ دماغ تمام ذہنی افعال کا مرکز و محور ہے۔ اور کئی اقسام کی بیماریاں دماغ میں خرابی آجانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ نفسیاتی بیماریوں کی تقسیم کی شروعات میں سب سے پہلا نام ہیپو کریٹس ہی کا ہے۔

دیوانگی /Abnormality کے حوالے سے سب سے پہلا قدم انگلستان نے اٹھایا۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں سینٹ لیوک کی اصلاحات لندن میں نافذ ہوئیں اور یورپ میں پناہ گاہ کا قیام عمل میں آیا۔ ان سنجیدہ کوششوں کی بدولت پاگلوں کے مادی ماحول کو بہتر بنانے اور صورتحال کو بدلنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ انھیں زنجیروں سے باندھ کر اذیت دینے کو خیر باد کہا گیا۔ ان سب معاملات میں تبدیلی کی بدولت سائیکیٹری کا وجود عمل میں آیا۔

انیسویں صدی میں نفسیاتی جنون کو وہم پرستی اور مذہب سے ہٹا کر دیکھا گیا جس کے نتیجے میں ماہرین نفسیات نے ہر شے کا مطالعہ تجربات اور مشاہدات کی بناپر کیا۔ یہ وہ دور تھا کہ جب برین (Brain) کی بناوٹ اور تشریح کو مرکزی اہمیت دی گئی۔ جسے بعد میں کرپلن(Kraepelin)، فرائڈ (Freud) اور یونگ کی تحقیقات نے مزید آگے بڑھایا۔ ۱۹۱۰ء میں جیمس اینگل نے نفسیات کی جامع تعریف پیش کی:

All consciousness everywhere normal or abnormal, human or animal, is the subject matter which the psychologist attempts to describe or explain and no definition of his science is wholly acceptable, which designates more or less than just this".(۱)

نفسیاتی تناظر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی قسم کی جنونی کیفیت کا سبب دماغی خلل، انتشار، تشویش، پیچیدگیاں اور تضاد وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ انسان کی اندرونی کیفیات، ذہنی واردات اور داخلی و خارجی اعمال کا مطالعہ نفسیات کے دائرہ میں آتا ہے۔

انسان کی ماہیت اور اس کے نفس سے متعلق آگاہی کے لیے صدیوں سے کوششیں جاری رہیں۔ اس دوران متعدد سوالات انسانی ذہن کا حصہ بنتے رہے، کئی فلسفیانہ مباحث نے جنم لیا۔ ماہرین نے ان سوالوں کے جوابات تلاش کرنے میں انتھک کوشش کی۔ جس کے نتیجے میں کئی تصورات قائم ہوئے مگر یہ تصورات محض مفروضات اور قیاس آرائیوں سے آگے قدم نہ بڑھا سکے۔ انسانی عقل کو ایک برتر شے تصور کیا جاتا رہا۔ جس کے نتیجے میں نفس انسانی کا ایک خاص عرصے تک مطالعہ عقل اور اس کے مظاہرے تک محدود ہو کر رہ گیا۔ نتیجتاً پوشیدہ انسانی محرکات کا پہلو اوجھل ہوتا گیا۔ وہ محرکات جو جذبات اور ہیجانات کی صورت میں شعوری ولا شعوری سطح پر کام کرتے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے ڈیکارٹ نے اس سلسلے میں اضطراری فعل کا تصور دے کر پیش رفت کی۔ جس نے تجرباتی نفسیات(Experimental Psychology) کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کی۔ جس نے آگے چل کر فرائیڈ، ژونگ اور ایڈلر جیسے جدید نفسیات دانوں کے تصورات کے لیے راہیں ہموار کیں۔

فرد کے خیالات، افکار و اعمال غرض شخصیت کے سبھی پہلوؤں میں جذبات کی فراوانی پائی جاتی ہے۔ جذباتی رجحان کے لوگ درد کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہر اس شے سے مسرت حاصل کرتے ہیں۔ جس سے جذبات کی تسکین ہو۔ البتہ جذبات کا منفی پن انسان کو غصہ اور جارحیت وغیرہ کا حامل بنا دیتا ہے۔ فکر کا

تعلق عقل و دلائل سے ہوتا ہے۔ جبکہ جذبات کا دل سے اور جس انسان میں یہ دونوں رجحان یکجا ہو جائیں۔ وہ بہت بڑا عالم بن سکتا ہے۔ مثال میں ادیب اور شاعر کا نام سر فہرست آتا ہے۔

ایلفرڈ ایڈلر بھی ژونگ کی طرح فرائیڈ کے شاگردوں میں شمار ہوتا ہے۔ ایلفرڈ ایڈلر نے فرائیڈ سے اختلاف کیا اور کہا کہ نفسیاتی کشمکش کا سبب جنسی جبلت کی بجائے احساس کمتری ہے۔ کسی بھی شے سے محرومی کی بناء پر خود کو حقیر و کمتر تصور کرنا احساس کمتری کے زمرے میں آتا ہے۔ ایڈلر کے بقول یہ حساس بچے میں پیدائش کے ساتھ در آتا ہے۔ بڑوں کے مقابلے میں خود کو کمزور و ناتواں محسوس کرنا، سماجی و خاندانی دباؤ کی وجہ سے احساس کمتری میں مبتلا ہونا۔ ان تمام معاملات کا اثر پوری زندگی اس کے ذہن پر رہتا ہے۔

انسان معاشرے کی ضروریات اور تقاضوں کا احترام کیے بنا آگے نہیں بڑھ سکتا۔ کیونکہ ایک موڑ پر سماجی شعور اور احساس برتری ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اور جب سماجی مطالبات فطری تقاضوں کی ضد ہونے لگیں تو ایسی صورت میں فرد کا ربط و آہنگ بکھر جاتا ہے۔ فرد کے مقاصد اور سماجی مطالبات میں تصادم پیدا ہوتا ہے جس سے وہ نیوراسس کا شکار ہو جاتا ہے نتیجے کے طور پر فرد میں منفی رجحان کو تقویت ملتی ہے۔ ایسی صورت میں افراد اپنی قوت کا استعمال منفی کاموں میں زیادہ کرنے لگتے ہیں۔

اس نوعیت کے منفی رجحانات کی زیادہ تر وجہ بچپن کے حالات، ناکامی، خاندانی انتشار اور جوانی کے نامناسب حالات ہوتے ہیں۔ نا مساعد حالات فرد کی جدو جہد میں تعطل پیدا کرتے ہیں۔ انسان ڈپریشن (Depuration) کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے ایڈلر کے خیال میں فرد اور سماج کے اعلیٰ ترین مقاصد کے درمیان کشمکش کی بجائے ربط و آہنگ پایا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ ایڈلر کے مطابق عصبی امراض کی وجہ ذلت اور شکست ہوتی ہے۔ اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ اس میں نشو و نما میں کمی، کمتری کا احساس اور زندگی سے مایوسی وغیرہ۔ احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی صورت میں انسان (Inferiority complex) کا شکار ہو جاتا ہے۔ جن کی پردہ پوشی کرنے کے لیے وہ خاص مقام حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایڈلر کے خیال میں ہر انسان اپنی دلچسپیوں، خصوصیت اور اقدار کی بدولت اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔

الف۔ نفسیاتی استحصال / نفسیات اور استحصال:

زیر تحقیق مقالے کے ابتدائی باب میں استحصال کے حوالے سے تفصیلاً بات ہو چکی ہے۔ جس کے مطابق استحصال چھین، جھپٹ، حاصل، خود مطلبی، ناجائز فائدہ اٹھانا اور دوسروں کا حصہ ہتھیانا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ فلسفہ تمام علوم کی ابتدا ہے اور نفسیات فلسفہ ہی کی ایک شاخ ہے۔ انسان کے ساتھ ہی انسانی نفسیات کی ابتدا ہوئی۔ اور جب انسان میں حق ملکیت کا تصور پیدا ہوا تو اس نے جہاں معاشی و معاشرتی سطح پر دوسروں کا استحصال کیا وہیں نفسیاتی سطح پر بھی زندگی کے سکون کو تباہ کیا۔

آج جبکہ دنیا گلوبل ولیج کی صورت اختیار کر چکی ہے اور انسان کو نت نئے چیلنجز کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ دنیا نئے انداز و اطوار اپنانے کے جتن کر رہی ہے۔ ہر طرف انسان اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔ مالی بد حالی اور معیشت کی تباہ کاریوں کے سبب دنیا کا نظام بدلاؤ کا شکار ہے۔ خود غرضی، لالچ اور حسد جیسی حیوانی خصلتیں انسان کی ذات میں در آئی ہیں۔ افضل انسان اپنے جیسوں کا استحصال کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ایسے حالات میں انسانی نفسیات مزید پیچیدگیوں کی جانب راغب دکھائی دے رہی ہے۔ نفسیات انسانی چونکہ اپنے ارد گرد کے ماحول پر انحصار کرتی ہے اور انسانی رویے خاص ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو غیر صحت مندانہ معاشروں کے رہائشی ہوتے ہیں جہاں انھیں تعصب، نفرت، تشدد اور جہالت جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہو وہاں رویوں میں منفی صورتحال زیادہ سامنے آتی ہے۔ منفی صورت حال کی زیادتی کے نتیجے میں ظلم، جبر و بربریت اور تشدد جیسے برے فعل انسانی نفسیات کو زک پہنچاتے ہیں۔ اور انسان کا جذباتی و نفسیاتی استحصال ہونے لگتا ہے۔

انسانی شخصیت مخصوص خصائص اور جذبات و احساسات سے تخلیق پاتی ہے۔ فرد کا کسی بھی نوعیت کا عمل اس کی شخصیت کا حصہ ہوتا ہے۔ بولنا، ہنسنا، رونا، چال چلن، اخلاق، رویے، تقاضے، سوچیں، خیالات افعال و اعمال غرض سبھی انسانی شخصیت کی پرتیں ہوتے ہیں۔ اور نفسیات انہی پرتوں کی گتھیاں سلجھانے کا نام ہے۔ انسانی شخصیت کی تعمیر میں جذبات و احساسات کو اہم گردانا جاتا ہے۔ اور انھی کے مجروح ہونے کی صورت انسانی شخصیت بکھر جاتی ہے۔

زیر تحقیق باب کا عنوان انسان کے نفسیاتی استحصال کے حوالے سے ہے اس لیے یہ سوال پیدا ہو تا ہے کہ نفسیاتی استحصال کی ابتدا کب اور کیونکر ہوئی؟ جواباً تاریخ کے اوراق کھنگالے جائیں تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ زمین پر دوسرا قدم پڑتے ساتھ ہی جذبات و احساسات کی قدر اور ناقدری کا سوال اٹھنا شروع ہو گیا ہو گا۔ یقیناً زندگی کے مسائل و معاملات میں کہیں میں کمی بیشی ہوئی ہو گی۔ جس سے دوسرے انسان کی ذہنی کیفیات اذیت و تکلیف میں مبتلا ہو کر بے چین و بے بس ہو گئی ہوں گی۔ اور یہیں سے نفسیاتی استحصال کی ابتدا کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا ہو گا۔ جو انسانی شعور کی ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا چلا جا رہا ہے۔

نفسیاتی استحصال کی صورتیں:

نفسیاتی استحصال (Psychological Exploitation) ایک ایسا عمل ہے جس میں کسی شخص کو ذہنی یا جذباتی طور پر کنٹرول کرنے، دھوکا دینے یا اس کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں متاثرہ شخص کو خوف، شرمندگی، عدم تحفظ کے احساسات میں مبتلا کر کے اس پر قابو پایا جاتا ہے۔ نفسیاتی استحصال مختلف طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ یہاں چند عام صورتیں بیان کی گئی ہیں:

گیس لائٹنگ (Gaslighting) :اس میں استحصال کرنے والا فرد دوسرے شخص کو بار بار جھوٹ بول کر یا اس کے تجربات کو رد کر کے اس کی حقیقت کی سمجھ کو مسخ کرنے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ وہ خود پر شک کرنے لگے اور اپنی ذہنی صحت پر اعتماد کھو بیٹھے۔

جذباتی دباؤ (Emotional Manipulation) :متاثرہ شخص کو قصوروار ٹھہرا کر یا اس کے جذبات سے کھیل کر اس سے اپنی مرضی کے مطابق کام کروانا۔

کنٹرولنگ رویہ (Controlling Behavior) :متاثرہ شخص کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں پر استحصالی فرد دوسرے کی زندگی کے مختلف پہلوؤں جیسے زندگی کے اہم معاملات میں دخل دینا، دوستی، فیصلوں یا آزادی پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دھونس اور خوف زدہ کرنا (Bullying and Intimidation)

دھمکی آمیز رویہ اپنا کر زبانی، جسمانی یا جذباتی دھمکیاں دینا تاکہ متاثرہ شخص خوفزدہ ہو کر اپنی مرضی چھوڑ دے۔ یہ عمل جذباتی اور ذہنی صحت پر گہرے اثرات مرتب کر سکتا ہے، جس سے خود اعتمادی، خوشی اور

خودی کا احساس کمزور ہو سکتا ہے۔ یہ استحصالی عمل میں استعمال ہونے والا براہ راست طریقہ ہے جس میں دوسروں کو دھونس، دھمکیوں یا خوف کے ذریعے دبایا جاتا ہے، تاکہ ان کے رویے پر کنٹرول حاصل کیا جا سکے۔

تنقید اور تضحیک (Criticism and Humiliation) : مسلسل تنقید کرنا، تضحیک یا مذاق اڑانا بھی نفسیاتی استحصال کی ایک شکل ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ متاثرہ شخص کی خود اعتمادی کم ہو جائے اور وہ اپنی صلاحیتوں پر شک کرے۔ اور خود کو بے وقعت محسوس کرے۔

خاموش سلوک:(Silent Treatment)

اس میں استحصالی شخص دوسرے فرد کو بات چیت میں شامل نہیں کرتا، اسے نظر انداز کرتا ہے تاکہ وہ پریشانی اور اضطراب میں مبتلا ہو جائے۔

جذباتی دستبرداری:(Emotional Withdrawal)

استحصالی قوت، فرد کو محبت، توجہ یا جذباتی سہارا دینے سے خود کو پیچھے کر لیتا ہے تاکہ اسے تکلیف پہنچائے یا اسے کنٹرول کرے۔

قصوروار ٹھہرانا:(Blame Shifting)

استحصالی شخص اپنی غلطیوں یا مسائل کا ذمہ دار دوسرے کو ٹھہراتا ہے، چاہے قصور اس کا نہ ہو، اور اسے مسلسل احساسِ جرم میں مبتلا رکھتا ہے۔

ذاتی حدوں کی خلاف ورزی:(Boundary Violations)

استحصالی شخص دوسرے کی ذاتی حدوں کو نظر انداز کرتا ہے اور اس کی زندگی میں ضرورت سے زیادہ مداخلت کرتا ہے، جیسے اس کی ذاتی معلومات کا غلط استعمال۔

یہ مختلف صورتیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ نفسیاتی استحصال کس قدر مختلف اور پیچیدہ عمل ہوتا ہے اور یہ انسان کی ذہنی و جذباتی صحت پر گہرے اثرات ڈال سکتا ہے۔ نفسیاتی استحصال کا شکار شخص ذہنی دباؤ، اضطراب (anxiety)، ڈپریشن اور خود اعتمادی کی کمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ استحصال اکثر ایک طویل عرصے تک جاری رہتا ہے اور شخص کے ذہنی اور جذباتی حالات پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔

انسان کا نفسیاتی سطح پر استحصال ایک گھناؤنا اور کریہہ فعل بن کر سامنے آتا ہے۔ کریہہ اس لیے کیونکہ استحصال کرنے والا فرد اس قدر زیرک و چالاک ہوتا ہے اور اپنے ظلم کا جال اس تکنیک کے ساتھ بچھاتا ہے کہ بعض اوقات شکار ہونے والا فرد اس کی پہچان کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ بے بسی و لاچارگی کی ایسی صورتحال نفسیاتی زیادتی کرنے والا کا حوصلہ بڑھا دیتی ہے۔ کیونکہ مظلوم ظالم کو دوست سمجھنے لگتا ہے۔ اور اس کی زیادتی کے بدلے وکالت کرتا ہے۔ جس سے اس کے ظلم کا دائرہ کار وسعت اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ استحصال کی صورت ملنے والی تکلیف کا اس طرح عادی ہو جاتا ہے کہ تکلیف اسے لذت دینے لگتی ہے۔ اور لذت کی یہ کیفیت سوچ کے نظام میں بگاڑ پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ نتیجتاً وہ ایک نارمل انسان نہیں رہتا۔

سائیکولوجیکل ابیوز، جذباتی و نفسیاتی استحصال کے پس پردہ ایسا گھناؤنا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ جس کے اثرات ظاہری طور پر دکھائی نہیں دیتے۔ کیونکہ اس ظالمانہ کیفیت کا نہ تو کوئی نشان نظر آتا ہے اور نہ ہی اس کی نشاندہی ممکن ہو پاتی ہے۔ ایسے افراد جو بچپن میں کسی ظلم و جبر، احساس کمتری یا پھر جذباتی استحصال کا شکار رہے ہوں۔ جس کی بدولت ان کی ذات میں ایک غیر متوازن خلا آ جائے جس کو ختم کرنے کے لیے وہ دوسروں کا نفسیاتی استحصال کرنا بہتر سمجھتے ہیں۔

اس مکروہ فعل کی بھینٹ چڑھنے والا انسان بے بسی کی ایسی مورت بنا دکھائی دیتا ہے جسے زندگی کی کسی نوعیت کی دلنشینی اپنی جانب متوجہ نہیں کر پاتی۔ آبروریزی اور گھٹن کی شدت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ سانس لینا دشوار لگتا ہے۔ یہاں تک کہ مرنے کا تمنائی ہونے لگتا ہے۔ بے اختیار موت کی خواہش شدت کے ساتھ سر اٹھاتی ہے۔ مگر ایسے بے بس و لاچار فرد کے لیے موت بھی ممکن نہیں ہو پاتی۔ گویا مرنا چاہے تو مر بھی نہ پائے اور جینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

نفسیاتی استحصال کے شکار ہونے والے شخص کا ادراک کمزور ہو جاتا ہے۔ عمومی زندگی میں تشدد یا زیادتی کی جتنی بھی تواریخ ہمارے سامنے آتی ہیں، ان کو محض جسمانی و جنسی حد تک ہی محدود رکھا جاتا رہا۔ اس کے برعکس نفسیاتی استحصال کے نتائج پر بہت کم مباحث ہوئے۔ شماریاتی اعداد پر غور کیا جائے تو اس قسم کی زیادتی نفسیاتی کی نسبت کم دکھائی دیتا ہے۔ نفسیاتی استحصال زیادہ تر شمار میں اس لیے نہیں آتا کیونکہ اس کے گھاؤ انسانی ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔ اور ذہنی ادراک حاصل کرنے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ب۔ نفسیاتی استحصال اور پاکستانی اردو ناول

ادب کا تعلق انسانی زندگی کے ہر گوشے سے ہے۔ جس میں جذبات و احساسات کے علاوہ تجربات و مشاہدات کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ لھذا یہ کہنا بجا طور پر درست ہے کہ ادب کا انسان کے شعوری اور غیر شعوری عمل سے ربط پایا جاتا ہے۔ جس میں داخلی و خارجی خیالات کو فن کے پیکر میں ڈھال کر پیش کیا جاتا ہے۔ ادب میں جہاں سماجی، سیاسی اور تہذیبی قدروں کو بیان کیا جاتا رہا ہے وہیں انسانی شخصیت کے عمیق پہلوؤں کی عقدہ کشائی بھی بخوبی انداز میں کی گئی۔

ادب نے نہ صرف سماج میں ہونے والی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کیا بلکہ ممکنہ حد تک ہر دور کی تہذیب و تاریخ کو بھی زندہ رکھا۔ گزرتے وقت اور انسانی تقاضوں نے ادب کی وسعت میں اضافہ کیا اور جدید ادب نے سماج کے ساتھ ساتھ انسان کو زیادہ اہمیت دینا شروع کر دی۔ کیونکہ مشاہدات نے اس بات کو واضح کر دیا تھا کہ سماجی ترقی کا انحصار افراد پر ہوتا ہے۔ لہذا سماج کو بہتر بنیادوں پر چلانے کے لیے افراد کی حالت کو بہتر طور پر جاننا ناگزیر ہے۔ اور یہ سب ادب کے ذریعے بخوبی ممکن ہوا۔ انسانی فطرت اور ذہنی کشمکش کی جھلک قریباً ہر دور کے ادب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ کیونکہ بطور علم، نفسیات بہت بعد میں متعارف ہوا۔ مگر مسائل کا عکس انسانی زندگی کے ساتھ ہی دنیائے انسانی پر پڑتا دکھائی دیتا ہے۔ نفسیات کا تعلق انسانی کردار اور ذہنی کیفیات سے ہوتا ہے اور انسانی زندگی کا عکاس ہونے کی وجہ سے ادب کی قریباً ہر ایک صنف میں نفسیاتی عوامل کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ ادیب معاشرتی سطح پر حساس طبقے کا نمائندہ گردانا جاتا ہے۔ اس لیے عام انسان کی نسبت زندگی کے نشیب و فراز کو زیادہ عمدگی کے ساتھ صفحہ قرطاس پر بکھیرنے کا ہنر رکھتا ہے۔

سائنسی و صنعتی انقلابات نے انسان کے اندر خلا پیدا کر دیا۔ جس نے اس کے مادی اور روحانی وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ اگرچہ ادبی تاریخ میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر سامنے آنے والے ادب نے انسان کو اس خلا سے باہر نکالنے کی بھرپور کوشش کی۔ مگر نفسیاتی حوالے سے یہاں بھی ایک پہلو تشنہ رہا کہ ترقی پسند ادب میں بھی فرد کی بجائے سماج کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ حالانکہ سوچا جاتا تو نتائج بڑے واضح ہو کر سامنے آتے ہیں کہ سماجی ترقی کی بنیاد وہاں کے لوگ ہوتے ہیں۔ اور افراد کو ثانوی درجہ دے کر سماج کو اولیت مہیا کر کے حالت بہتر کی

بجائے بد تر ہوتی چلی جاتی ہے۔لہذا بہتر یہی سمجھا گیا کہ ادب میں انسانی فطرت کی عقدہ کشائی کو مرکز بناتے ہوئے ایسا ادب لکھا گیا جو انسانی شعور کی عکاسی کے ساتھ ساتھ سماجی حقائق کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔

ولیم جیمس نے اصول نفسیات لکھ کر علم نفسیات کی بنیاد ڈالی جس کو فرائیڈ نے آگے بڑھایا اور تحلیل نفسی کا نظریہ پیش کیا۔ جس کا مطلب ذہن میں چھپی ہوئی باتوں کا پتہ لگانا ہے۔ ابتدائی دور میں تحلیل نفس ایک طریقہ علاج کے طور پر مانا جانے والا نظریہ تھا لیکن بعد میں اس کا استعمال جدید ادب میں بھی کیا جانے لگا۔ "ماہر نفسیات کا یہ قابل تحسین شوق اور جوش اس کی لامتناہی رجائیت کی وجہ سے تھا۔اسے معلوم تھا کہ نفسیات انسانی زندگی اور ادب میں تبدیلی لانے جارہی ہے"۔ (۲)

ادیب نے ان دبی ہوئی خواہشوں کو فن کے پیکر میں ڈھال کر پیش کیا جو پوری نہ ہونے کی بنا پر اس کے لاشعور کا حصہ بن جاتی ہیں اور ظاہر ہونے کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ کیونکہ فرائیڈ کے نزدیک انسان جبلتوں اور خواہشوں کا مجموعہ ہے۔ اس نے جنسی جبلت (جو انسان میں بچپن ہی سے موجود ہوتی ہے) پر سب سے زیادہ زور دیا۔ جنسی جبلت کا دائرہ فرائیڈ کے ہاں وسیع ہو کر سامنے آتا ہے۔ لبیڈو یعنی جنسی قوت میں ذہنی انتشار بھی شامل ہوتا ہے۔

فرائیڈ کا بنیادی نظریہ تحلیل نفس ہے جس نے فنکار کے تخیلی عمل کی تشریح اس طرح کی کہ خواب ہماری ان خواہشوں کا اظہار ہوتے ہیں۔ جن کو ہم عملی زندگی میں پورا نہیں کر سکتے لیکن خوابوں میں ان کا اظہار اشاروں کنایوں میں ہوتا ہے۔ فرائیڈ کے مطابق خواب تین قسم کے ہوتے ہیں۔ تمنائی خواب (Wisher dream) پریشانی کے خواب (Anxiety dream) اور تعزیری خواب (Punishment dream) انسانی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل پریشانی کے خواب کا حصہ ہوتی ہے۔ادب میں بھی ایسے خواب نظر آتے ہیں۔ فرائیڈ کے نزدیک شاعر بیداری کی حالت میں خواب دیکھتا ہے۔ وہ اپنے موضوع کا غلام ہونے کی بجائے اس پر حاوی ہو کر اپنے خوابوں کا رشتہ حقیقت سے جوڑ کر پیش کرتا ہے۔ فرائیڈ کے ان تصورات کے زیر اثر ادب میں دو طرح کے رجحانات سامنے آئے۔

اول فکری اور دوسرا تکنیکی نوعیت کا رجحان۔ فکری نوعیت میں جنسی اور وجود کے کے ابہام پر مبنی رجحانات نے فروغ پایا۔ ان میں طفلی حسیت، ایڈیپس کامپلیکس، تلاش پدر، خواب اور علامات خواب کا استعمال،

عہد طفلی کی طرف مراجعت وغیرہ شامل ہیں۔ تکنیکی نوعیت میں آزاد تلازمہ خیال، شعور کی رو، داخلی خود کلامی، علامت نگاری، تجریدیت، سررئیلزم وغیرہ کو اہمیت حاصل ہوئی۔ جس نے فن کے مواد اور ہیت پر گہرا اثر ڈالا۔

ادب میں تحلیل نفس کے ذریعے شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال شروع ہوا۔ اس کے تحت تحریروں میں الفاظ کی بجائے تفسیر کو سمجھنا ضروری ہو گیا۔ اس کا آغاز انگلستان سے ہوا۔ جب پہلی جنگ عظیم کے بعد انسان کے اندر تنہائی کا احساس، ذاتی زندگی کا المیہ، تشدد کا جذبہ انتہا کو پہنچ چکا تو زندگی کے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کے لیے شعور کی رو کا سہارا لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کہانی سے پلاٹ کا خاتمہ ہو گیا۔ کیونکہ حالات کا تقاضا یہ تھا کہ ادیب انسان کو خیر اور شر کے مجسمے سے آزاد کر کے نفسیاتی گرہوں کے مجموعے کے طور پر پیش کرے۔ انسان بیک وقت بزدل، بہادر، خوش اخلاق، اور بد معاش وغیرہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس تکنیک کے ذریعے کم سے کم وقت میں فرد کی داخلی و خارجی زندگی، اس کے شعور، تحت الشعور اور لاشعور کی مکمل تصویر قاری کے سامنے لانے کی کوشش کی گئی۔

شعور کی رو کا باقاعدہ استعمال انگریزی میں جیمس جوائس نے اپنے ناول یولیسس (Ulysses) میں کیا۔ فرانسیسی ناول نگاروں میں مارسل پراؤست، ورجینا وولف نے اسے مقبول بنایا۔ اردو ادب میں سجاد ظہیر، قراۃ العین حیدر کے یہاں اس تکنیک کے کامیاب تجربے ملتے ہیں۔

اردو ناول کی تاریخ میں جھانکا جائے تو موضوعات کے حوالے سے اس میں متنوع رجحانات سامنے آتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ راشد الخیری کے بعد اردو ناول میں بڑا نام مرزا ہادی رسوا کا آتا ہے۔ نذیر احمد نے اصلاحی اور مقصدی ناول لکھ کر جہاں معاشرے کی حالت سنوارنے کی سعی کی وہیں مرزا ہادی رسوا نے امراؤ جان ادا جیسا اثر انگیز ناول لکھ کر اردو ناولوں کی تاریخ میں نفسیاتی ناولوں کا آغاز کیا۔ اس ناول سے قبل بھی مرزا ہادی رسوا علم النفس کے نام سے ایک جریدہ نکال چکے تھے۔

"اندھیرا خواب" حجاب علی کا ایسا ناول ہے جس میں ماں باپ کے جھگڑے میں نفسیاتی الجھنوں کا شکار بیٹی بنتی ہے۔ مرد اپنی حاکمیت میں بیوی کی مار دھاڑ کر کے خود تو مردانگی کی تسکین پالیتا ہے۔ مگر وہ بھول جاتا ہے کہ اس کی شخصیت کا عکس بیٹی کو نفسیاتی مریضہ بنا رہا ہے۔ پانچ وقت کا نمازی سر پر ٹوپی ہاتھ میں تسبیح والے شریف انسان کا دوسرا روپ اس قدر بھیانک اور شرمناک تھا کہ بیٹی ایسے روپ سے خائف ہو کر شرابی

وجواری پر بھروسہ کرنا سیکھ گئی۔ نتیجتاً ساری عمر خوف اور عدم تحفظ کا شکار ہو کر سماج میں کوئی خاص مقام حاصل نہیں کر پاتی۔

ٹیڑھی لکیر" بہن بھائیوں کے رحم و کرم پر پلنے والی لڑکی کی کہانی ہے۔ رشتوں کے حوالے سے استحصال کی شکار یہ لڑکی بالآخر نفسیاتی مریضہ بن کر سامنے آتی ہے۔ اور عدم توجہی کا بدلہ ہر کسی کو تنگ کر کے لیتی ہے۔ "علی پور کا ایلی" نفسیاتی مسائل کے حوالے سے اہم ناول ہے۔ کہا جاتا ہے مرد اپنی پہلی محبت کبھی" نہیں بھولتا۔ اس سے بڑھ کر عورت کے ساتھ برا کیا ہو گا۔ کہ بیوی کو معشوقہ کے نام سے پکارا جائے۔ ماضی کے تلخ حقائق جب بار بار اپنا عکس دکھائیں تو مستقبل کی راہیں خود بخود متعین ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ ایسی راہیں ہوتی ہیں جن میں صرف اور صرف انتقام کی آگ ہوتی ہے

i. ۱۱/۹۔ تہذیبی تفاوت میں شناخت کا انہدام اور نفسیاتی استحصال:

بیسویں صدی کی آخری دہائی جبکہ انسان سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں قدم رکھ کر اپنے آپ کو ترقی کی راہوں پر گامزن کر کے مطمئن دکھائی دیا جانے لگا۔ ایسی صورتحال میں یہ تصور عام ہونے لگا کہ اب مزید کوئی جنگ انسانی تاریخ کا حصہ نہ بن سکے گی۔ اور سرد جنگوں کے خاتمے پر شاید اب دنیا امن و امان کا گہوارہ بن جائے گی۔ خونی جنگوں اور انقلابات کا دور مزید انسانی تاریخ کا حصہ نہ رہے گا۔ انسان کی تمام تر کوششوں کا محور و مرکز معاشی حالات کی درستی اور ترقی ہو گی۔ مگر گزرتے وقت نے اس خیال کو حقیقت کا جامہ نہ پہننے دیا اور دیگر آفات کے ساتھ ساتھ نائن الیون کا واقعہ انسانی زندگی کی بدترین آفت بن کر سامنے آیا۔ گزرتے وقت نے جو تاریخ لکھی اور فیصلہ سنایا وہ سب قیاس آرائیوں کو غلط ثابت کر گیا۔ حقائق تصورات کے برخلاف سامنے آئے۔

معاشی و معاشرتی مساوات اور آزادی اس دنیا کے مکینوں کا مقدر نہ بن سکی۔ اب کی بار استحصال ایک نئے رنگ ڈھنگ سے انسانی تاریخ میں جلوہ گر ہوا۔ اب کی بار ہونے والی جنگوں کی بنیاد انسانی جانوں کے ساتھ ساتھ مذہبی فرقہ واریت اور تہذیبی تفاوت پر تھی۔ جنگیں تہذیبوں کو بنیاد بنا کر لڑی جا رہی تھیں۔ ان جنگوں کے خطرناک نتائج سے چند ممالک محفوظ رہ پائے یہ ایسے ممالک تھے جو قدرے بڑی تہذیبوں کے نمائندے قرار پائے تھے۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کا سانحہ ایسی تمام جنگوں کے لیے مربوط کڑی دکھائی دے رہا تھا۔ اس سانحے کے وقوع پذیر ہونے سے انسانی تاریخ کے دھارے کو نئی سمت ملی۔ زندگی کے سبھی شعبہ ہائے اس واقعہ کے

بعد متاثر دکھائی دینے لگے۔ بیان بازی اور نعرہ بازی کا ایسا بازار گرم ہوا جس کی تپش انسانی زندگی کو اندرون خانہ تک جھلسا گئی۔ "وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھ پر یہ حقیقت افشا ہو گئی کہ دراصل یہ ایک بے بنیاد اور خطرناک جنگ کے لیے راستہ ہموار کرنے کی سازش ہے"۔(۳)

اس واقعے کے پس پردہ چونکہ نئے عالمی نظام کا قیام عمل میں لایا جانا تھا۔ اور نئے عالمی نظام کے قیام کے لیے انسانی ذہنوں میں کشمکش کا پیدا کرنا ضروری امر قرار پایا۔ ان سب افعال و اعمال کا مقصد عزائم کو چھپا کر بے رحمی کے ساتھ اپنے انداز فکر کو عوام کے اذہان میں منتقل کر کے انھیں اپنا دست نگر بنانا تھا۔

عالمی سطح پر ظہور پذیر ہونے والی جنگوں اور انقلابات و سازشوں نے بارہا انسانی زندگیوں کو متاثر کیا۔ کئی طرح کے منفی ذہنی رویے تشکیل پائے جنھوں نے انسان کا بھرپور نفسیاتی استحصال کیا۔ نائن الیون کے بعد جبر و استحصال کا ایک نہ ختم ہونے والا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ جس نے انسانوں کو زندہ درگور کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ نائن الیون کے بعد سامنے آنے والی صورتحال امریکیوں اور پاکستانیوں کے لیے ایک پیچیدہ مسئلہ بن کر سامنے آئی۔ انسانی تعلقات پیچیدگیوں کا شکار ہوئے۔ دونوں ثقافتوں کے مابین حائل ہونے والی حد فاصل نے انسانی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ نفسیاتی فاصلوں کا انسانی مقدر بننا ناول " ساسا" میں شیراز دستی نے بخوبی دکھایا ہے۔ سادہ انداز تحریر، محبت کا متلاشی، محبت کو استعارہ بنا کر انسانی زندگیوں سے نفرتوں کو مٹانے کا متمنی دکھائی دیتا ہے۔

کامیاب اور ترقی یافتہ ثقافت میں ایک پرندے کی موت پر آہ و زاری کرنے والے کے لیے سوونیئر بنوایا جاتا ہے۔ اور اس سوونیئر پر "The most kind hearted man of the world" تحریر کروایا جاتا ہے۔ وجہ کیا تھی؟ کیا وہ واقعی اتنا مہربان انسان تھا؟ کیا اس کا دل و دماغ اس خطاب کو پالینے کے بعد مطمئن تھا؟ پرندے کی موت کے بعد اسے دفناتے ہوئے وہیں قبر پر بے ہوش ہو جانے والا یہ انسان کبھی نرم دل واقع نہیں ہوا تھا۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ دھماکوں کی دھول میں اٹھتے کڑیل جوانوں کے جنازے اور کشت و خون کے گرم بازار دیکھے تھے مگر کبھی رکا نہیں تھا، طمانیت سے آگے بڑھ جاتا، اس کا شعور خودکش دھماکوں، سرد جنگوں اور کروز میزائلوں سے بے نیاز رہا۔

ہمیشہ اپنی دھن میں مگن محبت کا کھوجی، ایسا کھوجی جسے ابتدائی دور تعلیم میں استاد کی جانب سے ایک سوال سونپا گیا تھا کہ محبت کیا ہے؟ اور اسی محبت کی تلاش نے اسے امریکہ جیسی کامیاب ثقافت کا حصہ بننے پر مجبور کیا۔ یہاں آکر یہ "The most kind hearted man of the world" بن گیا۔ جبکہ اپنی بستی میں انتہا کا بے حس سمجھا جاتا تھا۔ انسان کی موت اسے کبھی نہ رلا پائی تو پرندے کی موت پر یہ آہ وزاری کیسی؟ اس سوونیئر کا حقدار وہ کیسے قرار پا سکتا تھا؟ درحقیقت ساسا کو دفناتے وقت اس تفاوت نے اسے رلایا تھا۔ دو دنیاؤں کا بھیانک فرق اس کے دل و دماغ کو سلگا گیا تھا۔ اس کے شعور کی الجھی گتھیاں سلجھ گئی تھیں۔ وہ سادہ کے نام کی صدا لگائے زار و قطار رونے لگا۔ اس لمحے اسے اپنے ملک کے بچے یاد آنے لگے۔

> "میں نے اک ننھی سی قبر کھودی اور اس میں اپنے ہاتھوں سے ساسا کو اتار دیا۔ اسے لٹا کر قریب پڑی مٹی کی ڈھیری (جسے میڈی گرم کر کے لائی تھی) کی طرف بڑھا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے ساسا پر ڈالنے لگا۔
>
> اسی لمحے میں میرے منہ سے ایک نام نکلا۔ "سادہ!!" اس نام کی صدا لگاتے ہی میں باک مار کر رونے لگا۔ مجھے میرے ملک کے بچے یاد آئے"۔ (۴)

آج پرندے کی موت پہ اسے بچوں کی موت سے وابستہ وہ خبریں یاد آنے لگیں جو گذشتہ کتنے عرصے سے سن کر بے حس بنا گھوم رہا تھا۔

آج سے قبل اس کا دل پتھر کی سل بنا ہوا تھا۔ جذبات سے مکمل طور پر عاری۔ مگر آج جبکہ جینی نے ساسا کو دفنانے کے لیے یونیورسٹی سے باقاعدہ چھٹی کرنے کی بات کی تو اس کا ذہن ماضی کے ان واقعات میں الجھ کر رہ گیا۔ سادہ کے ساتھ وہ ننھی قبریں جن میں لاشوں کی جگہ ماؤں کے خواب دفن ہو رہے تھے۔ ان ننھی جانوں کی جگہ ماؤں کی گود تھی گور نہ تھی۔

محبت کا متلاشی ترقی یافتہ تہذیب میں رہنے کے باوجود اپنی سوچ کو اپنے ماحول سے لمحہ بھر کے لیے بھی جدا نہ کر سکا۔ گم ہوتی شناخت اور انسانیت کا دکھ اس کی سوچ پر اس قدر واضح دکھائی دے رہا تھا کہ اسے شک کی نگاہ سے دیکھ کر لاتعلق ہو جانے لگا۔

"ساسا" در حقیقت نائن الیون کے بعد در پیش آنے والے بین الا قوامی مسائل کی نشاندہی کرتا ہے۔ خاص طور پر امریکہ میں رہائش پذیر پاکستانیوں کا اس وقت بھرپور نفسیاتی استحصال کیا گیا جب محض شک کی بنا پر اسامہ بن لادن کے کوئٹہ سے دستیابی کی خبریں گردش کرنے لگیں۔ تو سلیم (ناول کا مرکزی کردار) پاکستانی ہونے کی بنا پر سبھی امریکی رہائش پذیر لوگوں کی نگاہوں میں چبھنے لگا۔ میڈی جس سے سلیم کا تعلق مسافرت کا تھا دونوں ہی غریب ملک کی شہریت رکھتے تھے۔ محض گردش کرتی خبروں پر ایمان لا کر اس سے ترک تعلق کرنے پر آمادہ ہو چکی تھی:

> "۔۔۔کچن سے میڈی بھاگ کر آئی اور مجھ پر چلاتے ہوئے کہا میں اس کی غضب ناکی کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ وہ میرے پاس آئی اور اپنے ہاتھوں کو میری طرف اچھال اچھال کر کہا: "بن لادن ان یور کنٹری، پاکستان، نان ایفگانستان" میڈی کا کتاٹونی بھی مجھ پر بھونکنے لگا"۔ (۵)

اپنے ہی جیسے غریب ملک کی شہریت رکھنے والی فلپائنی بھی اس سے ترک تعلق کیے کھڑی تھی۔ حقائق کو جانے بغیر اسے ذہنی اذیت دی جا رہی تھی۔ اس بولڈ شہر کے مکینوں میں آج وہ اس قدر تنہا اور اجنبی تھا کہ تنہائی اس سے اس کی سانس نوچنے لگی تھی۔ بنا ثبوت و دلائل کے ہاسٹل کے قریباً سبھی لوگ اس سے ترک تعلق کیے رہے۔ گھما پھرا کر، بہتر لہجے میں اور محتاط انداز اپنا کر کئی طرح کے سوالات کر کے وقتاً فوقتاً اسے ذہنی اذیت پہنچائی جا رہی تھی۔ نفسیاتی جبر اس وقت انتہا کو پہنچتا جب وہ بھری محفل میں بھی خود کو تنہا دیکھتا ہے۔

نائن الیون کے بعد امریکہ کا ماحول بہت سخت ہو چلا تھا خاص کر ہندوستان کے خطے سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے عجیب بے یقینی کی فضا چل رہی تھی۔ مراد (مشمولہ طاؤس فقط رنگ) ایشیائی نژاد ہونے کی بنا پر امریکہ کی فضا کے لیے موزوں نہیں رہا تھا۔ اس کی ایشیائی رنگت امریکہ کی پیدائش ہونے کے باوجود امریکی نہیں بننے دیتی۔ مقامی ہونے کی کوشش کرتا تو لوگ اسے شک کی بنا پر مارنے سے گریز نہ کرتے تھے ۔اس کی شخصیت والدین کی علیحدگی کی بنا پر پہلے ہی احساس کمتری کا شکار تھی۔ اس کی ذات میں فیصلہ کرنے کی قوت بالکل نہیں تھی۔ والد کے بعد بیوی پر انحصار کرنے لگا تھا۔ باروزگار ہونے کے باوجود بااختیار نہیں ہو پا رہا

تھا۔ مزید رہی سہی کسر نائن الیون کے واقعے نے پوری کر دی۔ یہ واقعہ جونہی پیش آیا اس کے فورا بعد ہی ایسے لوگ جو گندمی رنگ کے تھے ان سے امریکی نسل کے لوگ شدید نفرت کرنے لگے اور انھیں عتاب کا نشانہ بنایا گیا۔

بانو قدسیہ کا ناول " حاصل گھاٹ " موضوعاتی سطح پر جہاں معاشرتی اقدار کی پامالی کی بھرپور داستان ہے وہیں انسانی مادی وسائل کی تکمیل کے لیے ہجرت کے نتیجے میں سامنے آنے والے انسانی نفسیاتی استحصال کی طویل تاریخ بھی پیش کرتا ہے۔

ہجرت جس کا ایک سرا ارتقا سے جڑا ہوتا ہے تو دوسرا انا آسودگی سے وابستہ دکھائی دیتا ہے۔ آدم و حوا کے جنت سے نکالے جانے کے بعد جنت سے جدائی نے ان کی روح کو گھائل کر دیا۔ جدائی اور تنہائی کے کرب انگیز تجربے سے ان کا نفسیاتی استحصال ہوا۔

حاصل گھاٹ موضوعاتی سطح پر نفسیاتی استحصال کی جس نوعیت کو سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے وہ یہ کہ انسان فطری طور پر اپنی آبائی جنت میں رہنے کا خواہش مند ہے۔ لیکن ارتقا کا بیج بو کر ترقی کا خواہش مند بھی سدا سے ہے۔ ارتقا کے ننھے بیج کو تناور درخت بنانے کے لیے اسے کئی نفسیاتی مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اور اپنے مسائل کو سینے سے لگائے وہ جدائی اور تنہائی کے کرب انگیز تجربے سے گزرتا ہوا ہجرت کی ٹھان لیتا ہے۔

ناول کی کہانی واحد متکلم کی یادداشتوں سے تشکیل پاتی ہوئی تکمیل کے مراحل طے کرتی ہے۔ ہمایوں نامی کردار جس کی بیوی مر چکی ہے۔ بیوی کے بعد اس کی کل کائنات دو بچے، اپنی مادی حالت سدھارنے کے لیے ملک کو خیر باد کہہ کر امریکہ کی سکونت اختیار کر چکے ہیں۔ ہمایوں اپنی بیٹی ارجمند کے بلاوے پر امریکہ کا سفر اپناتا ہے۔ امریکہ کا ترقی یافتہ معاشرہ اس کے اندر طرح طرح کے سوال پیدا کرتا ہے۔ جس کے جوابات تلاش کرتے ہوئے اسے اپنے وجود کی شناخت سے متعلقہ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ہمایوں کے خاندان نے سب سے پہلی ہجرت خوشیوں اور خواہشوں کی منزل پانے کے لیے پاکستان کی جانب کی۔ مگر ہجرت کے اس سفر میں جسم کے ساتھ ساتھ روح کو لانا بھول گئے۔ منزل پر پہنچ کر خوشی کی وہ کیفیت کہیں گم سی ہو کر رہ گئی، وہ سرشاری بھول بھلیوں میں کھو گئی۔ اک خواب جو خوشیوں بھرا دیکھا تھا بس

خواب ہی رہا۔ وہ گھرانے جن پر ہر طرح کے فضل و کرم کا سایہ لہراتا تھا خود ساختہ شکوک و شبہات کی نذر ہو گئے۔ وہم و گمان نے زندگی میں عجب طرح کا زہر گھول کر رکھ دیا۔ ان لوگوں سے خائف رہنے لگے جو انھی کی طرح کے بے یار و مددگار تھے۔ اقتباس:

"ہم ہجرت کے ساتھ ہی یہ خوف ناک چیتے لے کر آئے تھے۔۔۔ ہم تو ان شہروں، گھروں، سڑکوں سے بھی ناواقف تھے جن کو ہمیں اپنانا تھا۔ ہر موڑ پر وہی چیتا لپکتا چلا آتا تھا۔

ان دیکھے کا خوف

ان جانے کا خوف

ان چکھے کا خوف

ان چاہے کا خوف"(۶)

ان دیکھی اور انجانے کی اسی کیفیت میں زندگی عجب طرح کے خوف میں مبتلا ہو کر گزرنے لگی۔ اقلیت کا اکثریت میں ضم ہو کر انجانے اور ان چاہے خوف سے چھٹکارا پانا بس خواب ہی رہا۔ دوسری ہجرت، ہمایوں بیٹی کے اسرار پر امریکہ کی جانب کرتا ہے تو اقلیت ہونے کی حیثیت سے وہاں بھی لا محالہ تبدیلی کا سامنا کرتا ہے۔ امریکہ میں اپنی شناخت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ "امریکہ حیرت کے دریا کا وہ ساحل ہے جہاں کھڑے ہو کر پہلی بار انسان اپنے اندر تبدیلی محسوس کرتا ہے اور اس کی اپنی شناخت متزلزل ہوتی ہے"۔(۷)

کمزور اقلیت ہونے کے ناطے اس کے پاس دکھانے اور منوانے کو جب کچھ نہ تھا تو اکثریت کے بہاؤ میں ریتلے ساحل کی طرح بہہ جانا ہی تھا۔ کیونکہ سڑکوں، بازاروں اور اشیا کی صورت میں اس کے سامنے قدم قدم پر حیرت کدے موجود تھے۔ اور یہ حیرت کدے اس کی شناخت گم کرنے کے لیے کافی تھے۔ گویا ترقی یافتہ معاشرے جہاں پسماندہ ممالک کے غریب عوام کو کندھا دیتے ہیں وہیں اپنی ترقی کی دوڑ میں انھیں گم کر کے ان کی شناخت کو سوالیہ نشان بنا دیتے ہیں۔

انسانی نفسیات چونکہ خارجی ماحول کی مرہون منت ہوتی ہے۔ اس لیے ہنگامی اور بحرانی حالات میں انسانی رویے بھی غیر تسلی بخش روپ دھار کر سامنے آتے ہیں۔ سماجی شکست و ریخت، فسادات اور جنگیں جہاں

انسان کا معاشرتی استحصال کرتے ہیں, وہیں انسانی شخصیت میں غیر معمولی تبدیلیاں پیدا کر کے اس کے نفسیاتی استحصال کا مؤجب بھی بنتے ہیں۔

ii. نفسیاتی عارضے اور انسان کا نفسیاتی استحصال:

"قربت مرگ میں محبت" خاص طور پر نفسیاتی مسائل کا عکاس ناول ہے۔ فلیش بیک کی طرز پر لکھا گیا ناول، ڈھلتی عمر کے شخص خاور کی زندگی کے واقعات کو بیان کرتا ہے۔ سفر کے دوران خیالات و واقعات کا سلسلہ شروع ہو کر کشتی میں ہی اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ خاور کے خیالات پر مبنی کہانی تمام جزوئیات کے ساتھ وقتاً فوقتاً قاری پر عیاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ عورت کی نفسیات کو بیان کرتے ہوئے، اس ناول میں انھی کے ہاتھوں استحصال کا شکار ہونے والا مرد خاور دکھایا گیا ہے۔

مردوں کی دنیا کا باسی، ایک ٹی وی شو مین (TV Show man) جس نے ٹی وی کے ساتھ وابستگی کے دوران محبت و چاہت کا کوئی وسوسہ کبھی نہیں پالا تھا۔ اسے نہ تو نوعمری میں اس شے کا کوئی تجربہ رہا اور نہ ہی خواہش۔ اس کے برعکس اس کے کئی ساتھی آگے بڑھتے، عزت نفس تیاگ کر سیٹیاں بجاتے، اکثر و بیشتر لڑکیوں کے کالجوں کے گرد منڈلاتے، یہاں تک کہ آہ وزاری سے اٹے دکھی شعروں کا سہارا لے کر خط لکھ ڈالتے۔ مگر ایک وہ انسان، ایسے تمام ماحول میں خود کو مکمل و مطمئن محسوس کرتا۔ ایک ہی عورت سے شادی کی اس سے وفا کر کے اپنے ہاتھوں مٹی کے حوالے کیا۔ خوبصورت و خوب سیرت شخصیت کا مالک خاور زندگی کے آخری ایام میں بھی بھرپور وجاہت رکھتا تھا۔ خوبصورت ایسا کہ ہر عمر کی عورت اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو سکتی تھی۔ مگر اس نے سوائے ایک کے کبھی کسی اور کو زندگی میں داخلے کی اجازت نہ دی تھی۔ مگر پھر اچانک تبدیلی کی ہوا چلی اور یہ باوفا مرد اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ لوگوں کی کہانیاں لکھنے والا یہ شخص بھول گیا تھا کہ اس کی اپنی کہانی میں آنے والے کردار ہر بار اسے بتا کر نہیں آئیں گے۔ ان کے داخل اور خارج کا وقت وہ خود مقرر کریں گے۔ خاص عورت کے حوالے سے دیکھا جائے اور وہ بھی ایسی عورت جو اسے اپنی جوانی سے پسند کرتی تھی۔

عورت کی نفسیات اور اس کے خود ساختہ فیصلوں کی نذر خاور کی زندگی ہوتی ہے۔ ناول کے تناظر میں دیکھا جائے تو بے نام حکمران اور مرشد کی مرید دونوں نے اپنی سی بھرپور کوشش کر کے خاور کا استحصال کیا۔ دونوں ہی خاور سے جوانی کے ایام میں ملنے کی خواہش مند تھیں اور موقع ملتے ہی اس پر اپنے اپنے راز افشا کر دیے۔ کسی کی ذات کو

خاطر میں نہ لانے والا اپنی ہی دھن میں مگن یہ انسان ان دو عورتوں کے بنے ہوئے جال میں پھنس کر اپنا استحصال کراتا چلا گیا۔

تاریخی شواہد کے مطابق عورت کا ذہن اور اس کے جذبات، علم نفسیات کا ایسا مسئلہ رہے ہیں جو کبھی مکمل طور پر حل نہیں ہو پائے۔ اس کی بے پناہ پرتوں کی تہوں سے ایک نیا انکشاف جنم لیتا ہے۔ جنم لینے والا یہ انکشاف مکمل نتائج دینے کی بجائے ایک نئے انکشاف کی گنجائش چھوڑ جاتا ہے۔

پچیس برس کی منصوبہ بندی کے بعد بالآخر ملنے میں کامیابی حاصل کر لینا اس کے لیے زندگی کی بڑی جیت تھی۔ بڑی مدت تک وہ اس خیال کو پس پشت ڈالتی آئی تھی۔ ساری زندگی خاور سے ملنے کا تصور اسے ٹین ایج کریش لگتا رہا کہ شاید اٹھتے طوفان کا غبار وقت کے ساتھ کہیں تھم جائے۔ مگر ایسا نہ ہوا بلکہ خود ساختہ محبت کا ننھا پودا پرورش پا کر تناور درخت ہو چکا تھا۔ وہ جڑوں میں اس قدر مضبوطی لا چکا تھا کہ اسے اکھاڑنا تو درکنار ہلانا بھی ممکن نہ رہا تھا۔ اٹھتے ابال کو روکنے کا یہی طریقہ سوجھا کہ ملاقات کے وقت کا تعین کر لیا جائے۔ اقتباس:

> "آج میرے تیسرے اور سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی تھی۔۔۔ مجھے ان تین گرہوں نے اب تک باندھ رکھا تھا۔۔۔ آج آخری گرہ بھی کھل گئی ہے۔۔۔ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔۔۔ بتاؤ کب؟[۸]

آج جبکہ وہ اپنے چھوٹے بیٹے کی دلہن لے کر لوٹی تو سب سے پہلے اس نے یہ کام کیا کہ خاور کو فون کر کے اپنا مدعا بیان کر ڈالا۔ وہ کوئی عام عورت نہ تھی۔ طرز تخاطب الجھاؤ کا شکار کیے دیتا تھا۔ لہجے میں ایک خاص قسم کا تہذیبی رچاؤ اس کے اعلیٰ خاندان ہونے کی دلیل تھا۔ بحیثیت ادیب و اداکار اس کی زندگی میں یہ پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔ کہ کوئی خاتون ملاقات کی متمنی تھی یا اظہار محبت کے لیے اپنے نفس کو مار کر آگے بڑھنے کی جسارت کر رہی تھی۔ خاور کے ماضی کی پرتیں کھولی جاتیں تو میڈیائی طلسم کے زیر اثر متعدد لوگ اس کی ذات سے متاثر تھے۔ آج کا ہر انسان اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ میڈیا کا جادوئی انداز راکھ کو بھی الاؤ کی شکل دے سکتا ہے۔ اور ایسے فریبی الاؤ کا شکار ہو کر کئی لوگ خاور سمیت دوسری شخصیات کو فون کرتے اور ملنے کا چاؤ بھی رکھتے تھے۔ مگر آج تک رابطہ کرنے والے افراد میں سے اس خاتون کا انداز مختلف تھا۔ حکمرانوں کی مانند۔ اس کی ذات کے تمام شب و روز سے واقف یہ خاتون اسے حیرت کے سمندر میں ڈبوئے جا رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بے اختیار اس سے ملاقات کرنے نکل پڑا۔ ملاقات ایک، دو، اور پھر کئی ملاقاتیں، جیسے زندگی کا معمول بنتی چلی گئیں۔

ان ملاقاتوں کے دوران خاور نے بارہا محسوس کیا کہ وہ کوئی ایسی جذباتی عورت نہ تھی۔ جو لفظوں کے ہیر پھیر اور ٹی سکرین پر نمودار ہونے والے دلفریب چہروں کے دھوکے میں آجاتی۔ بلکہ وہ کسی حد تک زندگی کے معاملات میں پُر عمل رسائی رکھتی تھی۔ اگر کہیں اختیار میں بے بس رہی تھی تو وہ خاور کی ذات اور اس سے متعلق معاملات تھے۔ کیونکہ اس نے خاور کے مقام و حیثیت کا تعین اپنی زندگی میں بہت بلند کر رکھا تھا۔ جہاں کوئی دلیل و جواز کارگر ثابت نہ ہو سکتا، وہ جگہ خاور کے لیے مختص تھی۔

"تم جانتے ہو میری سب سے بڑی خواہش کیا ہے، تمھیں ایک تاریک کوٹھڑی میں بند کر دوں اور اس کے تالے کی چابی میرے پرس میں ہو۔۔۔۔
اس کوٹھڑی کے اندر آنے کی۔۔۔ کچھ وقت بسر کرنے کی خواہش نہیں ہے؟
نہیں۔۔۔۔ کوئی خواہش نہیں ہے۔۔۔ صرف قفل کھولوں، کواڑ دھکیل کر تمھیں دیکھ لوں..... اور گھر لوٹ جاؤں..... جب جی چاہے۔"(۹)

عجب طرح کا نڈر اور چونکا دینے والا انداز۔ جوان جہان بیٹوں کی ماں، اور شوہر حیات ہونے کے بعد اگر معاشرتی تناظر میں اس کردار کو جانچا جاتا تو نتائج حیرت انگیز سامنے آتے ہیں۔ مرد جو مکمل طور پر بااختیا ہوتا ہے۔ ہر فیصلہ اس کے اشاروں پر ہو جایا کرتا ہے۔ اس خاتون کی ذہنی حالت کی بدولت وہ مکمل طور پر بے بس اور بے اختیار لگ رہا تھا۔ اپنا نام تک بتانا پسند نہ کیا اور خود اس کے حوالے سے تمام باتوں سے آگاہ تھی۔ نام یا شناخت کی پہچان وہ چھپا تو ہر گز نہ رہی تھی۔ کیونکہ وہ تو ان علاقوں میں بھی دیدہ دلیر ہو کر پھرتی تھی جہاں اس کے متعدد جاننے والے موجود ہوتے۔ شاید خود اس کے خیال میں اس کی شناخت و زندگی اس دن سے شروع ہوئے تھے جب سے اس نے من چاہے انسان سے ملاقات کی تھی۔

خاور کے لیے وہ خاتون اور اس کی حرکات و سکنات عجب حیرت کدہ تھے۔ ائیر پورٹ پر اس کے بیٹے کی خواہش پر جہاز میں اپنے پہلو میں بیٹھنے کی اجازت دینا پڑی۔ Pedophilia جیسے نفسیاتی عارضے کی شکار یہ خاتون دوران سفر خاور کے لیے کافی شرمندگی کا باعث بنی۔ اس مرض کا شکار عام طور پر مرد زیادہ سامنے آتے ہیں۔ مگر جدید دور میں خواتین بھی اس سے محفوظ دکھائی نہیں دیتیں۔ Pedophilia میں مرد یا عورت اپنے سے متضاد جنس کے ہاتھوں یا پیروں کو چھو کر حظ اٹھاتے ہیں۔ اقتباس:

"اس کا ننگا پاؤں آگے آیا اور اس کی جراب کو ٹٹولتا اسے اپنے انگوٹھے اور بڑھے ہوئے ناخنوں والی انگلیوں سے کھرچتا اس کے تلوے تک چلا گیا۔۔۔ جراب اتار دو۔۔۔ پلیز۔۔۔ خاور نے جھک کر ۔۔۔ جراب نیچے کی اور اتار دی۔۔۔ جیسے طوائف گاہک کے حکم پر کپڑے اتارتی ہے۔"(۱۰)

اس لمحے جبکہ بالکل ساتھ والی کرسی پر خاور کے دیرینہ دوست کی بیٹی اپنے معصوم بیٹے کے ساتھ موجود تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان حرکات سے واقف ہو رہی تھی۔ خاور کے لیے یہ لمحہ کسی قیامت سے کم ہر گز نہ تھا۔ وہ کسی سہمے ہوئے کبوتر کی مانند آنکھیں بند کیے حواس باختہ سائے کے زیر اثر تھا۔ بے بسی و شرمندگی کے بھرپور آثار اس کے چہرے سے عیاں تھے۔ اور اس شرمندگی سے چھٹکارہ پانا تبھی ممکن تھا جبکہ خاور اس سے ترک تعلق کر لیتا۔ ایک لمحے اس نے ایسا ہی کیا مگر وہ اس سے مکمل طور پر نجات حاصل نہ کر سکا۔

"آپ ایک ادھیڑ عمر کے مرد ہیں۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔۔۔ اگر ایک نوجوان لڑکی۔۔۔ آپ سے محبت کا اظہار کرتی ہے تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ آپ اس کے لائق نہیں اور آپ کو پیچھے ہٹ جانا چاہیے تھا۔۔۔ مجھے آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ نے اپنی عمر کو نہیں دیکھا۔۔۔"(۱۱)

اپنی غرض میں اس کا بھرپور استعمال کیا۔ عارضی پڑاؤ کے لیے اس کے دل و دماغ میں ایک خاص مدت تک بسیرا کرنے کے بعد تمام الزامات کا مرکز اس کی ذات کو ٹھہرا کر عابدہ سومرو اپنی زندگی میں خوش و مطمئن جیے چلی جا رہی تھی۔ سوچوں کا ایک جھکڑ اپنی تیز و تند ہواؤں کے ساتھ اس کے دماغ کا حصہ بنا ہوا تھا۔ ہر شے اتھل پتھل ہوئے چلی جا رہی تھی۔ بے چینی و جنوں رخصت ہو چکا تھا، ہر سو سکوت تھا، جیسے سب کچھ ٹھہر سا گیا ہو۔ عابدہ سومرو نے وقتی قیام کے لیے جگہ تلاش کی بھی تو خاور کی ذات کا انتخاب کیا۔ اس نے اسے استعمال کیا اور بھرپور طریقے سے۔ وہ اپنے احساس کمتری کو چھپانے کے لیے اس کا استعمال کرتی رہی اور وہ استعمال ہوتا چلا گیا۔ کاغذ پر قلم سے لفظوں کا کھیل کھیلنے کا وہ ماہر تو تھا۔ مگر انسانی جذبات کی تحقیر اس انداز میں آج تک اس کا قلم بیان نہیں کر پایا تھا۔ سب کچھ طے شدہ معاملات کے مطابق ہوتا گیا اور سزا بھی سنائی تو اسی کو۔ ابھی تک غلافی آنکھوں والی کے حصار سے باہر نہ آیا تھا کہ ایک اور گنجل میں پھنس گیا۔

عابدہ سومرو کا انداز گفتگو عجب سحر انگیز تھا۔ اور اسی سحر کے زیر اثر خاور کا استحصال ہوتا رہا۔ سب کچھ طے عابدہ سومرو کی جانب سے تھا مگر کٹہرے میں خاور کو لا کھڑا کیا گیا۔

"فون بند نہ کریں سائیں۔۔۔ بھری ہوئی بھراتی ہوئی اسی آواز نے سرگوشی کی" آپ ہمارا دل نہ توڑیں۔۔۔ بے رخی نہ برتیں۔۔۔ فقیر لوگوں کی صدا بھی سن لیا کریں۔۔۔ فون تو بند نہ کریں۔
میں۔۔۔ آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ اس نے زچ ہو کر کہا۔
"سائیں جو کرنا ہے ہم نے آپ کے لیے کرنا ہے، آپ کو پڑھتے ہیں، دیکھتے ہیں، سنتے ہیں۔۔۔ تو پسند کرتے ہیں۔۔۔ مرید ہیں آپ کے۔۔۔ مرشد نظر کرے تو ہمارے دن بھی پلٹ جائیں۔۔۔ بھاگ جاگ جائیں ہمارے۔[۱۲]

معروف شخصیت ہونے کے ناطے ایسی کئی کالیں اس کو آچکی تھیں، خاوند یا گھر والوں کی غیر موجودگی میں اکیلے وقت گزاری کے لیے تماشا کرنے والی اکثر خواتین و جوان لڑکیاں اسے کال کیا کرتی تھیں، مگر یہ ان سے قدرے مختلف تھی۔ انداز گفتگو سے کہیں بھی ایسا کوئی شائبہ نہ ہوتا تھا کہ یہ وقت گزاری کا عمل ہے۔ عابدہ سومرو کی گہری بھرائی ہوئی آواز میں بیان کردہ ایک ایک لفظ واضح تھا۔ وہ ایک کھلی کتاب کی مانند ورق ورق اس پر عیاں ہوتی چلی جارہی تھا۔ اپنی گفتگو میں مشکل الفاظ کا استعمال کرتی اور گفتگو کو پر تاثر بنانے کے ہر عمل میں ماہر تھی۔

ادیب ہونے کے ناطے لفظوں کا بیوپاری تو وہ بھی تھا۔ جالا بنتی مکڑی کو لفظوں کے زور سے پھنسا لیتا تھا۔ اگرچہ یہ سب اس کے لیے عام سی بات تھی کہ کوئی عورت اس سے ہمدردی حاصل کرنے کے لیے آنسوؤں کا سہارا لیتی یا گفتگو میں ثقیل الفاظ کا استعمال کر کے مہارت دکھانے کی کوشش کرتی ہو۔ مگر یہاں معاملہ تھوڑا زیادہ قابل غور تھا۔ اور اسی غور طلب معاملے کی تفہیم کے دوران خاور اصل تک نہ جا سکا اور استحصال کا شکار ہوتا چلا گیا۔ کیونکہ وہ جھوٹ کی کاریگری میں اس قدر ماہر تھی کہ بہت بڑا سچ بڑے آرام سے چھپا گئی۔ عابدہ سومرو دراصل ڈی موستھنس الجھن(Demosthenes complex) کا شکار تھی۔ انتہا درجہ کی احساس کمتری میں مبتلا انسان اپنی ذات کی ناکامیاں چھپانے کے لیے ایسی حرکات کرتا ہے جیسی عابدہ سومرو کرتی رہی۔ ڈی موستھنس الجھن(Demosthenes complex) ایسا نفسیاتی عارضہ ہوتا ہے جس میں مبتلا شخص کا مقصد خود پر دوسروں کی بھرپور توجہ دلوانا ہوتا ہے۔ اور ایسا ہی سب عابدہ سومرو نے بھی کیا۔ بڑی ماہرانہ چابکدستی کے ساتھ خود کو مظلوم اور زمانے کو ظالم بنا کر بیان کرتی۔ وہ احساس کمتری کا شکار خاتون عجب طرح کے واہموں کا شکار تھی۔ نفسیاتی عارضے کے زیر اثر وہ بڑی بڑی شخصیات کے نام بتاتی، ان سے ملاقاتوں کے تذکرے کرتی، لاتعداد بین الاقوامی اداروں کے تذکرے کرتی جہاں بقول اس کے وہ پڑھ چکی تھی جبکہ وہ ان اداروں کے نصاب سے بھی واقف نہ تھی۔ بڑی اور مہلک امراض کو خود حملہ آور بتاتی۔ بین الاقوامی سطح پر متعارف کرائے گئے کامیاب ڈاکٹروں کے نام اسے ازبر تھے۔

جن کا استعمال اپنی باتوں میں اکثر و بیشتر کرتی تھی۔ ٹی وی اسکرین پر دیکھے جانے والے خوبصورت مردوں کے عشق میں خودی سے مبتلا ہو کر ان کے بارے سوچنے لگتی تھی۔ اور انھی سوچوں میں خاور بھی در آیا تھا۔ خاور اس کی پہنچ میں تھا۔ اس لیے اس نے اپنی اداکاری سے اس کا بھرپور نفسیاتی استحصال کیا۔

مغربی معاشرے کی آزاد خیال اور پر کشش شخصیت کی مالک ڈیلائلہ عرف ڈی (مشمولہ: طاؤس فقط رنگ) احساس کمتری میں مبتلا ہے اور اسی کی بدولت دوسروں کا استحصال کرتی ہے۔ ڈی کی شخصیت میں بکھراؤ اور اُلجھاؤ کی کیفیات اس کے والدین کی بدولت تھیں۔ ڈیلائلہ کا والد ٹم جونز باغی شخصیت کا مالک تھا۔ اختلاف رائے کی بنا پر علیحدہ فرقہ قائم کر کے امریکی حکومت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرتا ہوا گیانا نامی جزیرہ میں پناہ گزین ہوا۔ امریکی حکومت نے اس کی سرکشی کو دبانے کے لیے جزیرے سے اسے قید کر لیا۔ ایسے میں ڈیلائلہ اپنے والد کے ساتھ والدہ سے بھی جدا ہو کر جولیا نامی خاتون کے ساتھ رہنے لگی۔ جولیا نے اس کو گود لیا تھا۔ جولیا نے ڈی کی پرورش میں اگرچہ کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی مگر ڈی کامیاب شخصیت ہونے کے باوجود احساسِ کمتری کا شکار تھی۔ ڈی مراد نامی شخص سے یکطرفہ محبت کا جذبہ پالتی ہے۔ اور ہر اس انسان سے نفرت کرتی ہے جو مراد کے قریب ہونے لگتا ہے خاص کر شیری کا کردار اس میں نفرت کی اشتہا کو بڑھا دیتا ہے۔ اقتباس:

> "ڈی اپنی ریگ ڈول (Rag Doll) (کپڑے کی گڑیا) کے چیتھڑے اڑا رہی تھی یہ وہ گڑیا تھی۔۔۔ ڈی اس سے پل بھر کو بھی علیحدہ ہونا پسند نہیں کرتی تھی کہتی تھی یہ میری بہن ہے ، سہیلی ہے اس سے میں دل کی ہر بات کر لیتی ہوں۔۔۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی ۔۔۔ برباد کر دوں گی۔۔۔ شیری وہ کمینی۔۔۔ میری ہر خوشی مجھ سے چھین لیتی ہے۔"(۱۳)

مراد سے محبت کا جذبہ اس کے دل میں اس وقت ماند پڑا جب اسے مراد کی شادی کا پتہ چلا تو وہ کچھ دیر کو پیچھے ہٹ گئی۔ مگر جب سے مراد کی شادی میں ناکامی ہوئی تھی۔ اس واقعہ نے اس کے دل میں جذبات الفت کو بڑھاوا دیا اور وہ پھر اس کے قریب آنے لگی۔ مگر شیری کے ساتھ مراد کی وابستگی اسے کبھی اچھی نہ لگی تھی۔ محبت کی اس تکون میں سراسر کوئی تہی داماں دکھائی دیتا ہے۔ تو وہ ڈی تھی۔ ڈیلائلہ کا دکھ غصے اور انتقام کی صورت اس وقت اختیار کرتا ہے۔ جب وہ اس بات سے واقفیت حاصل کرتی ہے کہ اس کی سگی ماں شیری کی سوتیلی ماں ہے۔ اسے یہ تکلیف چین نہیں لینے دیتی۔ اکلاپے کا یہ دکھ اس کے ڈپریشن میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔ نشہ آور گولیاں کھانے لگتی ہے اور بالآخر زیادہ تعداد اس کی موت کا باعث بنتی ہے۔

مرد و زن بحیثیت فرد اپنا اپنا انفرادی وجود رکھتے ہیں۔ سماج میں رہتے ہوئے ہر انسان کی اپنی معاشرتی، نفسیاتی اور جذباتی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ بحیثیت انسان ہر ایک کے اندر فطری صلاحیتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ جن کے اظہار کی خواہش اس کے وجود کا بنیادی تقاضا بن کر مذہبی اور سماجی جکڑ بندیوں کے خلاف بر سر پیکار رہتی ہے۔ مرد ہو یا عورت دونوں میں بحیثیت انسان محبت، نفرت، حسد، رقابت اور غصہ جیسے احساسات و جذبات کا پایا جانا ایک فطری عمل ہے۔ مگر ہمارے معاشرے میں جو رویہ عمومی طور پر دیکھنے میں آتا ہے وہ یہ کہ اخلاقی اور معاشرتی طور جتنے بھی اصول وضوابط ترتیب پاتے ہیں وہ سبھی کی پاسداری زیادہ تر عورت کے حصے میں آتی ہے۔

جیسے کہ مرد کی جنسی ضرورت اس کی فطری خواہش جبکہ عورت کی جنسی ضرورت کو بے راہ روی کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔ جذباتی اور قدرتی صلاحیتوں کے اظہار پر پابندیوں کے باوجود بھی عورت اپنی شخصیت کے اظہار کے لیے کوشاں دکھائی دیتی ہے۔ چاہے اس کا تعلق دیہات سے ہو یا شہر سے۔ دیہاتی زندگی کی روایتی جکڑ بندیوں سے باغی ہو کر اپنی راہ کا انتخاب کرنے والی ست بھرائی (مشمولہ: نیلی بار) کا کردار اور اس پر گزرے واقعات پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ ست بھرائی (مشمولہ: نیلی بار) جس کی دیوانگی گاؤں کے بچوں کا کھیل تماشا بنی، بچے کئی کئی پہر لٹھ اٹھائے اسے بھگاتے رہتے۔ پتھر، روڑے مار مار اپنا نشانہ پکا کرتے۔ ان کا اڑن کھٹولا بنی ست بھرائی کی باچھوں سے رالیں ٹپک ٹپک اس کا گریبان بھگو دیتیں۔ وہ ویران جنگلوں، میدانوں، نہر کے کنارے، فصلوں کے اندر باہر دن رات بھٹکتی رہتی۔ مگر کسی کو اس کے قریب بھٹکنے کی جرات نہ ہو پاتی تھی۔ اپنے سانول کی دید کی پیاس اسے کہاں کہاں رلاتی پھرتی تھی۔ لوگ اس کی دیوانگی کو آسیب زدگی کا نام دیتے۔ اسے کوئی ہاتھ لگانے کی جرات کرتا تو غیر مرئی قوت آڑے آجاتی۔ وہ ایسے طاقتور بن کر کھڑی ہو جاتی جیسے سارے جہاں کی طاقت کا مرکز وہی ہو۔ بچوں اور مردوں سمیت عورتیں بھی اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگی تھیں۔ عورتیں منہ سکیڑ کر اس کے بارے گفتگو کرتیں۔ اسے کنجری اور لُچی جیسے نا زیبا الفاظ سے مخاطب کرتیں۔ آگ میں جھلسا دینے کی تاکید کرتیں۔ ان کے نزدیک ست بھرائی چلتی پھرتی گمراہی کا نام تھا۔ اس کے درد و تکلیف کی جانب کوئی نہ دیکھتا، نہ سمجھتا اور نہ سمجھنا چاہتا تھا۔ ہر ایک کے اپنے درد تھے۔ جو اس کا درد مسلسل تھا، اسے کبھی کسی نے بھانپنے کی کوشش نہ کی۔

ابھی کل کی بات لگتی تھی برات دلہن لیے لوٹ رہی تھی کہ راہ بھول جانے پر دلہن ہی گنوا بیٹھی۔ بالا دستی اور زیر دستی والے فلسفے میں زیر دست ہمیشہ تہی داماں رہا ہے۔ اور آج بھی ایسا ہی ہوا۔ ملک وڈا کی ہوس کا شکار ہونے کے لیے اپنے دولھا سے جدا کی جانے والی ست بھرائی ملک عبدالرحمٰن کی ضد بنی۔ پورے بارہ ماہ عبدالرحمٰن کے سوا کسی نے اسے ہاتھ نہ لگایا۔ کوئی انسانی آواز اس کے کان کو نہ چھو پائی تھی۔ جنگل میں دو کمروں کے بنے اس ڈیرے میں وہ تنہا رہتی تھی۔ جنگل کے سکوت کو اگر کسی نے توڑا تھا تو وہ پاس سے گزرتی ریل کی آواز یا پھر جنگلی درندوں کی کوکاریں۔ ہر سو ہر لمحہ جنگل کی اندھیری رات میں اندھی طاقت کا راج رہتا یا عبدالرحمٰن کا، کوئی اور طاقت بھٹک نہ پائی تھی۔

> "ست بھرائی۔۔۔گھنے جنگل میں چھپے دو کمروں والے اس مکان میں جیسے وہ پیدا ہوئی تھی اور اسے ہی اوڑھ کر یہیں مر جائے گی۔ اس کے ماں باپ بہن بھائی، ہم جولیاں سب دھندلا سا خواب جیسے اس نے آنکھ کھولی ہو تو سامنے عبدالرحمٰن کا باغ کھلا پایا۔۔۔وہ تو اپنا نام بھی بھول گئی تھی۔ اب وہ ست بھری تھی عبدالرحمٰن بھری۔۔۔"(۱۴)

کل تک اپنے دلھے کے کھو جانے پر کہرام مچانے والی ست بھرائی جسم پر تصرف حاصل کرنے والے پہلے مرد عبدالرحمٰن کے عشق میں مبتلا ہو کر سٹاک ہوم سنڈروم (Stockholm Syndrome) کا شکار ہوئی اور اپنا آپ گنوا بیٹھتی ہے۔

ست بھرائی کم عمر ہونے کے ساتھ کم ہمت اور طاقت میں بھی عبدالرحمٰن کے ہم پلہ نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جس ماحول کی وہ پروردہ تھی وہاں بیٹیاں تو کیا بیٹے بھی اپنے حق کی بات نہیں کر سکتے۔ وہاں نظام قدرت کے توازن کے لیے کمزور غربا کو ان کی اوقات میں رکھنے کے لیے جو حد بندی مقرر کر دی جاتی ہے اس میں انھیں طاقت کے خوف تلے دبائے رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ نادار اور غریب کا بھرا پیٹ بڑا فساد بن کر سامنے آتا ہے۔ فساد کو پھیلنے سے روکنے کے لیے معاشرتی سطح پر جو جو حد بندیاں طاقت ور اپنی طاقت کے زعم میں لگاتا ہے ان پر عمل پیرا ہونا جہاں غریب کی مجبوری ہوتی ہے وہاں حالات کا تقاضا بھی۔ یہ ناخدا ان کی کل تقدیر کے مالک ہوتے ہیں۔ کہیں مارتے ہیں، تو کہیں بچانے کا سامان بھی مہیا کرتے ہیں۔ ست بھرائی اپنی

بارات سے علیحدہ کی گئی تو ملک وڈا کی تسکین کا سامان مہیا کرنے کے لیے۔ ایسے میں عبد الرحمٰن کا اسے وہاں سے بھگا کر جنگل میں لانا، تمام عیش و آرام مہیا کرنا اس کے لیے محض ایک خواب لگتا تھا۔

عبد الرحمٰن اس کی ذات میں اپنی محبت کے تمام رنگ گھول چکا تھا۔ اس کی وقتی ہمدردی ست بھرائی کے لیے عمر بھر کا روگ بن گئی۔ وہ اس کی قید میں رہنا چاہتی تھی۔ اب اس سے دوری اس کے لیے ناممکن تھی۔ کیونکہ جب وہ اغوا ہوئی تھی اس وقت سے اب تک اس نے طاقت ور کی طاقت کا جلال دیکھا تھا۔ اس کے لاکھ احتجاج کے بعد اس کے دماغ سے آزادی کے نام کو کھرچ دیا گیا۔ اسے احتجاج کرنے کا وقت بھی نہ دیا گیا تھا۔ بس خاموش کرا دیا گیا۔ کیونکہ غریب تھی۔ آزاد ہونے کی امید کھو بیٹھی۔ قید سے فرار کی کوئی راہ سوجھتی نہ تھی۔ اسے جسمانی اور ذہنی اذیت سے بچانے والا دفاعی نظام لاشعوری طور پر عبد الرحمٰن کا حامی ہوتا چلا گیا۔ اور وہ زیادتی کرنے والے کو اپنا حامی مانتے ہوئے اسے کل کائنات تصور کرنے لگتی ہے۔ اس کے برعکس عبد الرحمٰن جس ہیجانی کیفیت میں اسے اٹھالایا تھا اب اس انتقام، غصے اور نئے ذائقے کی شدت کم پڑنے لگی تو ست بھرائی دبڑے کی گھاس بن کر تلووں میں چبھنے لگی۔ ست بھرائی عبد الرحمٰن کی ست بھری بنی سب کچھ فراموش کیے، اگر کچھ یاد رکھے بیٹھی تھی تو وہ ڈھولے ماہیے جو عبد الرحمٰن کی یاد میں گاتی رہتی۔

ست بھری کے شب و روز جنگل میں عبد الرحمٰن کی یاد میں خوب بسر ہو رہے تھے۔ کہ اچانک تبدیلی کی ہوا نے اس کی زندگی اتھل پتھل کر کے رکھ دی۔ ست بھرائی ڈیڑھ سال بعد اپنوں میں لوٹی تو ماں بہن بچھڑی کونج کو گلے لگا کر دھاڑیں مار مار رونے لگیں۔ مگر ست بھرائی کا اپنا سب کچھ تو اس کا سانول عبد الرحمٰن تھا۔ وہ ہی نہ تھا تو پھر اپنا کسے کہتی۔ قریب آنے والے ہر شخص کو دھتکارے جنگل کی جانب سرپٹ دوڑی اور میرے سانول ماہی، میرا سانول یار، میرا ڈھولا، میرا رانجھن" کی صدا لگاتی چیخیں مار مار بین ڈالنے لگی۔ وہ درندوں اور جانوروں کے جنگل میں اکیلی کُرلا رہی تھی۔ کوئی درندہ اسے پھاڑ کھانے کو نہ بڑھا، شدت غم سے زندہ لہو ٹپکاتی آنکھوں کو نوچنے کوئی گدھ حملہ آور نہ ہوئے۔ انسانوں کے دیئے گئے زخموں سے چور بدن پر کوئی گوہ نہ جھپٹی۔ سب اس کے راز دان جو تھے۔ اس کے ہمدرد، اس کے غم گسار۔ وہ انسانوں کی دنیا میں داخل ہوتی تو اسے اپنے سانول کی مہک چاروں اور محسوس ہوتی۔ وہ ہر کسی کی منت سماجت کرتی کوئی تو اسے اس کا سانول

ماہی ملا دے۔ کوئی نیا قانون، کوئی بدلتی حکومت، کوئی سربراہ کوئی سردار جو اس کی کھوئی ہوئی خوشیاں اسے لوٹا دے۔

ست بھرائی کی دیوانگی پورے ناول میں جابجا بیان ہوئی ہے۔ مگر ذیلدار کو اس کے گاؤں (عبدالرحمٰن) سے پلٹتے دیکھ کر جو ست بھرائی کی کیفیت مصنفہ بیان کرتی ہیں۔ اس سے ان کے کامیاب کہانی کار ہونے کے ساتھ ایک ماہر نفسیات ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔

اقتباس:

"ذیلدار جی! تم میرے سانول یار کی جھوک سے ہو کے آئے ہو گھوڑے کے سموں پر لگی مٹی کی خوشبو مجھے دوروں سے آگئی تھی۔ ہائے میں لبھدی آسمانی آسو مینوں لبھیا بھوئیں تے ایں۔۔۔۔

ذیلدار جی! میرے ڈھولن نوں، میرے رانجھن نوں، توں ڈھڈا، توں تکیا توں ملیا۔ ہائے میں گھوڑے کا سم ہوتی۔ میں اس کے منہ میں چبھتی لگام ہوتی۔۔۔ میں اس کے پیروں کی مٹی ہوتی۔ ہائے میں میں نہ ہوتی میں تو ہوتی"۔ (۱۵)

لوگ اسے کملی، جھلی سمجھ روڑے مارتے، دھتکارتے۔ اسے سماج کی بنائی گئی تمام برائیوں کا محور مانتے۔ اسے بارہا کہا گیا کہ اس نے جو زندگی بسر کی وہ نہیں بلکہ اب کی گزر رہی زندگی اصل ہے۔ مگر اس کے دل و دماغ میں اک وہی سما گیا۔ جو اس کا دشمن تھا۔ وہی اس کا غم گسار ٹھہرا۔ جو اسے پل بھر کا سکھ دے کر عمر بھر کا روگ دے گیا وہی اس کی کل کائنات بنا۔

"یہ بات الگ ہے مرا قاتل بھی وہی تھا

اس شہر میں تعریف کے قابل بھی وہی تھا" (۱۶)

iii. جذبات کے مجروح ہونے کی صورت میں انسان کا نفسیاتی استحصال:

انسانی جذبات ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ جیسا ماحول ہو گا ویسے ہی رویے دیکھنے کو ملیں گے۔ محبت، نفرت، دوستی، دشمنی غرض ہر قسم کے جذبات میں ماحول اور حالات کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ رزم ہو یا بزم ہر شکل میں جذبات کو ابھار کر حالات کے مطابق انسانی طبع کو ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاریخ ایسے کئی واقعات سے

بھری پڑی ہے جبکہ انسان نے محض جذبات کے اتار چڑھاؤ سے حالات کے رخ بدلے۔ سیاسی، سماجی و مذہبی ہر صورت میں جذبات کا سہارا لے کر حالات میں بدلاؤ لایا گیا۔ حالات اور مواقع کی نسبت سے جذبات مثبت و منفی دو نوں صورتوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ مثبت حالات میں نتائج تسلی بخش صورتحال فراہم کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر حالات کے توسط سے انسانی جذبات کو مجروح کرنے کی کوشش کی جائے تو نتائج غیر یقینی حد تک خراب ہو کر انسانی شخصیت کے ساتھ ساتھ معاشرے کے بگاڑ کا سبب بھی بن سکتے ہیں۔ اور اس طرح انسان کے نفسیاتی استحصال کی کمیت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ انسانی حرکات و سکنات اپنی مثبت و منفی جذبات کی مرہون منت ہوتی ہیں۔

ابتدائے انسانی سے ہی انسانی جذبات و احساسات اپنا مخصوص کردار ادا کر کے تاریخی عمل کو بدلتے آئے ہیں۔ حالات کے تحت لوگ اپنے جذبات پر قابو بھی پاتے رہے ہیں۔ اور موقع ملتے ہی ان کا اظہار بھی کر دیا کرتے۔ کچھ ایسے ہی جذبات کے اتار چڑھاؤ کے بعد نفسیاتی مسائل کا شکار ہو کر دشمن کے خلاف سینہ سپر ہونے والا کردار غلام حیدر (مشمولہ: نو لکھی کوٹھی) ہے۔ غلام حیدر کا جارحانہ کردار اس وقت سامنے آتا ہے۔ جب اسے نفسیاتی طور پر زک پہنچائی جاتی ہے۔ نتائج جب حالات کے موافق نہ رہے تو کردار کا منفی روپ دھار کر اپنی بقا کے لیے جدو جہد کرنا ضروری امر قرار پاتا ہے۔ اگرچہ غلام حیدر کا کردار ایک تسلسل کے ساتھ مثبت حالات لے کر چلتا ہے۔ مگر ڈی ایس پی لوئیس کے حکم کے بعد صورتحال غیر یقینی حد تک خراب ہو جاتی ہے:

> "آپ اپنی رائفل اور اپنے آدمیوں کا تیز لوہا کم از کم تین ماہ کے لیے گورنمنٹ کو جمع کرادو۔ ڈی ایس پی لوئیس صاحب نے ایک قدم مزید آگے بڑھ کر کہا، غلام حیدر۔۔۔ آپ سے جو کہا گیا ہے وہ کرو۔ جھنڈو والا سے لیکر جودھاپور تک سب کی مالک گورنمنٹ ہے اس لیے آپ کا اسلحہ تین ماہ تک ضبط کیا جاتا ہے۔ اسے گورنمنٹ کو جمع کروادیں۔۔۔ مسٹر آپ کو یہ بات سمجھانے میں زیادہ دیر نہیں لگنی چاہیے، جو بھی گورنمنٹ کے حکم کی سرکوبی کرنے کی زحمت کرتا ہے، ہم اس کی گردن باندھ دیتے ہیں"۔ (۱۷)

ڈی ایس پی لوئیس کے لیے یہ عام سا حکم تھا۔ جو اس نے صادر کیا اور چل دیا۔ اس کے برعکس غلام حیدر کی صورت اور کیفیت عجب داستان سنا رہی تھی۔ ایک زوردار جھکڑ چلا اور پھر تھم گیا۔ مگر اس کے تھم جانے پر پتا چلا کہ کیا کہاں اڑا، کہاں بکھرا اور کہاں چلا گیا۔ غلام حیدر کا جواب سنے بنا، اس کی طبیعت میں پھیلے انتشار سے مکمل طور پر نا واقف انگریز سرکار کا یہ افسر اپنی کہہ کر چل دیا۔ اس صورتحال میں غلام حیدر کو اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ بے حد شفیق نظر آنے والا انسان اس قدر کڑواہٹ اگلے گا۔ جبکہ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ دشمن اس کی

گھات میں لگے ہوئے تھے۔ اس کے باپ کو مرے ابھی تین دن نہ گزرے تھے کہ فصل کو جلانے کے ساتھ ساتھ بندوں کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔

جلال آباد جو اس کا آبائی گاؤں تھا۔ غیر یقینی حالات کی بدولت اس کا سایا بھی اب بھوت بنا پیچھے لگا ہوا تھا۔ دشمنوں نے یکے بعد دیگرے اس کے دو گاؤں پر حملہ کر کے نہ صرف جانی و مالی نقصان پہنچایا بلکہ اسے حراساں کرنے کی بھی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ اس کے باوجود غلام حیدر نے اپنے تمام مسائل و تکالیف کو موجودہ حکومت کے آگے رکھتے ہوئے ان سے قانونی انصاف کی اپیل کی۔ اور اس اپیل کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج اسے دفتر میں بلا کر یہ کہا گیا کہ اپنی حفاظت کے لیے جو ہتھیار وہ رکھے ہوئے تھے اسے بھی حکومت کے حوالے کر دے۔ قانون کی ذرا برابر نا فرمانی نہ کرنے والا شک کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔ عجب کشمکش کی کیفیت میں مبتلا غلام حیدر صرف ایک ہی نقطے پر سوچ کو مرکوز کیے ہوئے تھا کہ آخر قانون بنانے والے انسانی سوچ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کیوں قانون بناتے ہیں؟ یہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو مجرم کو پکڑ کر سزا دینے کی بجائے۔ ان لوگوں کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں جن کے ساتھ زیادتی ہوئی ہوتی ہے۔ استحصال کے شکار ہونے والے کا مزید استحصال کیا جا رہا تھا۔ عجب طرح کی سوچیں اور وسوسے اس کے دل کو دہلا رہے تھے۔ کہیں حکومت خود مجرموں کے ساتھ تو نہیں ملی ہوئی؟ اگر قانون اس کے ساتھ ہے تو بجائے اسے تحفظ دینے کے اس کے ذاتی محافظ بھی چھین لیے گئے۔ تاکہ دشمن اور زیادہ شیر ہو سکے؟ یہ سب باتیں ایسی تھیں جن کا اس حالت میں اس کے دماغ کا حصہ بننا لازم تھیں۔

غلام حیدر کے دماغ پر شدید کوفت اور بیزاری کے جھکڑ چلنے لگے۔ تھانے سے نکل کر ساری بات باپ کے دوست ملک بہزاد کے گوش گزار کر دی۔ اب معاملہ عقل کے ترازو پر پرکھا جا رہا تھا۔ مانا کہ حکومت اپنی نافرمانی کرنے والوں کی گردن باندھ دیتی تھی۔ مگر وہ صرف ان لوگوں کی جو انھیں اپنے ارادوں کی بھنک پڑنے دیتے تھے۔ ملک بہزاد جیسا بندہ جس نے ساری حیاتی ایسی حکومتوں کی بازیاں انھی پر الٹی تھیں۔ اس کی عقل تک پہنچنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ غلام حیدر اس کی گود میں کھیلا بچہ تھا۔ حکومت وقت پر بھروسہ کر کے اپنے بندوں کے سامنے ذلیل ہو گیا۔ مگر اب کی باری حالات مختلف دکھائی دے رہے تھے۔ غلام حیدر ملک بہزاد کی ماہرانہ سوچ پر چلتا ہوا اب اپنے آپ کو جھکڑ بھری سوچوں سے نکال کر عام انسان کی زندگی جینے کے جتن کرنے نکل کھڑا ہوا۔

"غلام حیدر نے سودھا سنگھ کو جوڑوں سے پکڑ کر سیدھا کیا اور کہا، سودھے مجھے پہچان، میں ہوں شیر حیدر کا بیٹا غلام حیدر، جس کی ملاقات کا تجھے بڑا شوق تھا۔ اور جس کے بندوں کو تو نے ناجائز مار دیا تھا۔ تجھے اپنے ہرے سنگھ، جگیرے اور دمے پر بڑا مان تھا۔ وہ دیکھ میں نے ان کی چھاتیاں کھول دی

ہیں۔ کہاں گئے ان کی دیگی لوہے والی برچھیاں اور گنڈاسے؟ اب تو سمجھ لے، غلام حیدر نے اس بر گد کے نیچے تجھے سزائے موت سنادی۔۔۔"۔ (۱۸)

بارہ تیرہ سال قبل بچے کی معصوم صورت میں دکھائی دیا جانے والا غلام حیدر آج سودھا سنگھ کا قاتل بنا، آنکھوں میں خون اترا ہوا، ایک ہاتھ میں رائفل اور دوسرا ہاتھ سودھا سنگھ کی گردن پر۔ کیا ہیبت ناک شخصیت لے کر سامنے آیا تھا۔ عدالت نے جب اسے انصاف مہیا کرنے کی بجائے خوف کی دنیا میں دھکیلا تو اس نے ایک عدالت کی بجائے ہر اس جگہ کو عدالت بناڈالا جہاں جہاں اس کا دشمن پناہ گزین تھا۔ سودھا سنگھ کے بعد غلام حیدر نے عبدل گجر اور شریف بودلہ کو جالیا۔

"گھوڑوں کے رکتے ہی لوگوں میں ایک ہڑبونگ مچ گیا۔۔۔ غلام حیدر نے عبدل گجر کو مخاطب کر کے کہا، او حرامی تیار ہو جا غلام حیدر نیوندر اڈالنے آیا ہے۔ یہ بھی جان لے، تیرے باپ سودھا سنگھ کو اس کے گروجی کے حوالے کر آیا ہوں۔ لیکن افسوس کہ تو اس کی چتا کی آگ نہ سیک سکے گا، وہ بچارا بھی تیرے سیاپے اور تیری چارپائی کو کندھا دینے جوگا نہیں رہا"۔ (۱۹)

پڑھے لکھے شریف، عام انسان سے مجرم تک کا سفر طے کرنے کے بعد غلام حیدر ایک خاص مدت تک روپوش ہو گیا۔ اس عرصے میں سیاسی سطح پر کئی تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔ حکومتیں بدلیں، ملک ٹوٹا، زمینی خطے قوموں کے نام سے مختص ہوئے۔ غرض زندگی کا ہر شعبہ بدلاؤ کے عمل سے گزرا۔ اور تبدیلی کے اسی عمل میں غلام حیدر کے نام کا قرعہ آزادی بھی نکالا گیا۔ اس کے تمام گذشتہ زندگی کے ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے جو دھا سنگھ اور دیگر قتل ہو جانے والے افراد کے کیس کو محض الزام تراشی اور غلط فہمی کہہ کر ختم کروادیا گیا۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غلام حیدر کا کردار قابل اعتبار کیسے ٹھہرتا ہے؟ آئندہ کیا وہ ایسا کوئی کام نہیں کرے گا۔ اس بات کا کیا ثبوت تھا؟

گذشتہ اوراق میں یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ اس کا یہ عمل حالات کے رد عمل کے طور پر سامنے آیا تھا۔ وہ ہر گز برے کاموں کی جانب میلان نہیں رکھتا تھا۔ اگر ایسا نہیں کرتا تو نتائج برعکس ہوتے۔ اس کی سلطنت لٹ چکی ہوتی۔ اس کی رعایا دشمن کی چلمیں بھرتی پھر رہی ہوتی۔ اور ان سب حالات و نتائج سے بچنے کے لیے اس نے وہ کیا جو سن کر لوگ کانپ اٹھتے تھے۔ شاید اب کی بار جب وہ کسی تھانے کچہری میں جائے گا تو اس کی بات سنی جائے گی۔ انصاف کی بات کرے گا تو انصاف کے لیے قدم بڑھایا جائے گا۔ انتظار کے نام پر ہتھیار چھین کر ذہنی و نفسیاتی استحصال نہیں کیا جائے گا۔ کم از کم غلام حیدر کا شمار اب ان لوگوں میں نہیں ہو گا جنھیں قانون بلاجواز آگے لگالیا کرتا ہے۔

تیزی سے بدلتی ہوئی اس دنیا میں انسان جہاں معاشی اور معاشرتی مسائل سے دوچار ہوتا ہے وہیں نفسیاتی طو ر پر بھی استحصال کا شکار ہوتا ہے۔ سماج میں پھیلی تفریق ظاہر کے ساتھ ساتھ انسان کے باطن کو بھی گھائل کرتی ہے۔ عورت اور خاص کر طوائف کی نفسیاتی کیفیات کا اندازہ "کنجری کا پل" کے حوالے سے لگایا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اس کی زندگی مستقل ایک کش مکش میں گھری ہوئی ہے۔

اس بات سے ہر ذی شعور آگاہ ہے کہ incest معاشرتی سطح پر ایک کریہہ فعل بن کر سامنے آتا ہے۔ معاشرتی سطح پر اس کے نتائج جتنے گھناؤنے ہو سکتے ہیں۔ نفسیاتی سطح پر اس سے بھی کہیں زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں۔ بسا اوقات یہ عمل کرنے والے کی ذات کو براہ راست متاثر کرتا ہے۔ اور اکثر و بیشتر اس سے وابستہ رشتے اس کی تکلیف کو زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ ظہرہ مشتاق کی بیٹی مہر النسا کا اپنے ہی بھائی کے عقد میں آنا۔ اس کی بجائے ظہرہ کے ماضی کو زک پہنچاتا ہے۔ حقائق سے واقفیت کے بعد وہ اپنے سائے سے بھی خوف کھانے لگتی ہے۔ چاروں اور شیطانی طاقتوں کے طنزیہ و استہزایہ نشتر اس کی روح کو بار بار گھائل کر رہے تھے۔ طنز و استہزا کے ان تیروں میں اس کا تلخ ماضی چھپا تھا۔ گناہ میں بھیگی ایک خوبرو زندگی، جس کے نشے میں وہ اس وقت بھول گئی تھی کہ اگر کبھی یہ یاد بن کر سامنے آن کھڑا ہوا تو کیسے سہہ پائے گی؟ مقابلہ کیونکر ممکن ہو گا؟ مگر وہ وقت ایسا تھا کہ جب محبت میں بھیگے لفظ اس کی ایک مسکراہٹ کی قیمت روپوں کی بوریوں کی شکل میں ادا ہوتے۔ رال ٹپکتے منچلوں کی کستی آوازوں پر کان دھرتی اور ادا فروشی کو فن گردانتے ہوئے سب کچھ زیر کرنے کی دھن میں آگے ہی آگے نکلتی چلی جاتی تھی۔ یہ سب ماضی تھا۔ آج اس کا حال اگرچہ ایک کھلی کتاب بن کر سب کے سامنے تھا۔ وہ مدت سے اس بات کی متمنیٰ تھی کہ اس کے انگ انگ سے نیکی کی کونپلیں پھوٹیں اور تناور درخت بن کر اسے ذات و کائنات کا عرفان حاصل ہو۔ مگر نجانے کیوں یاد ماضی سے چھٹکارہ نہیں مل رہا تھا۔ اقتباس:

> "مجھے درد و الم سے لتھڑے ان عذابوں سے چھٹکارا کیوں نہیں ملتا؟ کیوں میرے جگر کا ٹکڑا مہر النسا۔۔۔ اس روپ میں میرے سامنے لایا گیا؟ کیوں اس نے میرے روک دینے کے باوجود دیدار حسین سے شادی کر لی۔"(۲۰)

مہر النسا کو حقیقت سے آگاہ کر دینے کے بعد ظہرہ کو یقین تھا کہ اس کی بیٹی ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائے گی۔ حقائق سے واقفیت کے بعد اس نے ماں کو یقین و اعتماد کی ایسی توانائی دی جس نے ظہرہ کو ایک نئی زندگی عطا کی۔ وہ ایک بار پھر سے زندگی کے سکھ کو محسوس کر کے بھرپور سانس لینے لگی۔ مگر اگلے ہی چند پل ایک خبر نے اس کی زندگی اندھیر کر دی۔ کچھ سنائی، کچھ دکھائی نہ دیا۔ شرم و حیا کے وہ تمام پردے چاک کر دیے گئے جن کا لحاظ ایک جسم فروش

عورت پر بھی لازم ہوتا ہے۔ دیدار حسین ولد عاشق حسین نے اسی کی کوکھ سے جنم لے کر اپنی جڑواں بہن سے شادی کرلی۔ یہ صرف ایک خبر نہ تھی بلکہ وہ تلخ اور کڑوی سزا تھی جس نے پہلے کی سزاؤں میں اضافہ کر دیا تھا۔ اب کی بار ملنے والی سزا کی تلخی ایک تسلسل سے اس کی روح کو گھائل کر رہی تھی۔ لاکھ سر چھٹکتی، آنکھیں بند کرتی، منہ موڑتی مگر تلخ حقیقت سے چھٹکارا پانا ناممکن ہو رہا تھا۔

ظہرہ مشتاق کے بعد ایک دوسرا کردار صبازادی کا ہے جو گندل خان کے ہاتھ کم عمری میں غربت کے ہاتھوں تنگ آکر بیاہ دی جاتی ہے۔ پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے باپ نے سودا کیا۔ وہاں سے بکاؤ کا مال بننے والی صبازادی آج تک بکتی آ رہی تھی۔ پیٹ کی بھوک سے شروع ہونے والا سفر جنس سے ہوتا ہوا موت پر آکر ختم ہوا۔ اور جنس کی مانگ کا خریدار اس بار کوئی غیر نہیں تھا اس کا اپنا بھائی تھا۔

کاشف، صبازادی کے خریدار کے روپ میں اپنی تمام زندگی کو اس ایک پل کا بدل چاہ رہا تھا۔ جس پل صبا زادی اس کی قربت میں تھی۔ کاش کہ زندگی اسی طرح بڑھتی پھلتی چلی جائے اور یہ لمحات کبھی اختتامی مراحل کی جانب نہ بڑھیں۔ کچھ ایسی ہی سوچ کی مقلد اس وقت تک وہ بھی تھی جب تک حقیقت سے ناواقف رہی۔ مگر حقائق سامنے آنے پر صبازادی کی کیفیت سمجھ سے بالاتر تھی: "میں جب آٹھ سال کا تھا اور وہ لگ بھگ چودہ سال کی۔۔۔ میرے بابا نے۔۔۔ ساڑھے تین لاکھ کا خرچہ لے کر صبازادی کو گندل خان لکڑہارے کے ساتھ بھیج دیا ہمیشہ کے لیے۔"(۲۱)

خبر تھی یا دھماکہ۔ صبازادی کی نس نس سکڑتی گئی۔ جسم کی تمام تر رطوبتیں مکمل طور پر منجمد ہو رہی تھیں۔ ہمت کر کے اوساں بحال کیے اور اتنا جاننے کی ہمت کی کہ آیا وہ سگی تھی یا سوتیلی؟ مگر جواب سن لینے کے بعد صبازادی نے صنف نازکی کے تمام اصول بالائے طاق رکھتے ہوئے اس زور سے کاشف کو دھکا دے کر خود سے الگ کیا جیسے کوئی کریہہ فعل کی انجام دہی کے دوران انجام سے اچانک واقفیت مل جانے پر اپنی جان چھڑانے کی کوشش میں قتل تک سے گریز نہیں کرتا۔ کاشف اپنے غم و غصے میں گالیاں بکتا اس پر جھپٹنے کی کوشش میں بارہا ناکام ہو رہا تھا۔ اسی اثنا میں صبازادی اپنے مکمل ہوش و حواس کھو چکی تھی۔ کاشف کے منہ پر زوردار طمانچہ مار کر اپنے ننگے جسم کی پروا کیے بنا زخمی شیرنی بنی باہر کی جانب دوڑ گئی۔

رات کے دو بجے ہوٹل کا ہر کمرہ آسودگی کی لپیٹ میں تھا۔ اگر کہیں آگ کے شعلے روح کو جھلسا رہے تھے تو وہ ۴۱۳ نمبر کمرہ تھا۔ جہاں جلنے والی آگ نے انسانی زندگی کو منجمد کر دیا تھا۔ وہ ہانپتی کانپتی باہر سب کے سامنے سسک رہی تھی۔ اس کی سسکاریوں پر کوئی غور نہیں کر رہا تھا۔ اگر کوئی بولنے پر آمادہ تھا بھی تو بس اتنا کہ اگر اس کی قیمت کم

لگی تھی تو اندر بیٹھ کر آرام سے بات کرتی۔ یوں سر راہ کسی شریف انسان کی عزت کو داغدار کرنے کا اسے کوئی حق نہیں تھا۔ عزت دار اشرافیہ اپنی ہی کہے جا رہے تھے۔ کوئی کچھ نہ پوچھ رہا تھا۔ نہ جاننے کی سعیٔ کر رہا تھا۔ حقائق سے ناواقف اگر کچھ تھے تو بس تماش بین۔ ایک خوبصورت، دلکش بنا لباس کے لڑکی سامنے حیرت کے گہرے سمندر میں غرق، اپنے انجام سے بے نیاز، دماغ کیا تانے بانے بن رہا تھا۔ کوئی نہیں جاننا چاہتا تھا۔ سبھی کو مہنگے ہوٹل کی بدنامی کا خوف تھا۔ جو اس راز کے زبان زد عام ہو جانے پر طاری ہو جاتا۔ ہر بندہ باری باری اسے پچکارتا اور کاشف کے ساتھ کمرے میں واپس جانے کی بات کرتا۔

ہیجان اور خوف کی عجب کیفیت اس کے دماغ میں رچ بس گئی تھی۔ کاشف کے بار ہا منت سماجت کرنے پر بھوکی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹنے لگتی تھی۔ اس کا سگا بھائی خریداروں کی صف میں کھڑا تھا۔ خوف تھا کہ دماغ کو ماؤف کیے جا رہا تھا۔ تذبذب کی کیفیت میں کمرہ نمبر ۴۱۳ کی جانب چل پڑی۔ بڑھتے قدم کاشف کو اس کی جیت کا پیغام دے رہے تھے۔ جبکہ صبازادی کی دماغی حالت کوئی اور کہانی بن رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ساتھ صبازادی نے کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ اور پھر نوکری میں ناکامی کی صورت خبروں کی زینت بنا دی گئی۔

باتیں، افسانے اور حکایت دنیا میں اپنی جگہ بناتے رہتے ہیں۔ کیونکہ حقائق ان کے پیچھے چھپ جایا کرتے ہیں اور حقائق تک کوئی جاننے کی کوشش کہاں کرتا ہے۔ عزت دار معاشرہ اپنے چہرے انھی کے پردے میں چھپا لیا کرتا ہے۔ اشرافیہ عورت کو استعمال کر کے دشمن کو لذیذ موت کا ذائقہ چکھاتے ہیں اور پھر اسی لذیذ موت کو ان کا مقدر بنا کر خوف اور اندیشوں میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اپنے مقصد کو پانے کی غرض سے یہ طبقہ بڑے بڑے اقدام اٹھانے میں کبھی گھبراتا نہیں۔ صبازادی کے سامنے اس کا بھائی قابل اعتراض حالت میں اس کی عزت و عصمت کا خریدار بنا کھڑا تھا۔ ایسے میں وہ اپنی زندگی کو خیرباد کہہ کر اپنی عزت کا تحفظ کر لیتی ہے:

> "کاشف نے خوشی سے خود کو یکجا کرتے ہوئے صبازادی کو پھر سے کمر سے لپٹنے کے لیے بازو پھیلایا تو صبازادی دو تین سانس تک باقاعدہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تکتی رہی۔۔۔ اس کی نگاہوں میں ممتا تھی۔۔۔ محبت تھی اور پچھتاوا۔۔۔ پھر یکلخت صبازادی میں کہرام مچا، ایک طوفان سا اٹھا اور۔۔۔ اپنے لمبے ناخنوں سے کاشف کا سینہ چھیل دیا۔ وہ کاشف کو زخمی کرتے ہوئے پورے زور سے چیخ رہی تھی۔۔۔ پھر اس نے غرا کر کاشف پر زور سے تھوکا۔۔۔ خود پر سے چادر اتار کر پھینکی، چیخ کر بھاگتی ہوئی بالکنی تک پہنچی اور نویں منزل سے نیچے کود گئی۔"(۲۲)

پھٹی نائٹی کے ساتھ کنپٹی سے نکلتا لہو اس کریہہ فعل کی سرزدگی سے انکار کا ثبوت تھا۔ اس کی ہڈیاں ریزوں میں بدل چکی تھیں۔ اور عزت دار طبقہ اس کی وجہ نوکری سے مسترد ہو جانا بتا رہا تھا۔ پولیس ورثا کی متلاشی تھی۔ ورثا تو وہی تھے جو اس کی عصمت کے خریدار تھے۔ اب اور ورثا کہاں سے آئیں گے ؟

"انسان، اے انسان!

آخر تو کیا ہے ؟"

کے عنوان سے آغاز کیے جانے والا ناول انسانی نفسیات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ انسانی زندگی لمحہ بہ لمحہ تغیر ات کے سمندر میں غوطے کھاتے چلی جا رہی ہے۔ اور ایسے میں انسان حالات کے ہاتھوں کھلونا بنا ذہنی پیچیدگیوں کا شکار دکھائی دے رہا ہے۔ زندگی کے دریا میں کہیں سکوت نہیں۔ حرکت ایک تسلسل کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ انسان زندگی میں اپنے فعل سے سیکھ کر جو نفسیات سامنے لاتا ہے اس کے مطابق بتا کر کیا جانے والا منفی کام نقصان کا سبب ہے جب کہ چھپ کر کیا جانے والا کام کبھی تکلیف نہیں دیتا۔

اگرچہ بات بڑی مضحکہ خیز ہے مگر جدید معاشرے میں حقیقت کچھ ایسی ہی سامنے آتی ہے۔ غیر فطری ماحول میں پرورش پانے والے بچے کے ذریعے سماجی کجرویوں اور والدین کے ناروا سلوک کو ناول کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ والدین کے غیر ذمہ دارانہ رویوں کی بدولت بچے معاشرے میں منفی طرز اپناتے پروان چڑھتے ہیں۔ روایتی مذہبی گھرانا جہاں مولوی صاحبان کا طرز تدریس غیر دانشمندانہ ہوتا ہے۔ علم کی کمی کی وجہ گناہ اور ثواب کے تصور کو انسانی اذہان میں نقش کر کے فتوی دیے جاتے ہیں۔ وقت کی نزاکت اور بچوں کے مزاج کو جانے بنا اس ماحول کا ہر شخص خوفناک جلاد کا روپ دھارے ہوئے سامنے آتا ہے۔ ان افراد کا طرز تدریس بہت عجیب قسم کا دکھایا گیا ہے کہ ان کی دی جانے والی مذہبی تعلیمات کی روشنی میں انسان اپنے آپ کو گنہگار تصور کرتا ہے۔ تلمیذ کا کردار ایسے ہی منفی ماحول کا پیدا کردہ دکھایا گیا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے ماحول سے یہ بات اچھی طرح جان لی تھی کہ چھپ کر سرزد ہونے والا فعل گناہ کہلاتا ہے اور ایسا گناہ جو آشکار نہ ہو سکے قابل معافی ہوتا ہے۔

تلمیذ کے ذریعے مصنف نے بڑی باریک بینی کے ساتھ انسانی نفسیات کا مشاہدہ بیان کرنے کی کامیاب سعئی کی ہے۔ مذہب کی بدولت انسانی قلوب و اذہان میں آنے والی تبدیلی جب منفی صورتحال اختیار کر جائیں تو ایسے میں انسان مایوس ہو کر دنیا کے دوسرے رنگوں میں کھو جاتا ہے۔ اور یہی رنگ اسے جیل کی سلاخوں

سے متعارف کرانے میں مدد گار ثابت ہوتے ہیں۔ انسانی باطن کو سنوارنے اور بگاڑنے میں ماحول کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔

"اس میں پرورش پانے والا فرد اپنے باطن میں ایسی کمزوریوں کو جنم دیتا ہے جس سے اس کی زندگی کرب واذیت میں گزرتی ہے۔ تو خود سماج بھی اس بگاڑ سے محفوظ نہیں رہتا جو ایک اکائی کے اندر پروان چڑھتا ہے۔"(۲۳)

تلمیذ الرحمن نے ظاہری مذہبی لبادے کو خیر باد کہا تو گھر والوں نے اناللہ پڑھ لیا۔ بہن کے گھر آیا تو گھٹن زدہ ماحول میں جی نہیں لگتا تھا بھانجوں کے دریافت کرنے پر کہنے لگا۔ اقتباس:

"اس گھر میں کوئی گنگناتا نہیں ہے۔ اول تو چڑیاں آتی نہیں ہیں۔ جو آتی ہیں خاموشی سے روٹی کے بھورے چگ کر اڑ جاتی ہیں۔ کبھی انھیں چہچہاتے دیکھا ہے؟ کبھی بچوں کو ساتھ لاتی ہیں؟ پھر کیسے جی لگے۔"(۲۴)

گھر میں جب باپ نے اپنی ذمہ داریوں سے ہاتھ اٹھالیا تو بہنوئی آخر کب تک اسے اپنے پاس رکھنے کا ٹھیکہ لیتا۔ والدین کے بعد بہنوئی بھی اس سے تنگ آگیا۔ وہ بارہا اسے زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ اسے بار بار 'منظور' کہہ کر مخاطب کرتا، مقصد اسے ذہنی اذیت دینا تھا۔ منظور ہندو لڑکی سے شادی کی پاداش میں گھر بدر کر دیا جاتا ہے اور بھوکا پیاسا تھا دنیا کو خیر باد کہہ دیتا ہے۔ بہنوئی بار بار اس کا نام لے کر اسے اذیت دیتا۔ کیوں کہ منظور تلمیذ کا دور پار کا رشتہ دار تھا۔ سوچ کے مخالف ماحول اور حالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ تلمیذ کا کردار معاشرتی سطح پر ہونے والی تمام برائیوں کو اپناتا ہے۔ اور بالآخر جیل سے رہائی کے بعد امینہ اور فتی جیسے ہمدرد دوستوں کے ساتھ رہتے ہوئے اسے اپنا ماضی یاد آنے لگتا ہے۔

"ایک دن تھا کہ باپ نے گھر سے نکالا تھا۔ پھر وہ دن آیا جب بہنوئی نے گھر سے نکال دیا ۔ ان سے تو یہ لوگ اچھے ہیں کہ رہنے کی جگہ دی ہے۔ نہ کھانے کی فکر میں کپڑوں بستر ے کی اور جتنے دن چاہو ں بغیر بھاڑا دیئے رہوں۔"(۲۵)

تلمیذ کے کردار سے شروع ہونے والا ناول وقت کی تین جہتوں ماضی، حال اور مستقبل میں وحدت پیدا کرتا ہوا تلمیذ پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ وہ جیل میں رہ کر ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے کی کوشش کرتا ہے تو زندگی بہت تلخ ولاچار دکھائی دیتی ہے۔ ناول میں انسان کی ذاتی کشمکش کو داخل اور خارج کا امتزاج بنا کر پیش کرنے کی سعئی کی گئی ہے۔ مذہبی ٹھیکیدار اپنے سخت گیر اصولوں کے بل بوتے پر انسانی اقدار اور محبت آشتی کا گلا گھونٹ کر ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیتے ہیں جو انسان کی نفسیات کو زک پہنچ جاتا ہے۔ تلمیذ کے حالات پر غور کیا جائے تو بچپن سے جوانی تک اسے زندگی کا جو تصور دیا گیا تھا اس میں سوائے سزا اور خوف کے کچھ نہ تھا جس سے وہ نفسیاتی طور پر بکھرتا گیا۔ "۔۔۔بچہ گناہ کے درجات بناتا ہے چھپ کر کیے جانے والا گناہ قابل معافی اور جو ظاہر ہو جائے وہ قابل سزا اور اسی طرح بچوں کی نفسیات دو خانوں اور دو درجات میں منقسم ہو کر منتشر ہو جاتی ہے "(۲۶)

ابتدائی ایام زندگی میں انتشار کا شکار ہونے والا تلمیذ کا ذہن اسے کبھی مکمل اور بہتر انسان نہیں بننے دیتا۔ اسے بچپن میں مذہب کے ٹھیکیداروں نے جو خدا کا تصور دیا تھا اس کے مطابق بس سزا ہی تھی، جزا کہیں بھی نہیں تھی۔

مذہب کے نام پر انسانوں کے جذباتی استحصال کی تاریخ بہت پرانی ہے بات محض اتنی سی ہے کہ خود ساختہ اور من پسند اصولوں کے ٹھیکیدار کسی کو کافر اور کسی کو حرام کی موت کا فتویٰ دینے والے یکسر بھول جاتے ہیں کہ انسانی زندگی میں تبدیلی کا عمل باطن سے پھوٹتا ہے ظاہری پرچار کر کے دلوں میں منافقت کے بیج بو کر چلنے والے معاشرتی سطح پر انسان کے نفسیاتی استحصال کا موجب تو بن سکتے ہیں مگر کوئی مثبت پیش رفت سامنے نہیں لا سکتے۔

iv. سائنس و ٹیکنالوجی اور انسان کا نفسیاتی استحصال:

بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی میں انسانی زندگی نے سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں بیش بہا ترقی کی۔ نئی صدی، نئی زندگی اور نئے تقاضے، ہر نئے دن کا طلوع ہوتا سورج انسان پر ایک نئے جہاں کا در وا کرتا چلا جاتا ہے۔ سائنس کی دنیا میں برپا ہونے والے انقلابات کی بدولت جو جب اور جہاں چاہو پاؤ جیسی مثبت تبدیلیاں انسانی زندگی کا حصہ بنی ہیں۔ پوری دنیا موبائل، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن کی لپیٹ میں لپٹی دکھائی دیتی ہیں۔ سائنس کی ان حیرت انگیز ایجادات و انکشافات نے جہاں انسان کو متحیر کیا وہیں یکجا بھی کیا۔ پوری دنیا گلوبل ولیج بن گئی، فاصلے سمٹ

گئے۔ اور ان سمٹتے فاصلوں میں ادب بھی کہیں پیچھے نہیں رہا۔ تخلیق کاروں نے نئے رجحانات کی بدولت موضوعات میں بھی تنوع لایا۔

نئی صدی نئے موضوعات کے ساتھ ادب کی دنیا کا حصہ بنتی دکھائی دیتی ہے۔ ایسے ہی نئے موضوع کی عکاسی عاصم بٹ کے ناول "دائرہ" میں ملتی ہے۔ ناول "دائرہ" جدید ٹیکنالوجی کی بدولت پیدا ہونے والے انسان کے نفسیاتی استحصال پر مبنی کہانی ہے۔ جدید تقاضوں کے مطابق گزرتی جدید زندگی میں انسان کی گم ہوتی شناخت اس کی نفسیاتی الجھنوں و پریشانیوں کا ایک بڑا محرک بن کر سامنے آتی ہے۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ خود کو لوگوں، جگہوں اور چیزوں کے ساتھ وابستہ کرنے کا عادی ہے۔ اور وابستگی میں کمی بیشی اسے نفسیاتی کرب میں مبتلا کر کے اس کی شناخت کو سوالیہ نشان بنا کر اسے ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔

ناول کا بنیادی و مرکزی کردار راشد کچھ ایسے ہی مسائل سے دوچار دکھایا گیا ہے۔ غربت کے تھپیڑے کھاتا اپنی ارد گرد کی زندگی میں اگر کچھ اچھا دیکھ پایا تھا تو تھیٹر کے چند کردار۔ یہ کٹھ پتلیاں اسے سدا متاثر کرتے تھے۔ اور انھی کا تاثر لیے وہ لاہور شہر کی فضاؤں سے واقف ہوتا ہے۔ نتیجتاً زود حساسیت کا شکار ہو کر اپنی پہچان کھو بیٹھتا ہے۔ تشخص کی گمشدگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اب کی بار شناخت کا متلاشی ہونے والا یہ کامیاب کردار بچپن میں بحران در بحران زندگی گزارتا رہا۔ غربت کے اس کربلائی دور سے چھٹکارا پانے نکلا اور زندگی کے جدید تقاضوں میں اپنی پہچان کھو بیٹھا۔ دوران اداکاری اپنے کردار میں اس قدر کھو جاتا کہ اپنی اصل سے بھی دور ہو جاتا۔ بالآخر ایک وقت ایسا آیا کہ کردار کے بارے تشکیک کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ شک اسے عفریت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ "آج کے انسان کا بنیادی مسئلہ اپنی شناخت ہے۔ اس ناول میں جو Identity کرائیسس دکھائے گئے ہیں۔ وہ جدید انسان کا مسئلہ بن چکا ہے"۔ (۲۷)

جدید انسان کے مسائل جدید ٹیکنالوجی کی پیداوار ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان جس قدر تیزی کے ساتھ ترقی کی منازل طے کرتا چلا جا رہا ہے اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے وہ خود اور خود سے وابستہ لوگوں سے دور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ انسان مادی زندگی کی دوڑ میں بہت کچھ پا لینا چاہتا ہے۔ مگر اس بہت کچھ پا لینے میں وہ اپنا سب کچھ گنوا بیٹھا ہے۔ میڈیائی اداکار کی یہ مجبوری ہوتی ہے کہ وہ کردار کی اصل کو ملحوظ خاطر رکھے۔ دوران اداکاری اس کی ذرا برابر لاپروائی بڑے نقصان سے دوچار کر سکتی ہے۔ اس لیے وہ ہر کردار میں اپنی ذات کو ضم کر کے اسے نبھاتا ہے۔ نتیجتاً کامیابی کی بلندیوں کو چھوتا ایک کامیاب اور اچھوتا کردار بن کر ابھرتا ہے۔ راشد (مشمولہ دائرہ) ایسا کردار ہے جو داد وصول کر کے کامیابی کی بلندیوں کو چھوتا ہے۔ اور اپنی ذات کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔ ایک کردار سے دوسرا، دوسرے

سے تیسرا اور تیسرے سے آگے اور کئی کردار کا روپ اپنائے وہ اپنی اصل سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ لوگ اسی کے نبھائے جانے والے کرداروں کے ناموں سے اسے پکارتے ہیں۔ کرداروں کی ان بھول بھلیوں میں اس کی اپنی ذات کہیں کھو سی جاتی ہے۔ جو اسے ذہنی کرب میں مبتلا کر دیتی ہے۔

میڈیائی دنیا کا یہ کردار دائرے میں گھومنے لگتا ہے۔ جس کا کوئی سرا دکھائی نہیں دیتا۔ اور سوچا جائے تو دائرہ گول ہوتا ہے۔ اس کا کہاں کوئی سرا ملتا ہے۔ جدید دور میں کامیابی کے معیار بھی بدل گئے۔ اپنی ذات کی اصل بھول کر ہی ترقی ممکن ہو گویا۔ "میرے کردار مجھ سے چمٹے رہتے ہیں۔ کسی اور سے نہ ملو۔ کسی اور کی نہ سنو۔ میں کیسے ان کی مانوں"۔ (۲۸)

اچھے اداکار کے لیے وقت اور حالات کا تقاضا یہی ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے کردار میں خود کو اس طرح سے ڈھال لے کہ اس کی ذات میں گھل مل جائے۔ اور راشد بھی یہی کرتا۔ کرداروں کی تخلیق میں اپنی تمام قوتیں صرف کر دیتا۔ خود کو ان کرداروں میں ڈھالتا اور ایسا کر لینے کے بعد اس کی اداکاری کے جوہر قارئین کے دل میں گھر کر جاتے۔ اس سب عمل کی تکمیل کے بعد وہ ایک عام انسان کی سی زندگی جینے کا خواہشمند ہونے لگتا۔ کرداروں سے الگ اپنی شناخت چاہتا، اس کا اپنا نام، اس کی اپنی ذات، تلاش کے باوجود کہیں نہ پاتا، پھر ان کرداروں کو کسی کھرنڈ کی مانند کھرچتا، ریشہ ریشہ خود سے جدا کرنے کی کوشش میں نجانے کتنی ہمت لگا دیتا۔ اور اس تکلیف دہ عمل سے گزرنے کے بعد بھی اس کی ذات اسے کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ پورے ناول میں جابجا راشد اپنی شناخت کی محرومی کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ اپنی بیوی نورین (جو اس کی ساتھی اداکارہ بھی ہے) کے ساتھ گھر کی بجائے ان جگہوں پر جانے کا اصرار کرتا ہے جو کبھی کسی فلم یا ڈرامے میں کردار نبھاتے ہوئے دکھائی گئیں۔ اقتباس:

"بس یہیں اتار دیجیے"، اس نے گھٹی ہوئی باریک آواز میں کہا"

"میں گھر چلا جاؤں گا۔ میں راشد نہیں ہوں"۔

"تم راشد نہیں ہو۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"۔ عورت الجھی ہوئی، غم زدہ اور غصیلی آواز میں بول رہی تھی۔

شاید میری صورت راشد سے ملتی ہے۔ آپ شاید راشد کی بیوی ہیں"۔

"۔۔۔ ادھر گلبرگ میں ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہے 'امیجز' وہیں کام کرتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ کیسے یہاں سٹوڈیو میں پہنچ گیا۔ میں تو اپنے دفتر کے باہر فٹ پاتھ پر کھڑا تھا اور۔۔۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔" (۲۹)

فلم کی شوٹنگ اختتامی مراحل سے گزری تو کچھ مدت کے لیے نورین آرام کے بارے میں سوچنے لگی۔ راشد کے ساتھ شادی کے بعد سے لگاتار کام کرتے کرتے ذہن اور زندگی دونوں تھکنے لگے تھے۔ مگر راشد کا غیر معمولی انداز اسے پتھر اگیا۔ دوران اداکاری نبھائے جانے والے کردار کے نام اور کہانی راشد کے دل و دماغ میں پیوست ہو چکے تھے۔ وہ اپنی ذات کا متلاشی بیوی کو بھی پہچاننے سے انکاری تھا۔ اسے وہ تمام باتیں بار بار یاد آرہی تھیں جو اداکاری کے دوران نبھائی گئی تھیں۔ وہ راشد نہیں تھا، وہ راشد ہی تھا۔ مگر اس وقت اس کا کردار اسے اپنی الگ پہچان کرانے سے انکاری تھا۔ اسے اپنا گھر بھی رسول نگر کی نئی آبادی والا یاد آرہا تھا۔ وہ ماں جو بواسیر کی مریضہ تھی جسے کبھی ٹھیک سے نیند نہیں آتی تھی۔ اس کے لیے متفکر رہتی تھی۔ وہ ایک کاپی رائٹر تھا۔ اور زرینہ اس کی محبت تھی۔ یہ سب معلومات وہ ایک اجنبی عورت کے منہ سے سن رہا تھا۔ جس نے رات کے اندھیرے میں اسے اپنی گاڑی میں لفٹ دی تھی۔ وہ پوچھنا چاہتا کہ وہ یہ سب کیونکر جانتی ہے؟ زرینہ سے ملاقات ہوئے اسے مدت گزر چکی تھی۔ نئی آبادی میں منتقلی کے بعد وہ اس سے کبھی نہیں مل پایا تھا۔ پھر یہ سب باتیں ایک اجنبی عورت کیسے جان سکتی ہے؟ اتنی پرانی باتیں وہ بھی جزئیات کے ساتھ وہ خود بھی بھول چکا تھا۔ یادوں کے سمندر میں کہیں دور زرینہ گم ہو چکی تھی۔ مگر نورین کے منہ سے یہ سب باتیں سن کر وہ تشکک میں مبتلا ہو گیا۔ شکوک و شبہات کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں غرق ہونا بنتا تھا۔ کیونکہ راشد آج بھی آصف مراد کے کردار میں سانس لے رہا تھا۔ وہ اپنے حال میں ہمیشہ کی طرح آج بھی نہیں لوٹا تھا۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان کے بقول:

> "اس کے سروکاروں میں انسان کی خارجی و داخلی شناخت۔۔۔ کا مسئلہ ہے۔ کس طرح انسان ایک خاص اہم منصب (اداکار) حاصل کرنے کے بعد ماضی کے دھندلکوں میں کھو جاتا ہے۔ ۔۔اور یہ سوچتا ہے کہ "میں اداکاری کرتا ہوں اور دوسروں کی زندگی کی اداکاری کرتا ہوں۔ میں خود کیا ہوں؟" یعنی کہ اس دوہری زندگی کا عذاب اس کے حواس پر غالب آجاتا ہے"۔ (۳۰)

راشد اپنے نبھائے جانے والے ہر نئے کردار کے ساتھ دنیا میں پہچانا جاتا تھا۔ آصف مراد کے کردار میں اس کی اچھوتی اداکاری کو اس قدر سراہنے پر جب تالیاں بجانے کے ساتھ ساتھ راشد کے نام کی صدائیں بلند ہوئیں تو وہاں سے ثنویت کا مسئلہ شروع ہوا۔ اسے زندگی ایک اندھے خلا کی مانند دکھائی دینے لگی۔ وہ اپنی شناخت چاہا رہا تھا۔ اپنا نام، اپنی ذات کی پہچان، دوسروں کی زندگیوں کو اداکای کے ذریعے جینے والا انسان اپنی ذات سے ناواقف تھا۔ وہ امین گل، آصف مراد اور راشد کے نام کی صدائیں لگائے بھاگ رہا تھا۔ اسے نہیں پتا تھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے اور

کہاں جانا ہے۔ بس وہ ایک لامختتم دائرے سے رہائی مانگ رہا تھا۔ دنیا اور میڈیائی دنیا کا شاید یہ سب سے بڑا راز تھا کہ اس دائرے میں ایک بار آنے والے کے لیے واپسی کی راہیں نہیں کھلتیں۔ وہ چیختا، چلاتا، بھاگتا، شور مچاتا رہتا ہے مگر واپسی کی راہیں مسدود ہو چکی ہوتی ہیں۔ کیونکہ دائرے کا کوئی اختتام نہیں ہوتا۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہمارے معاشرے کا ہر اداکار ایسی ہی نفسیاتی الجھن کا شکار ہے۔؟ اگر ہاں تو پھر کوئی بھی انسان اس رونق بھری دنیا کا حصہ بننے کو کبھی تیار نہیں ہو گا۔ کوئی تھیٹر میں نبھائے جانے والے کرداروں اور کٹھ پتلیوں کے کھیل تماشے دیکھ کر خواب نہیں بنے گا۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ راشد کے حالات اور کسی دوسرے فنکار کے حالات ایک سے نہیں تھے۔ راشد کے ساتھ نورین ایسے کسی نفسیاتی مسئلے کا شکار نہیں ہوتی۔ جس کا راشد ہوا۔ وجہ راشد کے گزشتہ حالات، راشد کی زندگی اگر عام انسان کی مانند گزرتی تو وہ کبھی اتنا اداکاری میں گم ہو کر کردار نہ نبھاتا کہ اپنی اصل کو بھول جائے۔ وہ جس معاشرے کا نمائندہ تھا، جانتا تھا کہ اگر ایک بار موقع ملنے پر اپنا آپ نہ منوایا یا تو کبھی دوبارہ یہاں نہیں آپائے گا۔ گزشتہ حالات اسے کردار میں محو کر کے اصل اس سے چھین لیتے تھے۔ اور اس چھینا جھپٹی میں وہ بہترین اداکار بن گیا۔ مگر جدید تقاضوں کے مطابق دائرے میں گھوم رہا ہے۔

طبقاتی تفریق اور بالادست طبقے کے ہاتھوں کمزور کا استحصال کوئی انہونی اور ان سنی بات نہیں۔ ازل سے چلتا یہ سلسلہ ابد تک جاری رہنے والا ہے۔ مرزا اطہر بیگ کا ناول "صفر سے ایک تک" سائنس اور ٹیکنالوجی کے سبب انسان کے نفسیاتی استحصال کو بیان کرتا ہے۔ ناول میں جہاں کسان اور دوسرے کمی کمین افراد طاقتور کے ہاتھوں ذلت کی زندگی گزارتے ہیں وہیں منشی عطاء اللہ خان کا خاندان بھی استحصال کی زد سے بچ نہیں پاتا۔ ذکا اللہ عرف ذکی فیضان سالار کا دوست اور ہم جماعت کے طور پر ناول میں متعارف ہوتا ہے۔ مگر تنگ دستی اور غربت اسے فیضان کا منشی بنا دیتی ہے۔ بلا کا ذہین اور جدید ٹیکنالوجی خاص کر کمپیوٹر پروگرامنگ کا ماہر ذکی اپنی طبیعت میں تجسس کا مادہ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ سالار خاندان کی تمام تر چال بازیوں کو کمپیوٹر میں فیڈ کرتا ہے اور پتا چل جانے پر عبرت کا نشان بنا دیا جاتا ہے۔

ذکی حسو دادا سے سالار خاندان کے ظلم و بربریت سے متعلق حقائق کو کمپیوٹر میں محفوظ کر کے انھیں "باؤلے شیطان، باؤلے فرشتے اور دکھ تماشا سکھ تماشا" کے نام سے محفوظ کرتا ہے۔ کمپیوٹر میں موجود ان تمام فائلوں کے ذریعے جہاں غریب طبقہ کی کسمپرسی کا احوال ملتا ہے۔ وہیں ذکی کی ذہانت اس کی زندگی اجیرن بنا دیتی ہے۔ "آرے ٹال تالے چابی" کا کھیلا جانے والا کھیل اسے نفسیاتی مریض بنا دیتا ہے۔ جیل کی سلاخوں میں

اس پر ہونے والے ظلم ہر جگہ محسوس ہونے لگتے ہیں۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے کہیں کسی بھی جگہ اسے بے ہنگم آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے بے اختیار ہو جاتا ہے۔ اس کا دماغ ماؤف ہونے لگتا ہے وہ اب عام انسان نہ رہا تھا۔ ذکاءاللہ کا کردار اگرچہ بنیادی اور مرکزی کردار ہے مگر اس کے علاوہ بھی متعدد کے کردار ایسے ہیں جن پر ظاہری ظلم کے ساتھ ساتھ ان کے باطن کو بھی گھائل کرنے کی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی ۔ان کے جذبات سے کھیل کر زندگی کے لمحات کو یادگار بنانا سالار خاندان کا پسندیدہ خاندانی مشغلہ تھا۔ اقتباس:

"ماکھا سالار (مختار سالار) یہ جو تھا تو انگریز زمانے کی بات ہے اب یہ کیا کرتا تھا کہ جب گورا صاحب نہر کے موگے دیکھنے آتا تھا تو اپنے چونا پھرے انگریزوں کو اس کے سامنے کھڑا کر دیتا تھا۔ مسلیوں کو ننگا کرا کے اوپر چونا پھیرا دیتا تھا۔ یہ تھے چونا پھرا انگریز۔ گورے صاحب بڑے ہنستے تھے اور ماکھے کی واہ واہ ہو جاتی تھی۔"(۳۱)

بالا دست طبقے کا ذرا دیر کو ہنسنا غریب کی کل حیاتی کا رونا بن جایا کرتا ہے۔ چونے کی کاٹ جہاں ان کے جسم پر زخموں کے نشان چھوڑ جاتی تھی۔ وہیں ننگا ہو کر کالے جسم کو گورا کر کے چونا پھرے انگریز کہلائے جانے پر ان کی روح کو گھائل کیا جاتا۔ اور طاقتور کا لمحہ بھر کا مذاق ہوتا۔ سالار خاندان کا ظلم صرف یہاں ختم نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس سے کہیں آگے جا چکا تھا۔ "ہر کمی کمین جو بیاہ کرے گا اس کے عورت پہلی رات سالار کے ساتھ سوئے گی۔"(۳۲)

سالار خاندان کی ایسی لرزہ خیز مثالیں پورے ناول میں کئی جگہوں پر موجود ہیں۔ خداد صلاحیت کی بنا پر کمپیوٹر پروگرامنگ میں مہارت رکھنے والا انسان غریب ہونے کی بناء پر امرا کے ہاتھوں نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔ امجد طفیل کے بقول:

"ناول میں "سالار" کے نام کی استعاراتی معنویت کو برتنے کی کامیاب کوشش ملتی ہے۔ ہر سالار اپنی فطرت میں بد طنیت استحصالی ہے۔ جو لوگوں کو اوزار کی طرح استعمال کرتا اور پھینک دیتا ہے۔ جبر کا نظام سب کو ایک چکی میں پیس رہا ہے۔"(۳۳)

"چینی جو میٹھی نہ تھی" صفدر زیدی کا ناول ہے۔ راج کا خواب اسے سکون کی نیند سونے نہیں دیتا۔ وہ ولندیزیوں کے دور میں جا کر اپنے آباؤ اجداد پر ہونے والے مظالم کو خواب کے ذریعے دیکھتا ہے۔ اور خواب

اس پر اس قدر سوار ہوتا ہے کہ وہ بھارتی سفارت کار پر حملہ کر کے نفسیاتی مریض قرار پاتا ہے۔ صفدر زیدی کا ایک اور ناول "بھاگ بھری" ذات پات، عورت کی مظلومیت اور مذہب کی آڑ میں حاصل کیے جانے والے مفاد کی کہانی ہے۔ "شہر مدفون" فتح محمد ملک کا ناول ایسے ہی حوالے پیش کرتا ہے۔ اس میں سیاست، معاشرت اور تاریخ کو ملا کر بیان کیا گیا ہے غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک شوہر بیوی کو بھائی کے ساتھ بانٹنے پر رضامند ہے "تم میرے بھائی کو بھی راضی کرو غربت کی وجہ سے میں اپنے بھائی کی شادی نہیں کر سکتا ۔اس کے لیے دوسری عورت لانے سے قاصر ہوں"۔ اس لیے ایک عورت ایک ہی وقت میں دونوں بھائیوں کو راضی کرتی ہے۔

حوالہ جات

1.Atiksan & Rita L.Introduction to Psychology, Har court Brace Jovanovich Publishers, New York, ۱۹۸۵, p:۱۳

۲۔ کلیم الدین احمد، تحلیل نسی اور ادبی تنقید، الفضل ناشران کتب لاہور، ۱۹۹۱ء، ص:۸

۳۔ ارون دھتی رائے، سرمایہ داریت، ریاستی جبر، اور مزاحمت، مترجم: امجد نذیر، ملتان، ۲۰۱۲، ص:۵

۴۔ شیراز دستی، محمد، ساسا، عکس پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۸، ص:۱۴۵

۵۔ ایضاً، ص:۱۲۷

۶۔ بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸، ص:۳۶

۷۔ ایضاً۔ ص:۱۸۴

۸۔ مستنصر حسین تارڑ، قربت مرگ میں محبت، ص:۸۷

۹۔ ایضاً، ص:۱۱۲

۱۰۔ ایضاً ص:۱۳۰

۱۱۔ ایضاً، ص:۳۴۵۔۳۴۶

۱۲۔ ایضاً، ص:۱۶۷

۱۳۔ نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۷، ص:۱۴۳

۱۴۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص:۵۳، ۵۲

۱۵۔ ایضاً، ص:۸۱

۱۶۔ ظفر اقبال، سرعام، گورا پبلشرز لاہور، ۱۹۹۵ء، ص:۱۷۱

۱۷۔ علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی، سانجھ پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۵، ص:۲۲۸

۱۸۔ ایضاً، ص:۲۸۶

۱۹۔ ایضاً، ص:۲۸۸

۲۰۔ یونس بٹ، کنجری کا پل، ص:۱۵۴

۲۱۔ ایضاً، ص:۱۳۷

۲۲۔ ایضاً، ص:۱۵۷

۲۳۔ مہرونہ لغاری، حسن منظر: ادبی خدمات، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۴، ص:۲۴۴

۲۴۔ حسن منظر، انسان اے انسان، شہرزاد کراچی، ۲۰۱۲، ص:۳۳۳

۲۵۔ ایضاً، ص:۳۳۸

۲۶۔ ثمینہ سیف، ڈاکٹر نسیم رحمان، ناول انسان انسان کا فنی و فکری جائزہ، مشمولہ: جرنل آف ریسرچ اردو ملتان، جلد ۳۶، شمارہ ۲، جولائی تا دسمبر، ۲۰۲۰، ص:۶۲

۲۷۔ روبینہ سلطان، تین نئے ناول نگار، دستاویز لاہور، ۲۰۱۲، ص:۲۳۴

۲۸۔ عاصم بٹ، محمد، دائرہ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۴، ص:۶۵

۲۹۔ ایضاً، ص:۷۹، ۷۸، ۷۷

۳۰۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، فکشن ہاؤس پبلشرز لاہور، ۲۰۱۲، ص:۱۱۴

۳۱۔ اطہر بیگ، مرزا، صفر سے ایک تک، سانجھ پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۲، ص:۳۴۹

۳۲۔ ایضاً، ص:۳۴۹

۳۳۔ امجد طفیل، پاکستانی اردو ناول اکیسویں صدی کی ابتدائی دہائی میں، مشمولہ: سہ ماہی، فکر و تحقیق، اپریل تا جون، شمارہ ۲۰، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی، ۲۰۱۶، ص:۲۹۰

باب پنجم

مجموعی جائزہ / نتائج / سفارشات

الف۔ مجموعی جائزہ:

خطہ ارضی پر انسان کا وجود بہت قدیم ہے۔ سرزمین خداوند کو آباد کرنے میں ابن آدم نے بڑا طویل سفر طے کیا۔ اس دوران وہ ویران جنگلوں، صحراؤں اور بے آب و گیاہ وادیوں میں بھٹکتا رہا۔ بھوک اور پیاس کی شدت سے پناہ کے یہ متلاشی ہر اس جگہ کو اپنا مسکن بنا لیتے ۔ جہاں زندگی کا امکان موجود ہوتا ۔پھر انسانی سوچ نے پلٹا کھایا اور اس کی طبیعت ٹھہراؤ کی جانب مائل ہونے لگی۔ ایک جگہ رک کر اسے زندگی کو بہتری کی جانب مائل کرنے کا خیال آیا۔ چنانچہ انسان نے عمدہ مرتبے پر فائز ہونے کی تمام کاوشیں اپنانا شروع کر دیں۔ پتھر کے آخری دور میں جب کہ عورتوں نے زمین سے اناج اگانے کا راز دریافت کر لیا تو شکار کی تلاش میں مارے مارے پھرنے والے مرد حضرات نے عورتوں کے ساتھ مل کر دریاؤں کے کنارے زرخیز زمین پر فصلیں اگانا شروع کیں۔ ایسے میں انسانی زندگی نے ترقی کر کے تنہائی سے گروہی زندگی کا روپ دھارا۔ قبائلی زندگی وجود میں آئی، رہنے کے لیے بستیاں بسانے کی ضرورت محسوس ہوئی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان بستیوں نے شہروں کا روپ دھار لیا اور اس طرح زرعی انقلاب کے ساتھ انسان کی تمدنی زندگی کا آغاز ہوا۔

انسانی تمدن کا آغاز تاریخی اوراق میں ابتدائی دور میں دریائے سندھ، نیل اور دجلہ و فرات کے میدانوں سے ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم مغربی عراق دنیا کی قدیم ترین انسانی آبادی کا گہوارہ تھا۔ اسی دور میں وادئ سندھ میں موہنجوڈارو کی تہذیب بھی اپنے عروج پر تھی۔ پانی کی کثرت کی بدولت تمام انسانی آبادیاں چونکہ دریاؤں کے کنارے آباد تھیں۔ اس لیے صحرائی اور ریگستانی حملہ آوروں سے بچاؤ کی خاطر فوجی دستے ترتیب دیئے گئے۔ جن کے سردار طاقت اور اختیار آنے کے بعد ریاست کے بادشاہ بنے۔ اور اپنے تمام کارندوں کے ساتھ مل کر استحصالی قوتیں بن گئیں۔ ہر عمدہ شے پر انھی کا حق ہوتا۔ حق ملکیت نے ابن آدم کی زندگی میں کہرام مچا دیا۔ 'میں اور میرا' نے سکون زندگی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

شخصی املاک کے تصور نے جس نے انسان میں خود غرضی، لوٹ مار، کینہ پروری جیسی منفی صفات پیدا کیں۔ اب کئی دنوں کی خوراک ذخیرہ کی جانے لگی۔ ذخیرہ شدہ خوراک اور شخصی املاک کے تصور کی بدولت کمتر وہ برتر کا تصور پیدا ہوا۔ اور پھر یہ منفی ترقی ہوتے

ہوتے ابن آدم حاکم و محکوم، آقا و غلام اور امیر و غریب کی بدولت معاشرتی سطح پر پہچانا جانے لگا۔

جنگلوں، غاروں اور صحراؤں میں بھٹکتا انسان اب تفرقہ بازی کی بدولت اپنی زندگی کو متعدد بکھیڑوں میں ڈال چکا تھا۔ ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے انسان نے جہاں اپنی زندگی کو بہتری کی جانب مائل کیا۔ وہیں مسائل اور مشکلات کو اپنا کر ایک دوسرے کا دشمن بن بیٹھا۔ دوسروں کی حق تلفی کر کے اپنی مراعات میں اضافہ کیا۔ اس کا معاشرتی سطح پر خود کو بڑا انسان بنانے کا خواب تھا۔ اور اس نے طاقت کے بل بوتے پر ایسا کیا بھی۔ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کا حق مارا، اور ان کا بھرپور استحصال کیا۔

انسانی زندگی کے ابتدائی دور کے معاشرے کو "اشتمالیت" کا نام دیا جاتا تھا۔ کیونکہ اس میں پورا معاشرہ برابری کے اصولوں پر قائم کیا گیا تھا۔ ذرائع پیداوار پر معاشرے کے سبھی افراد برابر ملکیت کا حق رکھتے تھے۔ یہاں 'میں اور میرا' کی طرز کے الفاظ کا کوئی وجود نہ تھا۔ انسانی تاریخ میں زرعی انقلاب کے ساتھ شخصی املاک کا تصور پیدا ہوا تو معاشرے پر دور رس منفی اثرات مرتب ہوئے۔ انسان میں مثبت کے بجائے منفی افعال نے پنجے گاڑھنا شروع کر دیے۔ اور بالآخر وہ بے پناہ مسائل میں گھرتا چلا گیا۔ محدود سطح سے شروع ہونے والی زیادتی کی کمیت کس قدر اپنا دائرہ پھیلا چکی ہے۔ جس نے انسانی زندگی کے تمام شعبہ ہائے میں اپنا دائرہ اس قدر وسیع کر لیا کہ آج انسانی زندگی میں سکون، امن وامان، آشتی اور محبت نام کے جذبے سوالیہ نشان بنے دکھائی دینے لگے۔

انسان فطری طور پر بے ضرر تھا۔ شخصی املاک سے قبل انسان نیک صفات کا مالک تھا غالبا "معصوم اور بھولا بھالا"۔ تب نفرت، لالچ اور خود غرضی اس کی ذات کا خاصانہ بنے تھے۔ وہ زمین پر اس وقت تک بے ضرر رہا، جب تک ذاتی تصور ملکیت نے اس کی زندگی میں جگہ نہ بنائی تھی۔ مگر جونہی ملکیت کا تصور ابھرا زندگی سے سکون جاتا رہا۔ بھاگ دوڑ کا بازار گرم ہوا۔ ایک مارنے کے لیے بھاگنے لگا تو دوسرا خود کو بچانے کے لیے۔

انسان پیدا ہی معاشرتی حیوان ہوا تھا۔ مل جل کر زندگی بسر کرنا اس کی فطری ضرورت تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایک ایسے معاشرے کا خواہشمند رہا۔ جہاں اس کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ مرد و عورت کو مساوی حقوق حاصل ہوں۔ امیر و غریب کی تفریق و تقسیم نہ ہو اور قانون کی نظر میں حاکم و محکوم کا کوئی تصور نہ ہو۔ قدیم اشتمالی معاشرہ کچھ ایسے ہی مناظر کو سامنے لاتا تھا۔ جب زندگی کی بنیادی ضروریات میں قبیلے کے سبھی افراد شامل ہوتے۔ انفرادی حصول املاک کا کوئی تصور نہ تھا۔ پھر جب انسانی زندگی نے پلٹا کھایا۔ اور قدیم غیر طبقاتی نظام سے نکل کر خاندان، جائیداد اور ریاست کی تکون میں قدم رکھا گیا۔ تو جہاں اعلی وادنی کا تصور قائم ہوا

،وہیں شخصی املاک کے تصور نے بھی جنم لیا۔اور شخصی املاک کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لیے اپنے جیسے دوسرے افراد کا استحصال کیا جانے لگا۔ حصول املاک کے جنون سے انسان میں وحشیانہ جذبات نے جنم لیا۔ اس میں حصول خواہش نے ظلم و ستم، جبر واستبداد، لوٹ کھسوٹ، قتل وغارت، لالچ اور حسد جیسے کئی تخریبی جذبات کو اکسایا۔ جس کے نتیجے میں محنت کشوں اور کمزوروں کے لیے یہ دنیا دوزخ کا ایندھن بن گئی۔ جس کی تپش میں روزافزوں اضافہ ہونے لگا اور انسانی طبقات میں سے کوئی بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔

تاریخ گواہ ہے کہ مثبت انسانی حالات نے اس کی ذہنی صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں سد اہم کردار ادا کیا ہے۔ حالات ہمیشہ ایک سے کبھی نہیں رہے۔ اسی بنا پر شخصی املاک جب انسان کے جملہ مسائل کا سبب بنی۔ تو اس میں تبدیلی کے خواہش مند دماغ بھی منظر عام پر آنے لگے۔ ریاستی ملکیت کو ذاتی ملکیت کا بدل مانا جانے لگا ۔اور اس بات پر زور دیا گیا کہ انسان کی بنیادی ضروریات واحتیاجات کو پورا کرنے کی ذمہ داری عوام کی بجائے حکومت وریاست پر عائد ہوتی ہے۔ اس لیے یہ ریاست پر منحصر ہے کہ وہ اپنی عوام کو کیسی زندگی مہیا کرتی ہے۔ نتیجتاً ایک نیا معاشی نظام ترتیب دیا گیا۔ جس کے مطابق پیداوار کے سبھی وسائل پر عوام قابض ہوں گے اور پیداوار کی تقسیم منصفانہ ہونے کی بنا پر ہر شخص کو اپنی صلاحیتیں اجاگر کرنے کا موقع ملے گا۔ نتیجے کے طور پر انسانی زندگی مثبت تبدیلی کی جانب قدم بڑھاتی جائے گی۔

کارل مارکس نے ۱۸۴۸ء میں اپنا انقلابی منشور پیش کیا۔ جس کے تحت دنیا بھر کے محنت کشوں کو متحد ہو کر سرمایہ داروں کے خلاف سینہ سپر ہونا تھا۔ کارل مارکس کے دلائل سے اس راز پر سے پردہ فاش ہوا کہ مزدور کی محنت سے جو زائد پیداوار سامنے آتی ہے، وہی اکٹھی ہو کر سرمایہ داروں کی دولت بن جاتی ہے۔ اور اسی دولت کے زعم میں انسانی زندگی کی قدر کو ناقدری میں بدل کر ان کا بھرپور استحصال کیا جاتا ہے۔ کارل مارکس اور اینجلز کے اس مثبت عمل کو لینن اور موزے تنگ نے آگے بڑھایا۔ جس سے چین اور روس جیسے ممالک میں انقلاب برپا ہوئے۔ جس سے تاریخ عالم میں ایک نئے اور درخشاں دور کا آغاز ہوتا دکھائی دیا۔

کیونکہ پیداوار سے حاصل ہونے والی آمدنی محنت کشوں کی کوششوں سے حاصل ہوتی تھی ۔جبکہ محصول میں ان کا حصہ آٹے میں نمک کے برابر رکھا جاتا تھا۔ اس لیے نیا نظام متعارف کرانے سے شخصی املاک کے خاتمے کا عندیہ دیا گیا۔ تمام قسم کا منافع عوام میں تقسیم کیے جانے کی بات کی گئی۔ سب کچھ انسانی سوچ کے مطابق ہوتا دکھائی دینے لگا۔ مگر ایسا کیسے ممکن ہے ؟ کہ تخریب کاری کا عمل ہمیشہ کے لیے دنیا سے ناپید ہو جائے۔ سب اچھے کا تصور بڑا سحر انگیز ہوتا ہے۔ مگر سب اپنے کا تصور اس سے بھی زیادہ دل کو مسحور کرنے والا

ہوتا ہے۔ اور اسی تصور نے انسانی ذہن میں وقتی نیند سے بیداری کی جانب سفر کیا۔ تو وہ بھیڑ کا شکار کرنے والا بھیڑیا بن گیا۔ وہ ان تمام لوگوں کو عتاب کا نشانہ بنانے لگا۔ جو محنت کشوں کو ان کے آہنی شکنجے سے آزاد کرنے کی بات کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سسٹم کو بدلنے کے لیے پہلے اس کا حصہ ہونا پڑتا ہے۔ تبھی آپ اپنی ساکھ کو بچا سکتے ہیں۔ دوسری صورت میں اپنے نظام کو دوسروں پر لاگو کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس آئیڈیل زندگی کا تصور نئے نظام کی بدولت دیا گیا۔ اس میں صاحب ثروت کی ذات خطرے میں گھرتی چلی جارہی تھی۔ اس لیے وقتی خاموشی اختیار کرنے کے بعد پھر سے بیداری کی جانب بڑھے اور تبدیلی کے نظام کو اپنا کر عوام کا استحصال کرنا شروع کر دیا۔ نیا نظام متعارف کرانے والے شخصی املاک کے خاتمے پر کمر باندھے ہوئے تھے ۔ جبکہ دوسری جانب صاحب ثروت آج بھی شخصی املاک کو بحال کرنے کی کوششوں میں سرگرداں تھے۔ بالآخر جیت طاقتور کی ہوئی، ہونی بھی اسی کی تھی۔

تاریخی حقائق پر نگاہ دوڑائی جائے تو پتا چلتا ہے کہ دولت کی خواہش خاندانی اقبال پر غالب آئی تو شرفا کے کئی گروہ سامنے آئے۔ ایسے لوگ جو طاقت اور دولت میں بڑے تھے زیادہ تر شہروں میں پیدا ہوئے۔ تجارتی راستوں کے ساتھ ساتھ سکونت اختیار کی ۔ اور کل مال تجارت کو اپنے تصرف میں رکھا۔ طاقتور طبقہ دولت کے ساتھ ساتھ انسانی تقدیر پر بھی غالب آنے لگا۔ انھوں نے جمہوریت پسندی کی آڑ میں لوگوں کے ساتھ جھوٹے وعدے کیے جو کبھی وفا نہ ہوئے۔ استحصالی طبقہ کی ذہنی چالاکی تھی کہ وہ قانونی بالادستی کا نعرہ لگاتا تھا۔ جس کے پس پردہ اس کا ذاتی مفاد تھا۔ وہ امن پسندی کے داعی تھے، تاکہ استحصالی نظام قائم رہے۔ تجارتی راہیں کھلی رہیں، فنون لطیفہ میں ترقی کی رفتار بڑھے۔ اور عوام کسی صورت بغاوت نہ کرے۔ اس لیے استحکام ضروری قرار پایا اور استحکام کے لیے قانون سازی اور ضوابط کی کارفرمائی عمل میں لائی گئی۔ مختصر دونوں طرف سے مفاد استحصالی قوتوں کا سامنے آیا۔ یہاں تک کہ انسانی تہذیب و معاشرت کی ترقی کے ساتھ ساتھ استحصالی قوتیں بھی ترقی کرتی چلی گئی۔

دنیائے انسانی پر قدیم تہذیب سومیری ہے اس حوالے سے دنیا کے نقشے پر جو معاشرتی زندگی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے مطابق زمین کی زرخیزی معلوم کرنے میں عورت نے پہلا قدم اٹھایا۔ اس کے بعد زمین کو باقاعدہ زراعت کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ اس دور میں تمام امور کی مالک عورت تھی۔ پھر حالات بدلے تو مرد کی بالادستی قائم ہوئی انسانی معاشرتی زندگی ترقی کی راہ پر گامزن ہونے لگی ۔ جاگیرداری نظام قائم ہوا ۔ جاگیرداری نظام نے قدیم غلام داری نظام کو فروغ دینے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ جاگیرداری نظام جب اپنی

آب و تاب کے ساتھ دنیا کے تمام کونوں میں جلوہ گر ہوا تو غریب کسان کی حالت کا کوئی پرسان حال نہ تھا ۔زمین کو ذرخیز کرنے میں انسانی کئی زندگیاں طاقتور کے ہاتھوں بنجر ہونے لگیں۔جب حکومت صرف محصول کے چکر میں پڑی تو سالانہ ریونیو نے آہستہ آہستہ جاگیر داری نظام کو کمزور کر دیا۔بالآخر صنعت کار آپس میں اتفاق کر کے کارخانے قائم کرنے لگے۔تو سرمایہ داری نظام متعارف ہوا۔

سرمایہ داری نظام کی بدولت دیہی سے شہری زندگی کی جانب رجحان بڑھا۔سرمایہ داری نظام نے ایسا گنجلک جال بچھایا، جس میں مزدور طبقہ ایسا پھنسا کہ کبھی نکل نہ پایا۔سرمایہ دار کا لگایا ہوا گول دائرہ انسان کو گول گول گھمار رہا ہے۔مگر وہ وہاں سے باہر نہیں آسکتا۔

انسانی زندگی میں استحصالی قوتوں کے عزائم کو دنیائے ادب کے قلم کاروں نے اپنی تحریروں میں بیان کیا۔مقصد عوامی شعور کی بیداری تھا۔ان تمام لکھنے والوں نے طاقتوروں کے آہنی شکنجے سے مجبور عوام کو رہائی دلانے کی سعئی کی۔نتیجے کے طور پر تاریخ میں کئی عظیم انقلاب آئے۔جن میں انقلاب فرانس اور انقلاب روس خاص قابل ذکر ہیں۔مارکس کے بتائے گئے فلسفہ زندگی نے دنیا کے ہر کونے میں تبدیلی لائی۔مارکسی منشور ہندوستان میں بھی تبدیلی کا باعث بنا۔۱۸۵۷ میں ہندوستان بٹا تو پاکستان کا قیام عمل میں لایا گیا۔

۱۸۵۷ء کا دور ہندوستانی تاریخ میں انقلاب کا دور مانا جاتا ہے اس میں ایک جانب جنگ کے سبب انسانی حقوق کا برملا اظہار ہوا تو دوسری جانب ادب میں نت نئے موضوعات اور انواع میں تنوع دیکھنے کو ملتا ہے ۔برصغیر پاک و ہند کی فضا غدر کے ہنگامے کے بعد انتشار و تشدد میں لپٹی دکھائی دیتی ہے۔۱۸۵۷ء سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے ابتدائی دور تک کا طائرانہ جائزہ لیا جائے تو حالات کافی غیر یقینی صورت میں سامنے آتے ہیں۔معاشرتی سطح پر کئی مسائل انسانی زندگی کا حصہ بنے،سیاسی تاریخ کا دور بھی خاصا ہنگامہ خیز رہا۔قبل از تقسیم مقامی سطح پر پاکستان بننے کی تحریکوں، تقسیم کے فسادات،مسئلہ کشمیر،۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ، سقوط ڈھاکہ اور اس طرح کے متعدد مسائل نے انسانی زندگی میں تلاطم برپا کیا۔مقامی کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر ظہور پذیر ہونے والے واقعات بھی پریشان کن صورتحال پیش کرنے میں مددگار ثابت ہوئے۔جن میں جنگ عظیم اول و دوم اور انقلاب روس جیسے واقعات نے انسانی زندگی کو تباہی کے دہانے لا کھڑا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

ملکی و بین الاقوامی دونوں سطحوں پر پھیلے انتشار کے دور میں پاکستان کا قیام عمل میں آنا،اگرچہ جمہوری ملک ہونے کی بنا پر انسانی حقوق کا پاسبان تھا۔مگر یہاں کی سرزمین پر بھی انسان بستے تھے۔ایسے انسان، جن میں

ذاتی خود غرضی ، منافقت، لوٹ کھسوٹ ، جھوٹ ،مکر و فریب جیسی خصلتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ انہی عادات و خصائل نے یہاں کے نظام کو بہتری کی جانب مائل نہ ہونے دیا اور مثبت ترقی کی بجائے منفی رویے پروان چڑھنے لگے۔ ایسے حالات میں ادیب اپنے افکار و خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کے لیے میدان عمل میں اترے۔

پاکستان بحیثیت جمہوری ملک عوام کے حقوق کا پاسدار تھا۔ تقاریر ،وعدے ، باتیں سب ایسی تھیں کہ زمین کا ٹکڑا جو مذہب کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔ اس میں تمام مذہبی امور کو ملحوظ خاطر رکھا جائے گا۔ مگر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ حقائق ناقابل یقین حد تک خراب دکھائی دیے۔ ملکی سطح پر دولت کی غیر مساویانہ تقسیم امیر طبقہ اور غریب کی کسمپرسی ایسا ہی تھا جیسا کہ ہندوستان میں دیکھتے آئے تھے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا قانون ادھر بھی دیکھنے کو ملا۔

ملکی سطح پر پھیلی ناعاقبت اندیشی اور ظلم و جبر کی اس کیفیت میں گھٹ کر مرنے والی انسانیت کو اگر کوئی کندھا دینے پہنچا تو وہ ادیب تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ کسی بھی قسم کے دورو حالات کی تمام تر سفاکیوں ، ظلم و استبداد کے روح فرسا واقعات اور انسانیت کش قوتوں کے خلاف اگر کوئی سینہ سپر ہو کر کھڑا ہوا تو وہ ادیب تھا۔ معاشرے کا بہترین نبض شناس ہونے کی بنا پر اس نے قلم کے زور پر انسانی اقدار اور بقا کے تحفظ کے لیے ہمیشہ صدا بلند کر کے حالات میں تبدیلی لانے کی سعئ کی۔ناول چونکہ انسانی زندگی کے حقائق کا ترجمان ہوتا ہے۔اس لیے ادیب نے بھی زندگی کے حقائق سے نگاہیں دوچار کرنے کے لیے ناول کی طرز اپنائی۔

ہجرت کے ساتھ ہی فسادات کا دور شروع ہوا۔ جن کی صورت میں جنم لینے والے انسانیت سوز المیے کو ناول میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا۔ قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور ،ایم اسلم، نسیم حجازی، شوکت صدیقی، عبداللہ حسین اور انتظار حسین کے نام اس حوالے سے خاص قابل ذکر ہیں۔ فسادات کے دور سے نکلے تو مارشل لا اور جمہوریت کا آنکھ مچولی والا کھیل شروع ہوا۔ اس میں بھی استحصال عوام کا ہی دکھائی دیا۔ ناول نے حالات کے مطابق اپنا سفر جاری رکھا۔ پاکستانی ناول نگار حالات کے مڑتے موڑ کے ساتھ ناول میں نئے موضوعات میں تنوع لاتے رہے۔

سقوط ڈھاکہ پاکستانی تاریخ کا دل دہلا دینے والا واقعہ تھا۔ پاکستان غلط فہمیوں کی نظر ہوا، اور دو ٹکڑے ہو کر الگ ملک بنگلہ دیش بن گیا۔ اس تکلیف دہ واقعہ کو ادیبوں نے اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ گردوپیش کے

حالات کے پس پردہ محرکات کو علامتی اور تجریدی انداز میں بیان کیا گیا۔ قابل ذکر ناموں میں انور سجاد، انیس ناگی اور مستنصر حسین تارڑ کے نام شامل ہیں۔

اکیسویں صدی میں پاکستانی ناول کے سفر کا جائزہ لیا جائے تو بیسویں صدی جس طرح افسانے کی تاریخ میں اہم مانی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح اکیسویں صدی کا ظہور ناول کی پیدائش میں بڑا مثبت ثابت ہوا۔ اکیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں بیش بہا ناول منظر عام پر آئے۔

دوران تحقیق انسان کا سیاسی، سماجی، معاشی اور نفسیاتی استحصال پاکستانی اکیسویں صدی کے اردو ناول کے تناظر میں "کا جائزہ لینے سے جو معلومات ملی ہیں۔ ان کے مطابق حالات آج بھی گزشتہ صدیوں سے زیادہ بدلے دکھائی نہیں دیتے۔ تبدیلی اگر آتی بھی ہے تو منفی صورتحال لے کر مثبت کا ظہور شاید اب ناپید ہو چکا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کا ناول "قربت مرگ میں محبت "ہمہ وقت نفسیاتی، سماجی اور معاشی سطح پر انسانی استحصال کو بیان کرتا ہے۔ انسان محبت کا متلاشی مرتے دم تک رہتا ہے۔ 'پکھی' کا کردار آج بھی قاری کو رک کر سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ غریب عورت آج بھی اپنا جسم بیچ کر گھر کی ضرورت پوری کرتی ہے۔ مرد سب جانتا ہے وہ کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ بھوک مٹانا ان کی مجبوری ہے۔ انھیں زندہ رہنا ہے اور زندہ رہنے کے لیے خوراک چاہیے جسے حاصل کرنے کے لیے پیسہ بہت ضروری ہوتا ہے۔ ناول "دائرہ "انسانی استحصال کی انوکھی داستان رقم کرتا ہے۔ انسان ٹیکنالوجی کے دور میں ایک دائرے میں گھوم رہا ہے اور باہر جانا چاہے تو جا نہیں سکتا جو ایک بار اس میں آیا اس کی واپسی ناممکن ہے۔ عمدہ کام اور مقام کی طلب میں اپنی ذات کو کردار میں گم کرنے والا انسان اپنی شناخت سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

محمد الیاس کا ناول "کہر "انسانی استحصال کی تاریخ میں کافی اہم ناول ہے۔ اس میں مذہبی عقائد اور انسانی خواہشات کا نقشہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ "برف "پاکستانی سماج میں عورت کی بے بسی کو بیان کرتا ہے۔ کہ آج اکیسویں صدی میں بھی عورت اپنے مذہب کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق زندگی کا فیصلہ کرنے سے قاصر ہے۔ مرد کی حاکمیت والے معاشرے میں عورت کی فریاد سننے والا کوئی نہیں۔ "بارش "جنوبی پنجاب کے تناظر میں لکھا گیا ناول ہے۔ جہاں جاگیر دار طبقہ چوہڑے، مسلی اور کمیوں کی عورتوں کو اپنی عیاشی کے لیے جائز تصور کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں وڈیروں کی عیاش طبیعت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔

"گرد باد" عاطف علیم کا ناول ہے۔ جس میں غربا کے ساتھ ساتھ طوائف کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ملک فلانہ اور ملک ڈھمکانہ کی آپسی جنگ میں کوئی پسا تو وہ موجو موچی اور شمو کنجری تھے۔ ملکوں کی دی گئی اذیت سے شمو ذہنی مریض بن کر اپنے شوہر کو اس کے جائز حقوق سے محروم رکھتی ہے۔ مرزا اطہر بیگ "غلام باغ" کے خالق کی حیثیت سے اردو ناول میں کافی مشہور نام ہے۔ اس کے علاوہ ان کے "ناول صفر سے ایک تک "اور" حسن کی صورتحال" بھی اکیسویں صدی کے ناولوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ "صفر سے ایک تک" میں سائبر سپیس کے حوالے سے انسان کا نفسیاتی اور سماجی استحصال بیان کیا گیا ہے۔

طاہرہ اقبال بیسویں صدی کی آخری دہائی میں اردو افسانے کی دنیا میں متعارف ہوئیں۔ لیکن "نیلی بار" ان کا پہلا ناول ہے جو اکیسویں صدی کی تاریخ کا حصہ بنا۔ انھوں نے اس ناول کے اندر سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی غرض ہر قسم کے استحصالی حوالے دیئے ہیں۔ "بار کے رنگوں" کے نام سے جنوبی پنجاب کی روایات اور شادی بیاہ کی رسومات کو بیان کیا ہے۔ "نیرنگی سیاست" کے نام سے ملک کے اندر ہونے والے سیاسی مسائل کے جوڑ توڑ میں انسانی استحصال کو بیان کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ جتنے بھی باقی موضوعات آتے ہیں ان میں سیاست اور مذہب کی آڑ میں انسان کا دوسرے انسان کے ہاتھوں استحصال دکھایا گیا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اکیسویں صدی پاکستانی اردو ناول کے معاملے میں کافی زرخیز ثابت ہوئی ہے۔ کئی نئے پرانے لکھنے والے ناول کی تاریخ کا حصہ بنتے دکھائی دیتے ہیں۔۔ انسانی زندگی میں دولت کے ارتکاز نے استحصال کو جنم دیا۔ انسان نے جب ملکیت کا پہلا دعویٰ کیا تو استحصال کی ابتدا ہوئی۔ پاکستانی اردو ناول میں جن اسباب / محرکات کے تحت انسان کا استحصال ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اس میں زیادہ تر دولت کا تصرف ہے۔ ایک انسان کی دولت کے اوپر مکمل دسترس حاصل کرنا اور دوسرے کو اس سے محروم رکھنا۔ ملکی سطح سے لے کر بین الاقوامی سطح تک کے جو مسائل انسانی استحصال کا موجب بن رہے ہیں پاکستانی اردو ناول کے تناظر میں اگر بات کی جائے تو سبھی کا تعلق کہیں نہ کہیں دولت اور مرتبہ سے جڑا دکھائی دیتا ہے۔

ابتدا میں تنہا زندگی بسر کرنے والا انسان جب اپنی احتیاجات کی تکمیل کے لیے انفرادیت سے اجتماعی زندگی کی جانب میلان کرتا ہے۔ تو نتائج کافی لرزہ خیز صورت میں سامنے آتے ہیں۔ یہ اجتماعی زندگی کافی دہلا دینے والی تھی۔ استحصالی قوتیں پروان چڑھنے لگیں۔ محکوم طبقہ پر ظلم و بربریت کے تمام ہتھیار آزمائے جانے لگے۔

"استحصال" کا لفظ سب سے پہلے کارل مارکس نے معاشیات کی اصطلاح کے طور پر متعارف کرایا۔ مگر جدید دور میں اس کا دائرہ کار وسیع ہو چکا ہے۔ دولت اور معیشت سے باہر یہ اپنا گھیرا پھیلا چکا ہے۔ جس نا انصافی، تشدد اور ظلم کی انتہا دولت کی غیر مساویانہ تقسیم سے شروع ہوئی تھی۔ اب وہ زندگی کے ہر شعبے میں دکھائی دیتا ہے۔ معاشرتی، معاشی، سیاسی، مذہبی، نفسیاتی غرض ہر جگہ استحصالی قوتیں اپنے اپنے انداز میں انسان کے حقوق پامال کر کے اس کا استحصال کر رہی ہیں۔ اعلیٰ وادنی کے تصور میں دیکھا جاتا رہا کہ ہمیشہ طاقتور کمزور کو اپنا تختہ مشق بناتا ہے۔ مگر دوران تحقیق جو بات دیکھی گئی وہ یہ کہ استحصال کا دائرہ امیر اور غریب سے آگے نکل کر سامنے آتا ہے۔ جہاں صاحب ثروت غرباء پر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے استحصال کرتا ہے۔ تو وہیں اس کا ہم پلہ اپنے مقام و مرتبے کو سربلند رکھنے کے لیے اپنے برابر شخص کو استحصال کا نشانہ بناتا ہے۔ دونوں کا تصرف طاقت اور دولت کا نشہ حاصل کرنا ہے۔

ب۔ نتائج:

اکیسویں صدی کے پاکستانی اردو ناول میں انسانی استحصال کا تنقیدی مطالعہ میں دوران تحقیق جو سوالات زیر غور رہے ان کے نتائج بعد از تحقیق اس طرح سامنے آتے ہیں۔

- اردو ناول میں ابتدا ہی سے استحصال کی پیش کش کی جاتی رہی ہے۔ اکیسویں صدی کے منتخب پاکستانی اردو ناولوں میں معاشرتی و سیاسی استحصال کا جائزہ لینے کے بعد استحصال کی کئی صورتیں سامنے آتی ہیں ۔ان میں طبقاتی تفریق، کی بدولت معاشرے میں پھیلی ناانصافی، غریب طبقے کی جدوجہد، اور عورتوں یا اقلیتوں کے ساتھ ناروا سلوک کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ دوران تحقیق دیکھا گیا کہ طبقاتی تفریق کی بدولت اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والا انسان اپنے سے کمزور کا استحصال کرتا ہے۔ ذات میں کمتر انسان اپنی خودداری کی بدولت بھی ذلیل کیا جاتا ہے۔ خاندانی تعلقات معاشرتی سطح پر انسان کی پہچان کا باعث بنتے ہیں۔ ناول کے تناظر میں رشتے جہاں پیار و محبت سے پروان چڑھتے ہیں وہیں اقتدار اور دولت کی ہوس میں ان کا استحصال بھی سامنے آتا ہے۔ باپ ،بیٹی کے مرنے پر شکر ادا کرتا ہے کہ اس کی دولت تقسیم ہونے سے بچ گئی۔ بیٹا اقتدار کے حصول میں باپ

کورکاوٹ مانتے ہوئے اس کا قتل کر دیتا ہے۔ناول "نیلی بار"اور "گرد باد"اس حوالے سے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

- معاشی سطح پر انسانی استحصال کا جائزہ دو نظاموں جاگیر داری اور سرمایہ داری نظام کے تحت اردو ناول کے تناظر میں لیا گیا ہے۔ جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے تحت غریبوں کے حقوق کی پامالی کے حوالے سے پاکستانی اردو ناول میں متعدد مواد ملتا ہے۔ دوران تحقیق دیکھا گیا کہ دولت کی طاقت جس طبقہ کے ہاتھ آجائے وہ ہی بالاتر ہو کر دوسروں کا استحصال کرتا ہے۔"بھاگ بھری"ناول کے تناظر میں جہاں استحصالی طاقتیں جاگیر دار کے روپ میں بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ باندھ کر ایک عام انسان کا استحصال کرتے ہیں تو وہیں "سرخ تیل"میں سرمایہ دارانہ نظام میں اسے کم اجرت دے کر غربت کی چکی میں پسنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔کام کے اوقات کے عوض انھیں مزدوری اس لیے نہیں دی جاتی کہ پیٹ کی بھوک نہ مر جائے۔استحصالی طاقتیں کمزور انسان کو بھوک مٹانے کے چکر میں الجھائے رکھنا ضروری تصور کرتی ہیں۔

- نفسیاتی استحصال میں فرد کو ذہنی دباؤ، جذباتی زیادتی و داخلی تضادات میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ تحقیق کے دوران ناولوں میں انسانی جذبات اور نفسیاتی کشمکش کے بعد انسان کے ہونے والے استحصال کو بیان کیا گیا۔ دوران تحقیق دیکھا گیا ہے کہ ناول "نو لکھی کوٹھی"میں حکمران طبقہ اپنی طاقت کو برقرار رکھنے کے لیے لوگوں کی ذہنیت اور نفسیات پر کنٹرول حاصل کرتا ہے۔ جس سے انسان میں خوف، عدم تحفظ، اور ناامیدی کو فروغ دے کر اس کا نفسیاتی استحصال کیا جاتا ہے، جس کے ذریعے حکمران اپنے استحصالی نظام کو برقرار رکھتے ہیں۔ "طاؤس فقط رنگ "اور "قربت مرگ میں محبت "نفسیاتی مسائل کی بدولت کردار کئی نفسیاتی امراض کا شکار ہو جاتا ہے جو معاشرتی سطح پر نفسیاتی استحصال کا باعث بنتے ہیں۔

ج۔ سفارشات

"پاکستانی اردو ناول کے تناظر میں انسانی استحصال کے تنقیدی مطالعہ " کے دوران میری تحقیقی کوشش رہی ہے کہ ادب اور استحصال کی صورتوں کا باہمی تعلق قائم ہو سکے۔ اور ناول کے تناظر میں استحصال کی جتنی بھی صورتیں معاشرے میں رائج ہو کر انسانی شخصیت کے بگاڑ کا باعث بنتی ہیں انھیں بیان کرنے کی سعیٔ کی ہے۔ ناول اور اس کے حوالے سے مختلف پہلوؤں پر جن موضوعات کو مزید تحقیق کا حصہ بنایا جا سکتا ہے۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

- بیسویں اور اکیسویں صدی کے اردو ناولوں میں استحصال کا تقابلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔
- پاکستان اور بھارت میں تحریر کردہ ناولوں کو موضوعاتی سطح پر مطالعہ تحقیق کا حصہ بنایا جا سکتا ہے۔
- نفسیاتی مسائل کی وجہ سے پیدا ہونے والی امراض کو اردو ناول کے تناظر میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

پاکستانی اردو ناول میں انسانی استحصال کے تنقیدی مطالعہ کے بعد سماجی اداروں اور این جی اوز کو دی جانے والی سفارشات:

چند سفارشات جن پر عملدرآمد کی بدولت استحصال کو معاشرے سے کم کر کے بہتری کی جانب گامزن کیا جا سکتا ہے:

- این جی اوز اور سماجی ادارے تعلیم کو عام کرنے کے لیے فعال کردار ادا کریں، خصوصاً دیہی علاقوں میں جہاں تعلیمی سہولیات کا فقدان ہوتا ہے۔ تعلیم کے ذریعے عوام میں انسانی حقوق اور استحصال سے متعلق آگاہی پھیلائی جائے تاکہ وہ اپنے حقوق سے واقف ہو کر ان کا دفاع کر سکیں۔
- نجی سطح پر ہنر سکھانے کے پروگرام شروع کیے جائیں۔ روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے لیے حکومت، سماجی ادارے اور این جی اوز مشترکہ طور پر کام کریں تاکہ غربت کا خاتمہ ہو اور لوگ مالی دباؤ کی وجہ سے استحصال کا شکار نہ ہوں۔

- معاشرے میں خواتین، بچوں اور کمزور طبقوں کی حمایت کے لیے قوانین پر عملدرآمد یقینی بنانے کی ضرورت ہے۔ استحصال کے شکار افراد کو قانونی معاونت فراہم کرنے کے لیے این جی اوز کو بہتر انتظامات کرنے چاہئیں۔ گھریلو تشدد، جبراً شادی، اور جنسی طور پر ہراساں کرنے کے مسائل کو اجاگر کرتے ہوئے متاثرہ خواتین کی بحالی کے لیے مخصوص پروگرامز شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ بچوں کی مزدوری اور جنسی استحصال کو روکنے کے لیے این جی اوز کو مؤثر پالیسیاں وضع کرنی چاہیے۔ بچوں کی تعلیم اور بحالی کے پروگراموں کا آغاز کیا جائے تاکہ ان کو استحصال سے محفوظ رکھا جاسکے۔
- استحصال کے مختلف پہلوؤں پر آگاہی مہمات چلائی جائیں تاکہ عوام کو اس مسئلے کی سنجیدگی کا احساس ہو۔ میڈیا اور دیگر ذرائع استعمال کرتے ہوئے انسانی استحصال کے خلاف مہمات کو فروغ دیا جائے۔
- این جی اوز اور سماجی ادارے نفسیاتی مدد فراہم کرنے کے لیے خدمات سرانجام دیں تاکہ استحصال کے شکار افراد کو جذباتی اور ذہنی طور پر آرام دہ ماحول میسر آسکے۔
- حکومت کے ساتھ مل کر این جی اوز کو انسانی استحصال سے متعلق قوانین اور پالیسیوں میں ترامیم کی سفارش کرنی چاہیے تاکہ استحصال کو کم کیا جاسکے۔
- مقامی سطح پر کمیونٹی سینٹرز کا قیام، جہاں استحصال کا شکار افراد پناہ لے سکیں اور ضروری وسائل حاصل کر سکیں۔
- ملکی اور بین الاقوامی سطح پر دیگر اداروں کے ساتھ تعاون کو فروغ دیا جائے تاکہ انسانی استحصال کے مسائل کو عالمی سطح پر بہتر طریقے سے حل کیا جاسکے۔

درج بالا سفارشات سماجی اداروں اور این جی اوز کو پاکستانی معاشرتی مسائل اور انسانی استحصال کے خاتمے کے لیے مضبوط حکمت عملی بنانے میں مدد دے سکتی ہیں۔

کتابیات

بنیادی ماخذ

- اطہر بیگ، مرزا، صفر سے ایک تک، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲
- اعجاز احمد فکرال، سرخ تیل، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۱۸
- بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۸
- حسن منظر، العاصفہ، شہر زاد پبلشرز کراچی، ۲۰۰۶
- حسن منظر، انسان اے انسان، شہر زاد پبلشرز کراچی، ۲۰۱۳
- حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، شہر زاد کراچی، ۲۰۱۲
- حمید شاہد، محمد، مٹی آدم کھاتی ہے، اکادمی بازیافت کراچی، ۲۰۰۷
- خالد طور، بالوں کا گچھا، آج، کراچی، شمارہ نمبر ۷۲، ۲۰۱۲
- خالدہ حسین، کاغذی گھاٹ، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد، ۲۰۰۲
- شیراز دستی، محمد، ساسا، عکس پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۸
- صفدر زیدی، بھاگ بھری، عکس پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۸
- طاہرہ اقبال، نیلی بار، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد، ۲۰۲۰
- عاصم بٹ، محمد، دائرہ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۴
- عاطف علیم، محمد، گردباد، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۷
- علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی، سانجھ پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۵
- محمد الیاس، کہر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہوار، ۲۰۱۵
- مستنصر حسین تارڑ، دیس ہوئے پردیس، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۵
- مستنصر حسین تارڑ، قربت مرگ میں محبت، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۹
- مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، سنگ میل پبلی کیشنز اسلام آباد، ۲۰۰۸
- مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۳
- نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۷

- یونس جاوید، کنجری کاپل، جمہوری پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۱

ثانوی ماخذات

- احسن فاروقی، ڈاکٹر، سنگم، س۔ن
- ارتضٰی کریم، اردو ادب میں احتجاج اور مزاحمت کے رویے، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۴
- ارون دھتی رائے، سرمایہ داریت، ریاستی جبر، اور مزاحمت، مترجم: امجد نذیر، ملتان، ۲۰۱۲
- بازغہ قندیل، اردو ناول میں روال فطرت انسانی کی تمثیلات، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۱۲
- پروفیسر قادر۔ سی۔ اے، ڈاکٹر، اخلاقیات، اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۴ء
- پروفیسر مجاہد کامران، ڈاکٹر، 9/11 & the new world order، سانحہ ستمبر اور نیا عالمی نظام، مترجم، پروفیسر ظفر المحسن پیرزادہ، یونیورسٹی آف دی پنجاب لاہور، ۲۰۱۴
- تاراچند، ڈاکٹر، تاریخ تحریک آزادی ہند، جلد دوم، مترجم غلام ربانی تاباں، قومی کونسل برائے فروغ وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند، ۲۰۰۱
- جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (جلد سوم) مجلس ترقی ادب لاہور، ۲۰۰۸
- جمیل جالبی، ڈاکٹر، (مرتب) قومی انگلش اردو ڈکشنری، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ص: ۳۶۷
- حسن عسکری، محمد، ستارہ بادبان، مکتبہ سات رنگ کراچی، ۱۹۶۳ء
- حنیف ندوی، مولانا، افکار ابن خلدون، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۹۵ء،
- حیدر، قرۃ العین، میرے بھی صنم خانے، مکتبۂ جدید لاہور ۱۹۶۹ء
- ڈپٹی نذیر احمد، مراۃ العروس، یو پبلشرز لاہور، ۲۰۰۳
- ڈی۔ڈی کوسمبی، قدیم ہندوستان کی تہذیب و ثقافت، بک ہوم لاہور، ۲۰۱۲
- رابعہ الربا، عورت، مصائب، وجوہات، نفسیات، دعا پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۵
- رابعہ الربا، احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں نسانیت، دستاویز مطبوعات لاہور، ۲۰۱۶
- روبینہ سلطان، تین نئے ناول نگار، دستاویز لاہور، ۲۰۱۲، ص: ۲۳۴
- روسو، ژاں ژاک روسو، معاہدہ عمرانی، مترجم: ڈاکٹر محمود حسین، ادارۂ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۷
- سبط حسن، موسیٰ سے مارکس تک، نیشنل پبلشنگ ہاؤس راولپنڈی، ۱۹۷۶ء

- سبط حسن، ماضی کے مزار، مکتبہ دانیال، ۲۰۱۸
- سبط حسن، پاکستان کے تہذیبی و ثقافتی مسائل، مکتبہ دانیال لاہور، س۔ن، ص: ۲۵۰
- سلمٰی کنول، دل کی چوکھٹ پر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸
- سلیم اختر، ڈاکٹر، پاکستانی شاعرات، تخلیقی خدوخال، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۸
- سلیم اختر، ڈاکٹر، عورت، جنس اور جذبات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۲ء
- سید علی حیدر، ڈاکٹر، اردو ناول سمت و رفتار، شبستان لکھنؤ، ۱۹۷۹ء
- شکیلہ خاتوں، ڈاکٹر، اردو ناول میں طبقاتی کشمکش، بک ٹاک لاہور، ۲۰۱۸
- شورش کاشمیری، اس بازار میں، چٹان پرنٹنگ پریس لاہور، س۔ن
- ظفر اقبال، سرعام، گورا پبلشرز لاہور، ۱۹۹۵ء،
- عاصم بٹ، محمد عبداللہ حسین، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات اسلام آباد، س۔ن
- علی عباس جلالپوری، عام فکری مغالطے، تخلیقات لاہور، ۱۹۹۹ء
- علی عباس جلال پوری, تاریخ کا نیا موڑ, تخلیقات لاہور، ۲۰۱۳
- عبدالرشید، میاں، پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۲ء
- عرفان حبیب، مغل ہندوستان کا طریق زراعت، (مترجم) جمال محمد صدیقی، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی، ۱۹۷۷ء
- فرحت اللہ انصاری، ادب اور تہذیب، آزاد کتاب گھر کلاں محلہ دہلی، ۱۹۴۷ء
- کارل مارکس، ہندوستان کا تاریخی خاکہ (ترتیب و تعارف) احمد سلیم، تخلیقات لاہور، ۲۰۰۲
- کلیم الدین احمد، تحلیل نسی اور ادبی تنقید، الفضل ناشران کتب لاہور، ۱۹۹۱ء
- گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اردو شاعری ۱۸۵۷ء کے بعد، مشمولہ: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور زبان و ادب،
- (ضیاء الحسن، ڈاکٹر، ڈاکٹر ناصر عباس نیر (مرتبین): ۱۸۵۷ء جنگ آزادی اور زبان و ادب، لاہور، کلیہ علوم شرقیہ، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۸)، ص: ۲۱
- مدیحہ رحمٰن، "کیا بننا ہے، لڑکا یا لڑکی؟" مشمولہ بول کہ لب آزاد ہیں تیرے، مدیرہ سعدیہ بلوچ، وعدہ کتاب گھر کراچی، ۲۰۰۵
- **محمد ذاکر**، ڈاکٹر، آزادی کے بعد ہندوستان کا ادب، مکتبۂ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۸۱ء
- محمد فاروق خان، ڈاکٹر، اکیسویں صدی پاکستان، شرکت پرنٹنگ پریس لاہور، ۱۹۹۶ء

- مسعود رضا خاکی، ڈاکٹر، اردو افسانے کا ارتقا، مکتبہ جہاں لاہور، ۱۹۸۷ء
- مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۴
- ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، فکشن ہاؤس پبلشرز لاہور، ۲۰۱۲
- مہر و نہ لغاری، حسن منظر: ادبی خدمات، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۴
- نسرین انجم بھٹی، چند سوال، مشمولہ ادب کی نسائی رد تشکیل، مرتبہ: فہمیدہ ریاض، وعدہ کتاب گھر کراچی، ۲۰۰۶
- نعیم اللہ، محمد، پاکستان جاگیر داری زمینداری نظام کے شکنجے میں، جمہوری پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳
- ول ڈیورائٹ، انسانی تاریخ کے عظیم ترین ذہن اور نظریات (مترجم)، یاس جواد، نگارشات پبلشرز لاہور، ۲۰۱۶
- وی۔ پی۔ سوری، ڈاکٹر، طوائف، سٹی بک پوائنٹ کراچی ۲۰۰۹

انگریزی کتب

- Artisan & Rita Introduction to Psychology, Har court Brace Jovanovich Publishers, New York,1985
- Coulbourne, Rusbton, Feudalism in History, Princeton University press, London, 1956
- Fulcher, James, Capitalism, a very short Introduction, oxford press, UK

Mum Yard Lewis, "The city in History" New York, Harcourt, Brace of word, Inc,1961

رسائل واخبارات:

- آج، کراچی، شمارہ نمبر ۷۲، ۲۰۱۲
- ادبیات، سہ ماہی، خصوصی نمبر، اسلام آباد، ۲۰۲۰
- اردو، ششماہی، ۲۰۲۱

- الاقتصاد، ششماہی، کراچی، ستمبر ۲۰۱۱
- جرنل آف ریسرچ اردو، ششماہی، ملتان، ۲۰۲۰
- دربھنگہ ٹائمز، سہ ماہی، بہار، اپریل تا جون ۲۰۱۶
- فانوس، ماہنامہ، لاہور، جنوری ۲۰۱۶
- فکر و تحقیق، سہ ماہی، دہلی، ۲۰۱۶
- ندائے ملت، ہفت روزہ، لاہور، ۱۳۔۱۹ نومبر ۲۰۰۸

لغات و انسائیکلوپیڈیا

اردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز لاہور، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۸۴

یاسر جواد، عالمی انسائیکلوپیڈیا، الفیصل ناشران و تاجران کتب لاہور، جلد اول ۲۰۰۹

Cosine encyclopedia of psychology, vol-3, John Will's sons, New York, 1984.

Stand ford Encyclopedia of Philosophy,8:12pm,07 June 2020.

غیر مطبوعہ مقالہ جات

سعید احمد، اردو داستانوں میں حیوانات کی علامتی حیثیت (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل اردو) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۵

کامران عباس کاظمی، سید، اردو ناول میں عصری آگاہی / آگہی (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ) مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی، وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، اسلام آباد، ۲۰۱۳

انٹرنیٹ

Exploitation-Definition in the study of sociology ,9:00 pm,17 June 2020.

https://www.thoughtco.com/exploitation-defination-3026317